ڈاکٹر کلیئر ٹسڈل کی کتاب ”ماخذ القرآن“ اور نام نہاد امریکی قرآن
”الفرقان الحق“ کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ

جلد 1

حقانیتِ قرآن



مؤلف

محمد عدنان جاوید حنفی

حقانیت قرآن

(جلد اول)

محمد عدنان جاوید حنفی

نام کتاب: حقانیت قرآن (جلد اول)
مؤلف: محمد عدنان جاوید حنفی
سنہ اشاعت: 2025ء / 1447ھ

فہرست مضامین

انتساب

جلد اول کی نسبت صاحب قرآن کے نام۔۔۔

تقریظ

استاد محترم حضرت مولانا مفتی سنان احمد صاحب حفظہ اللہ

(خطیب: جامع مسجد امام ابوحنیفہ، مسلم ٹاون کوئٹہ)

الحمد للّٰہ ربّ العالمین، والصلاۃ والسلام علی سید المرسلین، وعلیٰ آلہ وصحبہ أجمعین۔

علم وتحقیق کی وادی میں کبھی کبھی ایسے چراغ روشن ہوتے ہیں جو اپنے دائرۂ نور سے آگے بڑھ کر دلوں کو منور اور ذہنوں کو مطمئن کر دیتے ہیں۔ انہی میں ایک نام میرے فاضل ومحنتی شاگرد محترم عدنان صاحب کا ہے، جنہیں میں گزشتہ دس برسوں سے جانتا ہوں۔ ان کی طبیعت میں سنجیدگی، گفتار میں شائستگی، اور قلم میں صداقت کا رنگ نمایاں ہے۔

زیرِ نظر کتاب ''حقانیتِ قرآن'' ایمان واستدلال، عقل ونقل، اور علم وعرفان کا حسین سنگم ہے۔ موجودہ دور میں جب قرآنی تعلیمات پر اعتراضات کا بازار گرم ہے، مصنف نے نہایت متانت، گہرے مطالعے اور سادہ ومدلل اسلوب کے ساتھ ان کے جوابات پیش کیے ہیں۔

کتاب کے ابواب اس امر کے شاہد ہیں کہ مصنف نے موضوع پر وسیع تحقیقی محنت کی ہے۔ فصاحت وبلاغت، علمِ معانی وبیان، قرآنِ کریم کے نظم وربط، اور مخالفین کے اعتراضات کے علمی محاکمے سب پہلو نہایت خوبصورتی سے سمو دیے گئے ہیں۔ "الفرقان الحق" جیسے منکرین کے شبہات کا جواب ہو یا آیاتِ قرآنی کی معنوی باریکیاں، ہر جگہ فکرِ سلیم اور مطالعۂ عمیق کی جھلک نمایاں ہے۔

راقم کو اس کتاب کے کچھ ابواب کے مطالعہ کا موقع ملا (مکمل نظر سے نہیں گزری)، لیکن جتنا

حصہ دیکھا، وہ مصنف کے اخلاص، علم دوستی اور تحقیقی بصیرت کا آئینہ دار ہے۔ امید ہے کہ یہ تصنیف طلبہ، محققین اور عام قارئین سب کے لیے نافع و مؤثر ثابت ہوگی۔

اللہ تعالیٰ مصنف کے قلم میں مزید برکت عطا فرمائے، ان کے علم و عمل میں اضافہ کرے، اور اس کتاب کو قبولیت و نفعِ عام کا ذریعہ بنائے۔ آمین بجاہ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ والسلام

طلب گار دعا

سنان احمد

خطیب جامع مسجد امام ابوحنیفہ

مسلم ٹاون کوئٹہ

پیش گفتار

بسم الله الرحمٰن الرحیم

اللھم انت واجب الوجود ولا بدایۃ لک ولا نھایۃ لک ولم یلد ولم یولد وانت المستعان فانصرنی بھذاالامر العظیم ۔

شروع کرتا ہوں اس اللہ کے نام سے جس کے بارے میں قبل قرآن یہ تصور کیا جاتا تھا کہ وہ ایک نہیں کثیر ہیں، اس کے ساتھ دوسرا خدا کا تصور کیا جاتا اور شریک مان لیا جاتا، مگر حقیقت میں وہ یکتاء ہے، اور کوئی اس کا شریک نہیں، وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا، نہ اس کے لئے ابتداء ہے اور نہ انتہاء جس کی وجود ضروری ہے۔

جب سے قرآن کا نزول حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر شروع ہوا، آغاز نزول سے لے کر اب تک قرآن پر ہر قسم کے اعتراضات اور شبہات کیا گیا، جس وقت نزول ہو رہا تھا اس وقت بھی معاصرین کی جانب سے شبہات کیا گیا، جس کا جواب اسی وقت دے دیا گیا، مگر جب نزول مکمل ہوا تو اس کے بعد سے اب تک اعتراضات کا سلسلہ جاری ہے، اعتراضات اور شبہات کا جواب وہی ہے جو قرآن نے دے دیا ہے، مگر سوال کا انداز ہر دور میں بدل جاتا ہے اور نئے نئے انداز میں کچھ ترمیم کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔

معترضین میں مختلف قسم کے لوگ ہیں، بعض کا تعلق عیسائیت سے ہیں اور بعض کا یہودیت سے اور بعض دہریت سے تعلق رکھتے ہیں جسے آج کے دور میں ملحد کہا جاتا ہیں۔

راقم الحروف نے قرآن سے متعلق جب تحقیق کا آغاز کیا تو مجھے مختلف کتابیں قرآن کے خلاف لکھے ہوئے ملے، جن کا جواب اکثر دیا گیا ہے، مزید کچھ نئے اعتراضات سامنے آئے ہیں جن کا جواب باقی تھا۔ سوچا کہ فقط نئے شبہات کا جواب لکھنے کے بجائے، نئے اور پرانے اعتراضات کا ازسرنو تحقیقی، تنقیدی، علمی، عقلی اور الزامی جواب دیا جائے۔

اس کے لئے سب سے پہلے راقم الحروف نے کتابوں کی تلاش شروع کی جو قرآن کے خلاف لکھے گئے ہیں، جن میں انگلش، عربی، اردو کی کتابیں شامل ہیں۔ ان سب میں قرآن کے خلاف جو شبہات اور اعتراضات پایا گیا صرف انہیں کا جواب دیا گیا ہیں، علاوہ ازیں اسلام پر یا اس کے کسی خاص جزء پر اعتراض کیا گیا ہے تو اس کو ہم نے نہیں لیا، کیونکہ وہ خارج از موضوع ہیں، اس کے جوابات رب نے اگر توفیق دی تو ان شاء اللہ اس پر بھی قلم کو حرکت دیں گے۔ ہاں قرآن کے ضمن میں اگر اسلام یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت یا ذات زیر بحث آئے گا تو اس کا جواب ان شاء اللہ دیا جائے گا۔ ہم نے اختصار کے دامن کو نہیں چھوڑا، اس لئے حتی الامکان کوشش کیا گیا ہے جواب مختصر بامعنی اور پر اثر ہو، جہاں تفصیل کی ضرورت سمجھی گئی تو وہاں اس پر عمل کیا، ورنہ اختصار کو مدنظر رکھا۔

اللہ کرے دین بیزار اور ملحدین کے لئے یہ نوید سحر ثابت ہو، میرا گزارش ہے ان لوگوں سے کہ کتاب کو سمجھنے کی نیت سے پڑھے، بے جا ہٹ دھرمی اور ضد کو چھوڑے، بات اگر دل کو لگی، باتیں سمجھ آ گئی تو واپس لوٹ جاؤ اپنی اصل فطرت کی طرف بصورت دیگر اپنا ٹھکانہ بھڑکتی ہوئی آگ میں دیکھو گے۔

نہ کوئی سہارا ، نہ دل کا قرار
نہ یہاں کے ہوئے ، نہ وہاں کے

محمد عدنان جاوید حنفی

12 جولائی 2025ء

بروز ہفتہ بوقت طلوع آفتاب

کوئٹہ بلوچستان

اتمام حجت

اگر بالفرض والمحال قرآن جھوٹی کتاب ہوئی، اور جنت وجہنم اورآخرت نہ ہوا، تو ہمارا یہ ستر سالہ زندگی یا زیادہ سے زیادہ سوسالہ زندگی ضائع اور بے کار رہوا، جو ہم کسی فضول چیز میں لگا یا اور دنیا سے فائدہ نہیں اٹھایا۔

اوراگر قرآن سچی کتاب ہوئی جو حقیقت میں ہے، اور جنت وجہنم اور آخرت ہوئی، تو دین بیزار، ملحدین و کفار کا یہ سوسالہ زندگی تو زبردست گزری، مگر آخرت کی زندگی ہمیشہ ہمیشہ تباہ و برباد ہوئی۔

لہذا جنت وجہنم کے وجود کی صورت میں ہمارا سوسالہ زندگی فائدہ مند رہا، اور ہم قرآن کے احکام کے پابند رہے۔ اور عدم وجود کی صورت میں ہمارا سوسالہ زندگی بے کار اور ضائع ہوا۔ اور وجود کی صورت میں منکرین کا یہ سوسالہ زندگی بے کار اور ضائع ہوا، اور عدم وجود کی صورت میں ان کا یہ سوسالہ زندگی اچھا اور نفع مند ہوا۔

پس عقلمند اور اہل فہم اس سے اچھا نتیجہ نکالتے ہیں اور وہ ایسا راستہ اختیار کرتے ہیں جہاں نقصان کم فائدہ زیادہ ہو، اور بے وقوف و احمق ہمیشہ عارضی خوشی اور عارضی چیزوں پر اکتفاء کرتے ہیں۔ ؎

اک طرف رونق دنیا ، اک طرف راہ دین
فیصلہ تیرا ہی ہوگا ، چن لے جو ہے فائدہ

مقدمہ

بطور مقدمہ اور تمہید کے یہاں کچھ ضروری باتیں پیش کرنا چاہتا ہوں، تاکہ آگے مضامین کو سمجھنے میں آسانی ہو۔

قرآن مجید کسے کہتے ہیں۔قرآن مجید کی تعریف علماء کرام یوں کرتے ہیں کہ:

''قرآن اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جو معجز ہے، محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیا گیا ہے حضرت جبریل امین کے واسطے سے، جو مصاحف میں لکھا ہوا ہے، جو ہم تک تواتر کے ساتھ منتقل ہوا ہے، جس کی تلاوت کی کی جاتی ہے، جو سورۃ فاتحہ سے شروع ہوتا ہے، سورۃ الناس پر ختم ہوتا ہے۔''

(التبیان فی علوم القرآن از محمد علی صابونی ص/8)

یہ تعریف اکثر علماء کرام کے ہاں متفق علیہ ہیں، مزید ہم قرآن مجید کے دیگر علوم کی جانب بڑھنا نہیں چاہتے، کیونکہ وہ خارج از موضوع ہے۔ہم وہ باتیں پیش کرنا چاہتے ہیں جس کا تعلق موضوع سے ہو، یا موضوع کی جانب رہنمائی فراہم کرسکے۔

ابتدائی وحی

ابتداءوحی سے متعلق بخاری شریف میں تفصیلی روایت موجود ہیں:

'' عَنْ عَائِشَةَ أُمِّ الْمُؤْمِنِينَ ، أَنَّهَا ، قَالَتْ : أَوَّلُ مَا بُدِئَ بِهِ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنَ الْوَحْيِ الرُّؤْيَا الصَّالِحَةُ فِي النَّوْمِ ، فَكَانَ لَا يَرَى رُؤْيَا إِلَّا جَاءَتْ مِثْلَ فَلَقِ الصُّبْحِ ، ثُمَّ حُبِّبَ إِلَيْهِ الْخَلَاءُ وَكَانَ يَخْلُو بِغَارِ حِرَاءٍ ، فَيَتَحَنَّثُ فِيهِ وَهُوَ التَّعَبُّدُ اللَّيَالِيَ ذَوَاتِ الْعَدَدِ قَبْلَ أَنْ يَنْزِعَ إِلَى أَهْلِهِ وَيَتَزَوَّدُ لِذَلِكَ ، ثُمَّ يَرْجِعُ إِلَى خَدِيجَةَ فَيَتَزَوَّدُ لِمِثْلِهَا حَتَّى جَاءَهُ الْحَقُّ وَهُوَ فِي غَارِ حِرَاءٍ ، فَجَاءَهُ الْمَلَكُ ، فَقَالَ : اقْرَأْ ، قَالَ : مَا أَنَا بِقَارِئٍ

، قَالَ : فَأَخَذَنِي فَغَطَّنِي حَتَّى بَلَغَ مِنِّي الْجَهْدَ ، ثُمَّ أَرْسَلَنِي ، فَقَالَ : اقْرَأْ ، قُلْتُ : مَا أَنَا بِقَارِئٍ ، فَأَخَذَنِي فَغَطَّنِي الثَّانِيَةَ حَتَّى بَلَغَ مِنِّي الْجَهْدَ ، ثُمَّ أَرْسَلَنِي ، فَقَالَ : اقْرَأْ ، فَقُلْتُ مَا أَنَا بِقَارِئٍ ، فَأَخَذَنِي فَغَطَّنِي الثَّالِثَةَ ، ثُمَّ أَرْسَلَنِي فَقَالَ : اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ ، خَلَقَ الإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ، اقْرَأْ وَرَبُّكَ الأَكْرَمُ ، فَرَجَعَ بِهَا رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَرْجُفُ فُؤَادُهُ ، فَدَخَلَ عَلَى خَدِيجَةَ بِنْتِ خُوَيْلِدٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهَا ، فَقَالَ : زَمِّلُونِي زَمِّلُونِي ، فَزَمَّلُوهُ حَتَّى ذَهَبَ عَنْهُ الرَّوْعُ ، فَقَالَ لِخَدِيجَةَ ، وَأَخْبَرَهَا الْخَبَرَ : لَقَدْ خَشِيتُ عَلَى نَفْسِي ، فَقَالَتْ خَدِيجَةُ : كَلَّا وَاللهِ مَا يُخْزِيكَ اللهُ أَبَدًا ، إِنَّكَ لَتَصِلُ الرَّحِمَ ، وَتَحْمِلُ الْكَلَّ ، وَتَكْسِبُ الْمَعْدُومَ ، وَتَقْرِي الضَّيْفَ ، وَتُعِينُ عَلَى نَوَائِبِ الْحَقِّ ، فَانْطَلَقَتْ بِهِ خَدِيجَةُ حَتَّى أَتَتْ بِهِ وَرَقَةَ بْنَ نَوْفَلِ بْنِ أَسَدِ بْنِ عَبْدِ الْعُزَّى ابْنَ عَمِّ خَدِيجَةَ ، وَكَانَ امْرَأً تَنَصَّرَ فِي الْجَاهِلِيَّةِ ، وَكَانَ يَكْتُبُ الْكِتَابَ الْعِبْرَانِيَّ ، فَيَكْتُبُ مِنَ الإِنْجِيلِ بِالْعِبْرَانِيَّةِ مَا شَاءَ اللَّهُ أَنْ يَكْتُبَ ، وَكَانَ شَيْخًا كَبِيرًا قَدْ عَمِيَ ، فَقَالَتْ لَهُ خَدِيجَةُ : يَا ابْنَ عَمِّ ، اسْمَعْ مِنَ ابْنِ أَخِيكَ ، فَقَالَ لَهُ وَرَقَةُ : يَا ابْنَ أَخِي ، مَاذَا تَرَى ، فَأَخْبَرَهُ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَبَرَ مَا رَأَى ، فَقَالَ لَهُ وَرَقَةُ : هَذَا النَّامُوسُ الَّذِي نَزَّلَ اللَّهُ عَلَى مُوسَى صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ، يَا لَيْتَنِي فِيهَا جَذَعًا ، لَيْتَنِي أَكُونُ حَيًّا إِذْ يُخْرِجُكَ قَوْمُكَ ، فَقَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : أَوَمُخْرِجِيَّ هُمْ ، قَالَ : نَعَمْ ، لَمْ يَأْتِ رَجُلٌ قَطُّ بِمِثْلِ مَا جِئْتَ بِهِ إِلَّا عُودِيَ ، وَإِنْ يُدْرِكْنِي يَوْمُكَ أَنْصُرْكَ نَصْرًا مُؤَزَّرًا ، ثُمَّ لَمْ يَنْشَبْ وَرَقَةُ أَنْ تُوُفِّيَ وَفَتَرَ الْوَحْيُ ''

(صحیح بخاری کتاب بدء الوحی ص/9 طبع دار الحضارۃ ریاض)

ترجمہ: حضرت عائشہ رضہ اللہ عنھا سے مروی ہے آپ نے فرمائی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر وحی کا ابتدائی دور اچھے سچے پاکیزہ خوابوں سے شروع ہوا۔ آپ خواب میں جو کچھ دیکھتے وہ صبح کی روشنی کی طرح صحیح اور سچا ثابت ہوتا۔ پھر من جانب قدرت آپ تنہائی پسند ہو گئے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غار حرا میں خلوت نشینی اختیار فرمائی اور کئی کئی دن اور رات وہاں مسلسل عبادت اور یاد الٰہی و ذکر و فکر میں مشغول رہتے۔ جب تک گھر آنے کو دل نہ چاہتا توشہ ہمراہ لیے ہوئے وہاں رہتے۔ توشہ ختم ہونے پر ہی اہلیہ محترمہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف لاتے اور کچھ توشہ ہمراہ لے کر پھر وہاں جا کر خلوت گزیں ہو جاتے، یہی طریقہ جاری رہا یہاں تک کہ آپ پر حق منکشف ہو گیا اور آپ غار حرا ہی میں قیام پذیر تھے کہ اچانک حضرت جبریل علیہ السلام آپ کے پاس حاضر ہوئے اور کہنے لگے کہ اے محمد! پڑھو آپ فرماتے ہیں کہ میں نے کہا کہ میں پڑھنا نہیں جانتا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ فرشتے نے مجھے پکڑ کر اتنے زور سے بھینچا کہ میری طاقت جواب دے گئی، پھر مجھے چھوڑ کر کہا کہ پڑھو، میں نے پھر وہی جواب دیا کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ اس فرشتے نے مجھ کو نہایت ہی زور سے بھینچا کہ مجھ کو سخت تکلیف محسوس ہوئی، پھر اس نے کہا کہ پڑھ! میں نے کہا کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ فرشتے نے تیسری بار مجھ کو پکڑا اور تیسری مرتبہ پھر مجھ کو بھینچا پھر مجھے چھوڑ دیا اور کہنے لگا کہ پڑھو اپنے رب کے نام کی مدد سے جس نے پیدا کیا اور انسان کو خون کی پھٹکی سے بنایا، پڑھو اور آپ کا رب بہت ہی مہربانیاں کرنے والا ہے۔ پس یہی آیتیں آپ حضرت جبریل علیہ السلام سے سن کر اس حال میں غار حرا سے واپس ہوئے کہ آپ کا دل اس انوکھے واقعہ سے کانپ رہا تھا۔ آپ حضرت خدیجہ کے ہاں تشریف لائے اور فرمایا کہ مجھے کمبل اوڑھا دو، مجھے کمبل اوڑھا دو۔ لوگوں نے آپ کو کمبل اوڑھا دیا۔ جب آپ کا ڈر جاتا رہا۔ تو آپ نے اپنی زوجہ محترمہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو تفصیل

کے ساتھ یہ واقعہ سنایا اور فرمانے لگے کہ مجھ کو اب اپنی جان کا خوف ہو گیا ہے۔آپ کی اہلیہ محترمہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے آپ کی ڈھارس بندھائی اور کہا کہ آپ کا خیال صحیح نہیں ہے۔خدا کی قسم! آپ کو اللہ کبھی رسوا نہیں کرے گا،آپ تو اخلاق فاضلہ کے مالک ہیں،آپ تو کنبہ پرور ہیں، بے کسوں کا بوجھ اپنے سر پر رکھ لیتے ہیں،مفلسوں کے لیے آپ کماتے ہیں، مہمان نوازی میں آپ بے مثال ہیں اور مشکل وقت میں آپ امر حق کا ساتھ دیتے ہیں۔ایسے اوصاف حسنہ والا انسان یوں بے وقت ذلت وخواری کی موت نہیں پا سکتا۔پھر مزید تسلی کے لیے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں، جو ان کے چچا زاد بھائی تھے اور زمانہ جاہلیت میں نصرانی مذہب اختیار کر چکے تھے اور عبرانی زبان کے کاتب تھے، چنانچہ انجیل کو بھی حسب منشائے خداوندی عبرانی زبان میں لکھا کرتے تھے۔(انجیل سریانی زبان میں نازل ہوئی تھی پھر اس کا ترجمہ عبرانی زبان میں ہوا۔ورقہ اسی کو لکھتے تھے) وہ بہت بوڑھے ہو گئے تھے یہاں تک کہ ان کی بینائی بھی رخصت ہو چکی تھی۔حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے ان کے سامنے آپ کے حالات بیان کیے اور کہا کہ اے چچا زاد بھائی! اپنے بھتیجے (محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی زبانی ذرا ان کی کیفیت سن لیجیئے وہ بولے کہ بھتیجے آپ نے جو کچھ دیکھا ہے،اس کی تفصیل سناؤ۔چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے از اول تا آخر پورا واقعہ سنایا، جسے سن کر ورقہ بے اختیار ہو کر بول اٹھے کہ یہ تو وہی ناموس (معزز راز دان فرشتہ) ہے جسے اللہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وحی دے کر بھیجا تھا۔کاش، میں آپ کے اس عہد نبوت کے شروع ہونے پر جوان عمر ہوتا۔کاش میں اس وقت تک زندہ رہتا جب کہ آپ کی قوم آپ کو اس شہر سے نکال دے گی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ سن کر تعجب سے پوچھا کہ کیا وہ لوگ مجھ کو نکال دیں گے؟ (حالانکہ میں تو ان میں صادق وامین ومقبول ہوں) ورقہ بولا ہاں یہ سب کچھ سچ ہے۔مگر جو شخص بھی آپ کی طرح امر حق لے کر آیا لوگ اس کے دشمن ہی ہو گئے ہیں۔اگر مجھے آپ کی نبوت کا وہ زمانہ مل

جائے تو میں آپ کی پوری پوری مدد کروں گا۔مگر ورقہ کچھ دنوں کے بعد انتقال کر گئے۔ پھر کچھ عرصہ تک وحی کی آمد موقوف رہی۔

اس حدیث میں ورقہ بن نوفل کا تذکرہ ہے،اور سیرت کی کتابوں میں بھی اس کا ذکر ہے، جس پر ملحدین نے کافی ہرزہ سرائی اور بے ہودگی کا مظاہرہ کیا ہیں جس پر آگے ان شاءاللہ تبصرہ کیا جائے گا۔

یہ ابتداء وحی کی کیفیت اور حالت ہے،مزید نزول قرآن کی حکمت اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کیسے قرآن حاصل ہوا، یہ خارج از مبحث ہے، جو علوم القرآن کے موضوع میں شامل ہے۔

جمع القرآن:

قرآن مجید کا نزول تدریجاً ہوتا،موقع اور حالات کے مطابق ،اور پھر جب کوئی آیت نازل ہوتی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام کے سامنے تلاوت فرماتے اور پھر صحابہ کرام یاد کرنے کے بعد اس کو لکھ دیتے چمڑے وغیرہ پر۔

پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور میں جمع القرآن ہوا۔اس کی وجہ اور تفصیل مشہور ہے اور کتابوں میں موجود ہے، اس کے بعد حضرت عثمان غنی کے دور میں جمع القرآن ہوا۔اور یہ آخری جمع تھا، جو آج تک چلا آرہا ہے،اور جو قرآن موجود ہے یہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ کا جمع کردہ ہے۔

ناسخ اور منسوخ

یہ مسئلہ بھی علوم القرآن کے اہم مضامین میں سے ہیں،اور اس پر علماء کرام نے کافی بحث کی ہیں اور اس کے اہم جزئیات پر روشنی ڈالی ہیں، یہاں بقدر ضرورت کچھ باتیں عرض کرنا مقصود ہے۔

نسخ کا معنی ابن حاجب رحمہ اللہ نے یوں کیا ہے کہ:

''النسخ هو رفع الحكم الشرعی بدليل شرعی متاخر''

یعنی نسخ کہتے ہیں ایک حکم شرعی کو دوسرے حکم شرعی کے ذریعے ختم کرنا۔

(التبیان فی علوم القرآن از محمد علی صابونی)

معلوم ہوا کہ نسخ کہتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے ایک حکم فرمایا، بعد میں مصلحت کے پیش نظر اس حکم کو منسوخ کر کے اس کے جگہ دوسرا حکم دے دیا کہ پہلا جو حکم ہے وہ اب ختم ہوا دوسرا حکم پر عمل کرنا چاہیے۔ اور اس کا یہ مطلب نہیں پہلا حکم وہ صحیح نہیں تھا اس لئے اس حکم پر عمل کرنا چاہیے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ پہلا حکم بھی صحیح ہے، اور یہ حکم بھی، فرق یہ ہے پہلا حکم اُسی زمانے و مناسبت کے لحاظ سے تھا اور اب ثانی حکم اِسی زمانے اور حالت سے ہیں۔

نسخ خداوند عالم کی حکمت و بصیرت اور اس کی قدرت و یکتائی پر دال ہے، جسے کم فہم اور عقل سے عاری معاندین نے باری تعالیٰ کی حکمت اور قدرت کے خلاف سمجھا۔ اور برجستہ کہنے لگے کہ اگر اللہ تعالیٰ اپنے حکم کو تبدیل کر دے اس سے اللہ تعالیٰ کے لئے جہل اور نقص لازم آئے گا جس سے اللہ تعالیٰ پاک ہے، کیونکہ جب اللہ تعالیٰ نے ایک حکم صادر فرمادیا اور پھر اس حکم کو تبدیل کر دیا تو اس کا مطلب اللہ تعالیٰ کو پہلے اس کا علم نہیں تھا، بعد میں جب علم ہوا تو اللہ نے وہی حکم دیا، حالانکہ یہ ان لوگوں کے کم فہمی ہے، کیونکہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو پورا قرآن بیک وقت یکجا نازل کرتا، مگر یہ بھی حکمت کے خلاف تھا، اس لئے ایسا نہیں کیا اور آیات اور احکام کو موقع و محل کے مطابق نازل فرماتا، اگر اللہ تعالیٰ اپنے حکم تبدیل نہ کرتا تب بھی یہ جاہل اور احمق اپنی زبان نہیں روکتے اور کہتے کہ یہ تو حکمت کے خلاف ہے ایک حکیم ایسے امر کا حکم دیا ہے جو انسان نہیں کر سکتا، اور قوت بشریہ سے بالاتر ہے، اور یہ بھی ظاہر ہے موقع و محل کے خلاف کچھ کرنا یقینا اہل دانش کے ہاں کسی حکیم کے شان اور وصف کے خلاف ہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ احکامات کا حکم

موقع ومحل کے مطابق دیتے، جو یقیناً ایک حکیم کی ذات کا خاصہ ہی ہوسکتا ہے۔

اور جب حکم صادر فرمادیا تو حالات وموقع کے مطابق پھر اسے تبدیل کر دیا تو اس میں کونسی قباحت ہے، جیسے بادشاہ کچھ قوانین نافذ کرے سلطنت اور رعایا کے لئے، اور پھر وقت گزرنے کے ساتھ اگر رعایا کی حالات کے مطابق دوبارہ قوانین کو تبدیل کر کے ان کے جگہ دوسرے قوانین نافذ کرے، تو کیا اس کو احمقانہ عمل قرار دیا جاسکتا ہے، ہرگز نہیں بلکہ لوگ اس کو فہم دان اور حالات حاضرہ پر واقفیت کا ہنر دے کر پیش کرتے ہیں۔ علی ھذا یہاں پر بھی یہی معاملہ ہے جب اللہ تعالیٰ نے کچھ احکام نافذ کیا، تو وہ حالات اور محل کے موقع پر پھر اگر اس کے جگہ دوسرا حکم نافذ فرمایا تو یہ ان کی حکیمانہ اور مصلحت کے پیش نظر ان کی قدرت کاملہ اور علیم ہونے پر بین ثبوت ہے۔

یہاں پر کوئی ملحد زبان ٹیرا کر کے اپنی جہالت کا مظاہرہ نہ کرے کہ بادشاہ کو تو مستقبل کا علم نہیں ہوتا اس لئے ایسے قوانین جاری کیا پھر جب کچھ آگہی آگئی تو قوانین تبدیل کر کے دوسرا قوانین نافذ کیا، اور اس سے تو آپ کا دعویٰ عالم الغیب جو بقول آپ کے صفت خاصہ خداوند عالم ہے، باطل ہوتا ہے۔ مطلب اللہ تعالیٰ کو پھر مستقبل کا علم نہیں تھا اس لئے تبدیل کر دیا۔

تو برخوردار گزارش ہے اللہ تعالیٰ عالم الغیب ہے پوشیدہ اشیاء کو جاننے والا ہے، مستقبل کی حالات سے واقف ہے، اگر یہ صفت اللہ کیلئے ثابت نہ کیا جائے تو اللہ کے لئے لاعلم اور جہل کا ثبوت لازم آئے گا جو کہ باطل ہے، اس لئے اللہ کو علم تھا مستقل کا، احکام صرف موقع ومحل کے مطابق نازل کرتا اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ پہلے علم نہیں تھا بعد میں جب علم ہوا تو ایسا کیا، ماقبل میں عرض کیا جاچکا ہے کہ نسخ کا مطلب یہ نہیں پہلا حکم صحیح نہیں تھا، اس لئے اب اس پر عمل کرنا چاہیے۔ ہرگز نہیں بلکہ حکم دونوں صحیح تھے بس حالات اور موقع کے بنیاد پر پہلے کو ترک کرنے کا حکم اور دوسرے پر عمل کرنے کا حکم دیا گیا۔

ایک بادشاہ اگر ایسا کرے تو آپ اسے کم فہم اور اسے عیب میں شمار نہیں کرتے ،تو اللہ کیلئے یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ وہ لاعلم تھا۔ جیسے کوئی شخص اپنے فرزند کو بچپن میں موبائل استعمال کرنے نہیں دیتا اس لئے کہ ابھی یہ اس کے لئے اچھا نہیں، پھر جب جوان ہو جائے تو اجازت دیتا ہے کہ اب استعمال کرو مگر خیال سے ، اب یہاں باپ کو تو معلوم ہے ابھی اس زمانے میں اس کے لئے موبائل اچھا نہیں بڑا ہو جائے پھر موبائل استعمال کرے۔تو یہاں والد کو تو دونوں حالت کا معلوم ہے بچپن کا بھی اور جوانی کا بھی، پہلے اگر اجازت نہیں دیتا تو بچے کی حالت کو دیکھ کر اور جوانی میں اگر اجازت دے رہا ہے تو اب وہ بچہ، بچہ نہیں رہا بلکہ اب وہ کسی اور حال میں ہے اس لئے پہلے والا حکم اب اس کیلئے مناسب نہیں۔ پس غور کرنا چاہیے یہاں پر کیا یہ لازم آتا ہے کہ والد پہلے غلط تھا یا پہلا حکم اس کا غلط تھا ،نہیں بلکہ پہلا حکم بھی درست ہے اور دوسرا بھی۔مگر فرق صرف حالات اور موقع کی مناسبت ہے۔

ایک ڈاکٹر اگر مریض کو موسم سرما میں ایک دوائی دے، اور پھر اسی مریض کو دوبارہ اسی مرض کے لئے موسم گرما میں دوسری دوائی دے ،تو کیا یہاں ڈاکٹر کو بے وقوف سمجھا جائے گا ،نہیں بلکہ اس کے خلاف کرنے پر اس کو بے وقوف اور احمق سمجھا جائے گا۔ پس اس کے باوجود بھی اگر کسی دین بیزار کے عقل ٹھکانے نہ لگے ،تو اسے اپنے عقل کا علاج کرنا چاہیے۔

اعجاز القرآن

یہ موضوع علوم القرآن کے لئے ریڑھ کی ہڈی کے مانند ہے، آگے مخالفین کے اعتراضات کو اسی موضوع کے جزئیات پر پرکھیں گے، اور قرآن کا کلام اللہ ہونا اس کے اعجاز کے ذریعہ ثابت ہوتا ہے، اس لئے اختصار کے پیش نظر یہاں ضروری باتیں لکھنا چاہتا ہوں ۔اور اس کا مکمل تفصیلی بحث شیخ محمد علی صابونی رحمہ اللہ کی کتاب التبیان فی علوم القرآن میں موجود ہے، ہم اس کا اختصار ہدیہ قارئین کرنا چاہتے ہیں۔

اعجاز القرآن کا معنیٰ:

اعجاز کا مطلب ہے عاجز کرنا، چونکہ قرآن ایک معجزہ ہے اور عاجز کرنے والا ہے، اس لئے اسے معجزۃ النبی اور کلام اللہ کہا جاتا ہے، اور اس بات میں بھی کسی کو اختلاف نہیں کہ معجزہ کی مثل لایا جاسکے، معجزہ کا مثل کوئی انسان نہیں پیش کرسکتا، اسی لئے اس کو معجزہ کہتے ہیں۔

اعجاز کب ثابت ہوگا؟

جب تین باتیں جمع ہوجائے تو اعجاز ثابت ہوجاتا ہے:

(1) چیلنج یعنی مقابلہ اور معارضہ کو طلب کرنا۔ (2) اس چیلنج کو توڑنے کا سبب موجود ہو۔ (3) اس چیلنج کو توڑنے میں کوئی مانع موجود نہ ہو۔

پہلا یہ ہے کہ اعجاز کے لئے یعنی کسی کو عاجز کرنے کے لئے کوئی چیلنج دینا کہ اگر اس کے مقابلہ میں کچھ پیش کرو یا چیلنج قبول کرو اور اس چیلنج کو توڑ دو۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ امی تھا، کہی سے پڑھا لکھا نہیں تھا، اور نہ کسی راہب و پادری سے بیٹھ کر کچھ سیکھا تھا، اور نہ گزرے ہوئے امتوں اور نبیوں کا خبر پر مطلع تھا۔ اس لئے ایسا کلام جب ان سے صادر ہورہا ہے، جو فصاحت و بلاغت کے اعلی درجوں پر فائز ہے، تو یقیناً یہ ان کا اپنا کلام نہیں بلکہ یہ کسی اور کا کلام ہے جو خداوند عالم کا ہے، اگر کسی انسان کا ہوتا تو ظاہر ہے انسان کا کلام کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے اور اس کا چیلنج قبول بھی کیا جاسکتا ہے۔

قرآن نے جب چیلنج دیا تو یہ چیلنج دو طریقے سے تھا، عموم اور خصوص کے اعتبار سے۔ بہر صورت دونوں چیلنج آج تک برقرار ہے، نہ عوام الناس نے چیلنج کو توڑا اور خواص الناس نے۔

قرآن کا ایک چیلنج عوام الناس کے لئے تھا جس میں شرق تا غرب، عرب تا عجم، مؤمن ہو چاہے کافر انسان ہو یا جنات، سب کے لئے کھلا چیلنج تھا کہ اگر یہ کلام خداوند عالم کا کلام تسلیم نہیں

کرتے تو بمثل ھذا الکلام کوئی کلام پیش کرو۔ یہ چیلنج آج بھی قرآن میں مزین و منقش ہے تا قیامت رہے گا:

’’ قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَ الْجِنُّ عَلٰٓی اَنْ یَّاْتُوْا بِمِثْلِ ھٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا یَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَ لَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِیْرًا ‘‘ (الاسراء آیت ۸۸)

ترجمہ: کہہ دو کہ اگر تمام انسان اور جنات اس کام پر اکٹھے بھی ہوجائیں کہ اس قرآن جیسا کلام بنا کر لے آئیں، تب بھی وہ اس جیسا نہیں لاسکیں گے، چاہے وہ ایک دوسرے کی کتنی مدد کرلیں۔

قرآن کا دوسرا چیلنج خاص تھا اور پھر ان میں اخص الخاص تھا یعنی کفار قریش، اور یہ چیلنج کلی اور جزئی کے اعتبار سے تھا۔ پہلا چیلنج کلی تھا یعنی تمام قرآن کا چیلنج تھا کہ اس جیسا کلام پیش کرو اس جیسا فصیح اور بلیغ انداز میں۔ دوسرا جزئی تھا یعنی مکمل قرآن تو پیش نہیں کرسکتے پھر قرآن کی سورتوں میں سے کوئی سورت پیش کرو اگرچہ وہ چھوٹی ہی کیوں نہ ہو۔

پہلے چیلنج کو قرآن نے یوں بیان کیا کہ:

’’ فَلْیَاْتُوْا بِحَدِیْثٍ مِّثْلِهٖۤ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِیْنَ (الطور /۳۴)

اگر یہ واقعی سچے ہیں تو اس جیسا کوئی کلام (گھڑ کر) لے آئیں۔

دوسرے چیلنج کو یوں بیان کیا:

’’ اَمْ یَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَیٰتٍ وَّ ادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ فَاِلَّمْ یَسْتَجِیْبُوْا لَكُمْ فَاعْلَمُوْۤا اَنَّمَاۤ اُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰهِ وَ اَنْ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ‘‘

(ھود /۱۳۔۱۴)

بھلا کیا یہ لوگ یوں کہتے ہیں کہ یہ وحی اس (پیغمبر) نے اپنی طرف سے گھڑ لی ہے؟ (اے

پیغمبر !ان سے) کہہ دو کہ: پھرتو تم بھی اس جیسی گھڑی ہوئی دس سورتیں بنالاؤ، اور(اس کام میں مدد کے لیے)اللہ کے سوا جس کسی کو بلاسکو بلالو، اگر تم سچے ہو۔اس کے بعد اگر یہ تمہاری بات قبول نہ کریں تو (اے لوگو!) یقین کرلو کہ یہ وحی صرف اللہ کے علم سے اتری ہے،اور یہ کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں ہے۔تو کیا اب تم فرمانبردار بنوگے؟

دوسری قسم جس سے اعجاز ثابت ہوتا ہے کہ چیلنج پورا کرنے کا سبب موجود ہو یعنی جس چیز کا چیلنج دیا جارہا ہے اس کا سبب موجود ہو جیسے قرآن جیسے فصیح وبلیغ کلام لانے کا چیلنج تھا تو فصاحت و بلاغت عرب کے لونڈی تھی اور اسی لئے تو اللہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن جیسے فصیح و بلیغ معجزہ عنایت کی، کیونکہ یہ عادت خداوندی ہے کہ جس دور میں جس چیز کا چرچا ہو اس زمانے کے رسول کو اسی دور کے مطابق معجزہ عطاء فرماتا ہے۔تو عرب میں فصاحت و بلاغت کا چرچا تھا اور لوگ اس کے ذریعہ مقابلہ کرتے تھے،تو سبب موجود تھا،مگر پھر بھی وہ اس جیسے کلام پیش کرنے سے قاصر رہے۔

تیسری قسم اعجاز کے لئے چیلنج قبول کرنے میں کوئی مانع موجود نہ ہو،یعنی ایسا بھی نہیں کہ ان کو فصاحت و بلاغت نہیں آتی تو قرآن نے چیلنج دے دیا کہ ایسا کلام پیش کرو، بلکہ فصاحت و بلاغت تو ان کے گھر کی لونڈی تھی ،اس لئے مانع بھی موجود نہیں تھا،جیسے کوئی لنگڑے کو دوڑ کا چیلنج دے تو یہاں مانع موجود ہے، کیونکہ لنگڑا تو دوڑ نہیں لگا سکتا ،تو قرآن نے جو چیلنج دیا کوئی مانع موجود نہیں تھا۔

اعجاز القرآن کی وجوہات:

قطع نظر امثال ودلائل اور تفصیلات کے ہم صرف وجوہات کے مطلب ومعنی پر اختصار کریں گے۔

پہلی وجہ: فصاحت و بلاغت:

فصاحت کی کوئی خاص تعریف نہیں کی جاتی، جب تک اس کے اقسام کی جانب تقسیم نہ ہو، جس کی تفصیل ''مختصر المعانی'' میں دیکھا جا سکتا ہے۔

بلاغت کا معنی علامہ رحمت اللہ کیرانوی صاحب نے یوں بیان کیا ہے کہ:

''بلاغت کا مطلب یہ ہے کہ جس موقع پر کلام کیا جا رہا ہے اس کے مناسب معنی کے بیان کے لئے بہترین الفاظ اس طرح منتخب کئے جائیں کہ مدعا کے بیان کرنے میں اور اس پر دلالت کرنے میں نہ کم ہوں نہ زیادہ، لہذا جس قدر الفاظ زیادہ شاندار اور معانی شگفتہ ہوں گے اور کلام کی دلالت جس قدر حال کے مطابق ہوگی اتنا ہی وہ کلام زیادہ بلیغ ہوگا''

(ترجمہ اظہار الحق مسمی بائبل سے قرآن تک جلد/ 2 ص/ 306)

دوسری وجہ: اسلوب العجیب:

قرآن کی دوسری وجہ معجزہ اسلوب عجیب ہے، جو تمام اسلوب عربیہ سے مختلف ہے۔

تیسری وجہ: الایجاز الرائع:

تیسری وجہ اعجاز عمدہ اختصار اور پر اثر کلام ہے، جس سے فصحاء و بلغاء عرب کا کلام خالی ہے۔

چوتھی وجہ: التشریع الالھی الکامل:

چوتھی وجہ اعجاز قرآن مکمل ضابطہ حیات ہے۔

پانچویں وجہ: الاخبار عن المغیبات:

پانچویں وجہ اعجاز قرآن کا علوم غیبیہ کا خبر دینا ہے، اور ان کا اسی طرح تکمیل کا ہونا۔

چھٹی وجہ: عدم التعارض:

چھٹی وجہ اعجاز یہ ہے کہ قرآن میں تعارض اور تناقض نہیں ہے۔

ساتویں وجہ: اخبار عن الازمنۃ الماضیۃ:

ساتویں وجہ اعجاز ماضی کی خبریں دینا۔

یہ چند موٹے موٹے اعجازات اختصار کے ساتھ ہم نے بیان کیا، تفصیل اور تحقیق کے لئے علامہ صابونی رح کی کتاب ''التبیان فی علوم القرآن'' اور علامہ رحمت اللہ کیرانوی صاحب رح کی کتاب ''اظہار الحق'' کی طرف مراجعت فرمائیں۔

تناقض اور تضاد

ملحدین ومخالفین قرآن میں تناقض وتضاد ثابت کرنے کے لئے سعی ناتمام کرتے ہیں۔ اس لئے یہاں ہم تناقض وتضاد کو بیان کریں گے تاکہ آگے مضامین سمجھنے میں آسانی ہو اور مکررات سے بچے۔

تناقض کی تعریف:

علامہ سید جرجانیؒ نے تناقض کی تعریف یوں کیا ہے:

'' هو اختلاف القضيتين بالايجاب والسلب بحيث يقتضى لذاته صدق احدهما وكذب الاخرى كقولنا زيد انسان ، زيد ليس بانسان ''

(کتاب التعریفات ص/ 93)

تناقض کہتے ہے دوقضیوں کے درمیان اختلاف ہونا ایجاب اور سلب میں اس حیثیت سے ان میں سے ایک بذات خود صدق کا تقاضہ کرے اور دوسرا کذب کا، جیسے کہ ہمارا یہ کہنا زید انسان ہے، زید انسان نہیں ہے۔

ایک دو الفاظ کے زیادتی کے ساتھ یہی تعریف ایساغوجی میں بھی موجود ہے۔

تضاد کی تعریف:

علامہ سید جرجانی رح نے اس کی تعریف میں فرماتے ہیں:

'' هو ان يجمع بين المتضادين مع مراعاة فلا يجيئ باسم مع فعل ولا بفعل مع اسم كقوله تعالىٰ فليضحكوا قليلا وليبكوا كثيرا ''

كتاب التعريفات ص/ 84

تضاد کہتے ہے دو متضاد چیزوں کو جمع کرنا اس کی رعایت رکھتے ہوئے کہ اسم فعل کے ساتھ نہ آجائے اور فعل اسم کے ساتھ نہ آجائے جیسے اللہ تعالیٰ کا قول پس کم ہنسنا چاہیے اور زیادہ رونا چاہیے۔

شرائط تناقض:

دو باتوں (قضایا) کے درمیان ''تناقض'' اسی وقت ثابت ہوتا ہے جب مخصوص شرائط پوری ہوں۔ جو منطق کی کتابوں میں موجود ہے، ہم ایساغوجی سے یہاں نقل کر رہے ہیں۔

(1) دونوں قضایا کا موضوع ایک ہو، جیسے زید کھڑا ہے، زید کھڑا نہیں ہے

(2) دونوں کا محمول ایک ہو، جیسے زید بیٹھا ہے، زید بیٹھا نہیں ہے۔

(3) دونوں کا زمانہ ایک ہو، جیسے زید صبح کھڑا تھا، زید صبح کھڑا نہیں تھا۔

(4) دونوں کا مکان ایک ہو، جیسے زید گھر میں کھڑا تھا، زید گھر میں کھڑا نہیں تھا،

(5) دونوں کا اضافت ایک ہو، جیسے زید بکر کا بیٹھا ہے، زید بکر کا بیٹا نہیں ہے۔

(6) دونوں بالقوہ یک ہو۔ جیسے زید بالقوہ ہنسنے والا ہے، زید بالقوہ ہنسنے والا نہیں ہے۔

(7) دونوں بالفعل ایک ہو، جیسے زید بالفعل ہنسنے والا ہے، زید بالفعل ہنسنے والا نہیں ہے۔

(8) جزء اور کل میں ایک ہو، جیسے زید کالا ہے، زید کالا نہیں ہے

(9) دونوں شرط میں متحد ہو، جیسے زید کا منہ ہلتا ہے اگر وہ کھائے، زید کا منہ نہیں ہلتا اگر وہ کھالیں۔

(ایساغوجی ص/25)

ان شرائط کے بغور پڑھا جائے، آگے مخالفین قرآن جہاں بھی قرآن میں تناقض ثابت کرنے کی کوشش کریں گے اگر یہ شرائط پایا گیا تو تناقض ہوگا ورنہ نہیں۔

اسباب العلم

غور وفکر کرنے کے بعد کسی چیز کو معلوم کرنے کے لئے تین اسباب ہے، جن کو علامہ عمر بن محمد النسفی رحمہ اللہ نے اپنی مختصر کتاب ''العقائد'' جو ایک متن ہے، میں ہوں بیان فرماتے ہیں:

اسباب العلم للخلق ثلاثة : الحواس السليمة والخبر الصادق والعقل فالحواس خمس السمع والبصر والشم والذوق واللمس وبكل حاسة منها يوقف على ما وضعت هى له والخبر الصادق على نوعين احدهما الخبر المتواتر وهو الخبر الثابت على السنة قوم لايتصود تواطؤهم على الكذب وهو موجب للعلم الضرورى كالعلم بالملوك الخالية فى الازمنة الماضية والبلدان النائية والنوع الثانى خبر الرسول المؤيد بالمعجزة يوجب العلم الاستدلالى والعلم الثابت به يضاهى العلم الثابت باضرورة فى التيقن والثبات واما العقل فهو سبب للعلم ايضا وما ثبت منه بالبداهة فهو ضرورى كالعلم بان كل شيئ اعظم من جزئه وما ثبت بالاستدلال فهو اكتسابى والالهام ليس من اسباب المعرفة بصة الشيئ عند اهل الحق

(متن العقائد للنسفی)

ترجمہ: مخلوق کے لئے اسباب علم تین ہیں: حواس سلیمہ، خبر الصادق اور عقل، حواس سلیمہ پانچ ہیں: سننا، دیکھنا، سونگھنا، چکھنا، ہاتھ لگانا۔ اوران میں سے ہر حس موقوف ہے اس بات پر جو اس کے لئے وضع کیا گیا ہوں، اور خبر الصادق دو قسم پر ہیں: پہلا خبر متواتر وہ خبر جو ایسی قوم کے طریقے سے ثابت ہو جس پر جھوٹ کی نسبت کرنا متصور نہ ہو اور اس خبر کے ذریعہ علم ضروری ثابت ہوتا ہے جیسے گزرے ہوئے زمانے کے بادشاہوں کا علم اور دور دراز کے شہریں۔ دوسری قسم خبر الرسول جس کی تائید معجزہ سے کیا گیا ہو، اور اس خبر سے علم استدلالی حاصل ہوتا ہے، اور خبر الرسول سے جو علم ثابت ہوتا ہے وہ مشابہت رکھتا ہے علم ضروری ہے ساتھ یقین اور ثابت ہونے میں۔ اور عقل وہ بھی اسی طرح علم کا سبب ہے، اور اس سے اگر بدیہی طور پر ثابت ہو تو وہ علم ضروری ہے جیسے اس چیز کا علم کہ ہر چیز اپنے جزء سے بڑا ہے۔ اور اگر استدلالی ثابت ہو تو علم اکتسابی ہے۔ اور الہام اسباب معرفہ میں سے نہیں ہے کسی شی کے صحت کے لئے اہل حق کے نزدیک۔

حواس جمع حاسۃ کی بمعنی قوۃ کے ہیں، یعنی قوۃ سالمہ پانچ ہیں: اول قوۃ سامعہ ہے جس کے ذریعہ اشیاء کی آواز سن سکتے ہیں۔ اور دوم قوۃ باصرہ ہے جس کے ذریعہ اشیاء کو دیکھ سکتے ہیں۔ اور سوم قوۃ شامہ ہے جس کے ذریعہ خوشبو اور بدبو کو محسوس کر سکتے ہیں۔ اور چہارم قوۃ ذائقہ ہے جس کے ذریعہ اشیاء کے ذائقہ پہچان سکتے ہیں۔ اور پنجم قوۃ لامسہ ہے جس کے ذریعہ اشیاء گرم اور ٹھنڈک اور دیگر چیزوں کو محسوس کر سکتے ہیں۔

اور فرمایا کہ ان میں سے ہر قوۃ اطلاع پاتا ہے اس چیز پر جس کے لئے اس کو وضع کیا گیا ہو، جیسے قوۃ سامعہ کے ذریعہ کسی چیز کی آواز کو سن سکتے ہیں، تو اس کے ذریعہ آپ کسی چیز کو سونگھ نہیں سکتے، کیونکہ اس قوۃ کو وضع اشیاء کے سننے کے لئے کیا گیا ہے۔

دوسرا سبب علم خبر الصادق ہے، پھر اس کی دو قسمیں ہیں اس خبر متواتر دوسرا خبر الرسول، خبر

متواتر کہتے ہے کہ ایک خبر کو اتنے سارے لوگ نقل کرے کہ عقل ان کے جھوٹے ہونے کو قبول نہ کرے، جیسے ہلاکو خان، چنگیز خان فاتح گزرے ہیں، اور سکندر اعظم ایک بادشاہ گزرا ہے۔ اور خبر متواتر سے علم ضروری ثابت ہوتا ہے، یعنی وہ علم جس میں غور وفکر کی ضرورت نہیں اور جس کے لئے کوئی دلیل کی ضرورت نہیں، اور دوسری قسم خبر الرسول ہے جس کی تائید معجزہ کے ساتھ کیا گیا ہو، اور اس خبر سے جو علم ثابت ہوتا ہے وہ علم استدلالی ہوتا ہے یعنی علم نظری جس میں غور وفکر کی ضرورت ہو۔ مگر خبر الرسول سے جو علم ہوتا ہے وہ مشابہت رکھتا ہے علم ضروری ہے ساتھ۔

تیسرا سبب علم عقل ہے، اس سے اگر بداہۃ کچھ ثابت ہو تو وہ ضروری ہے اور اگر استدلالا ثابت ہو تو اکتسابی ہے۔

چند اصول

ذیل میں چند اصول بیان کئے جائیں گے، جن کا تعلق براہ راست یا بالواسطہ یا ضمنا آنے والے مضامین سے ہوں گے۔ اور ان اصول کو حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کی کتابچہ (الانتباہات المفیدہ) سے لیا گیا ہے۔

(1) کسی چیز کا سمجھ میں نہ آنا اس کے باطل ہونے کی دلیل نہیں۔

یعنی کوئی چیز آپ کو سمجھ نہیں آرہا تو آپ حکم لگادیں کہ یہ باطل ہے ایسا نہیں ہوسکتا۔

(2) جو امر عقلا ممکن ہو اور دلیل نقلی صحیح اس کے وقوع کو بتلاتی ہو اس کا قائل ہونا ضروری ہے، اسی طرح اگر عدم وقوع کو بتلادے تو عدم وقوع کا قائل ہونا ضروری ہے۔

جیسے آسمان کے بارے میں نظریہ اسلام، اور جو نظریہ فلاسفہ یا سائنس کا ہے عقلا دونوں امر ممکن ہے، مگر دلیل نقلی جب اس کے وجود کو بتلاتی ہے، تو اس کا قائل ہونا ضروری ہے۔

(3) محال اور مستبعد دونوں الگ الگ ہے، محال خلاف عقل کو کہتے ہیں اور مستبعد خلاف عادت۔

جیسے کوئی کہے ایک مساوی ہے دو کا، تو یہ محال اور خلاف عقل ہے، اور مستبعد جیسے کوئی کہے لوہا اڑتا ہے، جس نے نہ جہاز نہ دیکھا ہو اور نہ سنا ہو اس کے متعلق تو وہ اس کو غلط سمجھے گا، اور خلاف عقل سمجھے گا، حالانکہ ہم نے جہاز کو جب دیکھ لیا تو اب یقین آ گیا، یا جیسے آج کے دور میں ویڈیوں کال ہے موبائل پر۔ اگر یہ بات گزشتہ صدی میں کسی کو بتلا دیتے کہ ایک ایسا آلہ ہے جس کے ذریعہ کوئی بندہ دنیا کے آخر کونے میں ہو اور دوسرا دوسرے کونے میں تو ایک دوسرے کو دیکھ کر بات کر سکتے ہیں، حالانکہ عقل اس کو جائز قرار نہیں دیتا مگر یہ خلاف عادت ہے، چونکہ ان کا وقوع یا تو ہوا نہیں ہے یا شاذ و نادر ہوا ہے اس لئے عقل اگرچہ اس قبول نہیں کرتا مگر یہ سب خلاف عادت ہے۔

(4) موجود ہونے کے لئے محسوس و مشاہدہ کا ہونا ضروری نہیں۔

جیسے کوئی کہے چنگیز خان ایک ظالم گزرا ہے تو اس کے دعوی کو اس لئے رد نہیں کیا جا سکتا کہ ہم نے تو نہیں دیکھا ہے اور نہ ہم نے محسوس کیا ہے، اس لئے ایسا ناممکن ہے۔

(5) مدعی سے دلیل کا مطالبہ کیا جا سکتا ہے مگر نظیر کا نہیں۔

جیسے کوئی کہے ہلاکو خان نے بغداد پر حملہ کیا تھا، اب اس سے دلیل کا مطالبہ تو جائز ہے مگر نظیر کا نہیں، کہ کوئی اس لئے انکار کر دے کہ مجھے نظیر پیش کرو اس کا کہ ہلاکو خان نے بغداد پر حملہ کیا تھا تب میں تسلیم کر لوں گا ورنہ نہیں۔ تو یہ جائز نہیں۔

باب اول

ڈاکٹر ٹسڈل کی کتاب" ماخذ القرآن" پر ایک نظر:

ٹسڈل ایک برطانوی عیسائی مشنری ہے، جس کا پورا نام کلیئر ٹسڈل (ST. W.REV . CLAIR TISDALL) ہے، جنہوں نے انیسویں صدی کے اوائل میں انگلش میں ایک کتاب لکھی جس کا نام ہے اوریجنل سورسز دے قرآن (THE ORIGINAL SOURCES OF THE QUR'AN

) جس کا اردو ترجمہ ''ماخذ القرآن'' کے نام سے شائع کیا گیا ہے۔

اس کتاب میں موصوف اس بات کو ثابت کرنے کی سعی نا تمام کی ہے کہ قرآن اللہ کا کلام نہیں ، یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی طرف سے گھڑا ہے اور کچھ دوسرے مذاہب سے لیا ہے، کچھ اپنے زمانے کے لوگوں سے لیا ہے، یعنی یہاں وہاں سے جمع کر کے بعد میں یہ دعوی کیا کہ یہ کلام من جانب اللہ ہے۔

ٹسڈل صاحب کے اس دعویٰ اور کتاب میں کتنی صداقت ہے، اس کا فیصلہ کتاب پڑھنے کے بعد ایک سنجیدہ قاری کر سکتا ہے۔

فاضل مصنف نے اپنی کتاب کو چھ ابواب پر ترتیب دیا ہے، اسی ترتیب سے ہم نے بھی جائزہ لیا ہے۔

یاد رہے ہمارے سامنے ڈاکٹر ٹسڈل کی کتاب کا اردو ترجمہ موجود ہے، کتاب چونکہ انگلش میں لکھی گئی ہے، اس لئے ممکن ہے مترجم نے مصنف کے کہی مفہوم کو کچھ اور انداز میں بیان کیا ہوگا، جس سے مصنف کا مقصد مفہوم وہ نہیں ہوگا جو مترجم نے بیان کیا، اس پر مخالفین و قارئین کو اجازت ہیں، اگر کہی ایسی عبارت نظر آئے جہاں مصنف کا کچھ اور مقصد تھا لیکن راقم الحروف

ترجمہ شدہ کتاب کے مطابق اس کو اسی انداز میں سمجھ کر تنقید یا رد کیا جو مترجم نے پیش کیا تھا، اس پر ہمیں مطلع کرے، اور اصل بات ہمارے سامنے رکھے تو ان شاء اللہ ہم اس بات کو تبدیل کر کے عین مصنف کے مفہوم کے مطابق اس کا جواب پیش کریں گے۔

فصل اول: ماخذ کا معنی اور کتاب کا اجمالی جواب

ماخذ کا معنی:

''ماخذ'' یہ عربی زبان کا لفظ ہے، مادہ اس کا ئ، خ، ذ (أخذ) اور باب نصر ینصر (اَخَذَ یَاخُذُ) سے اسم ظرف کا صیغہ ہے، بمعنی لینے کی جگہ۔

اور اس کا معنی یہ ہے جہاں سے کوئی چیز حاصل کی جائے، کسی چیز کی بنیادی حصہ، وہ جگہ جہاں سے وہ وجود میں آئے۔ اور یہ معنی بھی کیا گیا ہے کہ کسی چیز کے ہونے کا سبب بھی ماخذ کہلاتا ہے۔

دونوں معنی کو مدنظر رکھ کر اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کہی سے ایسی چیز حاصل کرنا جو اس سے پہلے موجود ہو، اور یہ چیز اسی کے بسبب وجود میں آیا ہو، اور اگر اول شئی موجود نہ ہو تو ثانی بھی موجود نہ ہوگا اور ماخذ نہ کہلائے گا۔

اور فی زماننا اس کا معنی یہ بھی ہے کہ کسی کتاب سے کوئی عبارت لینا یا کہی سے کوئی چیز دیکھ کر اس کو نقل کرنا اس کو ماخذ کہتے ہیں۔

اور اسی کے قریب معنی مصدر کا بھی ہے اور مرجع کا بھی۔ مصدر کہتے ہیں ایسے واقعات اور اشیاء کو بیان کرنا جن کو وہ خود دیکھا ہو، یا سنا ہو۔ اور مرجع کا معنی یہ ہوتا ہے کہ کہی سے ایسے اشیاء کا لینا یا بیان کرنا جہاں وہ خود شریک نہ ہو، بلکہ کہی سے سنا ہو اور دیکھا ہو۔

کتاب کا اجمال جواب:

ماخذ کا معنی معلوم کرنے کے بعد مصنف کا دعوی اور دلائل کا جواب اسی میں ہوگیا، کیونکہ جن واقعات اور دلائل وشواہد کو مصنف نے بطور ماخذ بیان کیا ہیں، جن سے ان کا مقصد یہ ہے کہ قرآن نے جو باتیں جو قصص بیان کیا ہیں وہ بعض تو یہودیوں سے لیا ہیں اور بعض عیسائیوں سے

اور بعض مجوسیوں سے بعض دیگر مذاہب وذرائع سے۔

قارئین کرام! آپ جب آگے اس کتاب کا مطالعہ کریں گے یا براہ راست مصنف کی کتاب کا مطالعہ کریں گے تو آپ کو اس بات کا بخوبی اندازہ ہوگا کہ مصنف نے سوائے ایک دو واقعات کے پوری کتاب میں ایسا واقعہ پیش نہیں کیا ہے، جو قرآن میں بھی موجود ہو اور اسی طرح دیگر مذاہب کی کتابوں میں اسی طرح کا واقعہ بیان ہوا ہو۔

مصنف نے جو واقعات پیش کیا ہیں ان کو مماثلت اور کچھ باتوں میں مشارکت تو کہا جا سکتا ہے مگر ماخذ ہرگز نہیں۔ کیونکہ ماخذ کا معنی یہی ہے جو اس سے پہلے کہی موجود ہو، اور یہ موجود ہونا کامل ہوتا ہے جیسے ہمارے عرف عام میں ہم کسی کتاب سے کوئی اقتباس لیتے ہیں اور پھر ماخذ کے طور پر اس کتاب کا نام لکھ دیتے ہیں، تاکہ قاری اس سے سمجھ سکے یہ بات فلاں کتاب سے لی گئی ہیں، اس کا مطلب تو یہ نہیں ہوتا کہ آپ بطور ماخذ کسی کتاب کا نام لکھ دے اور پھر اس سے مشابہت کوئی بیان کرے اور کہے کہ یہ بات میں نے فلاں جگہ سے لی ہے، ظاہر ہے مخاطب تو اس کو ماخذ نہیں سمجھے گا، ماخذ تب بنتا ہے جب آپ یہ اقتباس ویسے ہی دوسری کتاب سے لیا ہو جیسے وہاں نقل ہوا ہے۔ اگر تھوڑی سی مشابہت یا مماثلت یا بعض اجزاء میں مشارکت کو آپ ماخذ کا نام دیں گے تو پھر دنیا میں کوئی کتاب بغیر ماخذ کے نہیں رہے گا۔ کیونکہ ہر کتاب میں ایسی باتیں موجود ہوتے ہیں جو اس سے ماقبل کسی کتاب میں موجود ہو، تو پھر آپ کہے کہ یہ باتیں اس نے فلاں کتاب سے لی ہے، حالانکہ اس نے وہ کتاب تو خواب میں بھی نہیں دیکھا ہوگا۔

پس اس سے سمجھنا چاہیے کہ مصنف نے ماخذ کا دعوی تو کیا ہے مگر پوری کتاب میں یہ ثابت نہیں کر سکا کہ یہ بات یا واقعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فلاں کتاب سے لی ہے، کیونکہ جہاں بھی اس پر کوئی حوالہ پیش کیا ہے آپ دیکھیں گے وہاں دونوں ایک جیسے نہیں ہوں گے، بلکہ قرآن کے بیان کردہ واقعہ ان سے مختلف ہوگا، بعض الفاظ اور واقعات میں ضرور ایک جیسے ہوں گے مگر

قرآن کا بیان کردہ واقعہ اس سے مختلف ہوتا ہے، یہی اس کی سب سے بڑی دلیل ہے کہ رسول اللہ نے یہ واقعہ کہی سے لیا نہیں ہے، ورنہ مخلتف کیسے ہوتے۔

پھر واقعات کے مختلف ہونے پر مصنف عجیب عجیب عذر لنگ بیان کرتا ہے، کبھی کہتا ہے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اس واقعہ میں غلطی ہوگئی جس کی وجہ سے وہ اصل واقعہ کو ایسا سمجھا اور بیان کر دیا جو دراصل ایسا نہیں تھا، پھر کہتا ہے محمد کو اس کو سمجھنے میں غلطی ہوگئی، پھر کہتا ہے محمد نہیں جانتا تھا۔ غرض آپ کو تضاد ہی تضاد نظر آئیں گے جو ہم نے واضح کر دیا ہے۔

فصل دوم: باب اول کی ماہیت

باب اول میں موصوف نے تمہید پیش کیا ہے، اور تمہید کا آغاز قدیم یونانی حکیم دیموقراطس کے نظریہ سے کیا ہے۔

خشت اول چوں نہد معمار کج:

فارسی شعر ہے کہ۔

خشت اول چوں نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج

یعنی پہلی اینٹ کو معمار نے جب ٹیڑھی رکھ دی تو ثریا تک یہ دیوار ٹیڑھا ہی رہے گا۔

یہی حال صاحب کا ہے جس نے ابتداء ہی ایسی بات سے کر دی سمجھ نہیں آتا کہ خود اسے تسلیم کرتا ہے یا نہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ:

''قدیم یونانی حکیم دیموقریطس Democritus کے اس قول میں بہت کچھ صداقت ہے کہ ''کوئی چیز عدم سے وجود میں نہیں آئی''۔ چنانچہ اس کلیہ سے یقیناً مذہب اسلام بھی مستثنیٰ نہیں۔''

موصوف دیموقراطس کے نظریہ کو صداقت پر مبنی قرار دے کر مذہب اسلام کو استثناء نہیں کیا۔ قطع نظر اس بات سے کہ دیموقراطس کا یہ لچر اور فضول نظریہ درست ہے یا نہیں۔ مصنف کے استثنائی کلام پر تبصرہ کریں گے کہ مصنف کے نزدیک مذہب اسلام ازلی ہے، کیونکہ دیموقراطس کے نظریہ کو پیش کر کے بعض جزئیات کا اقرار کرنے کے بعد مذہب اسلام کو اس میں شامل کرنا یقینا مصنف کے نزدیک مذہب اسلام ایک ازلی مذہب ہے، یعنی عدم سے وجود میں نہیں آیا بلکہ ازل سے موجود ہے۔ اور جو چیز ازلی ہو وہ قدیم ہے اور قدیم حدوث نہیں، لہذا ثابت ہوا کہ مذہب اسلام عیسائیوں کے ہاں ایسا مذہب ہے جو ہمیشہ سے تھا اور ہمیشہ رہے گا۔ جب کہ

عیسائیت ازلی نہیں کیونکہ یہ بات عیسائی بھی تسلیم کرتے ہے کہ عیسائیت کا آغاز حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد ہوا، اس سے پہلے عیسائی نہیں تھے۔ پس مصنف کے قول سے ثابت ہوا عیسائیت ایک جدید مذہب ہے اور حادث ہے، اور اسلام قدیم مذہب ہے، اس سے اسلام کی فضیلت ثابت ہوئی۔

رہی بات دیموقراطس کے نظریے کا تو یہ ایک فضول اور غیر معقول نظریہ ہے، کیونکہ اگر کوئی چیز عدم سے وجود میں نہیں آئی تو پھر عقل کا تقاضا یہ ہے کہ اگر کوئی چیز عدم سے وجود میں نہیں آئی تو ہر چیز کو وجود سے عدم کی طرف بھی نہیں جانا چاہیے، اگر ہمارا یہ قول غلط ہے تو آپ کا قول کس بنیاد پر درست ہے؟ اور پھر اس نظریہ کے حامل ہمیں بتائے آپ کے نزدیک عدم سے وجود میں نہ آنے کا کیا مطلب؟ اگر یہ مطلب کہ سب کچھ پہلے سے موجود تھا تو دریافت طلب یہ امر ہے کہ جو چیزیں آنے والے صدی میں دریافت ہوتے ہے وہ گزشتہ صدی میں نظر کیوں نہیں آتے ؟

مزید موصوف نے اپنی تمہید میں جمع قرآن سے متعلق بحث کیا ہے اور جمع قرآن کو کیسے جمع کیا گیا بروایت بخاری احادیث کو پیش کیا ہے، مقدمہ میں ہم نے جمع قرآن کے متعلق مختصر کلام پیش کیا ہے۔ اور آخر میں جناب نے گویا اپنی کتاب کا خلاصہ بھی بیان کر دیا اور ساتھ میں دعویٰ بھی پیش کیا کہ میں نے یہ کتاب کیوں لکھی اور دعویٰ کیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ:

”لہٰذا علمائے اسلام کا عقیدہ ہے کہ اسلام کا ماخذ اور سرچشمہ خود اللہ تعالیٰ ہے اور اسلام کا کوئی حصہ بالواسطہ یا بلا واسطہ سابق الہامات یا دیگر مذاہب سے نہیں لیا گیا۔ اگرچہ قرآن مجید اس لئے نازل ہوا تھا کہ وہ تورات وانجیل کی تصدیق کرے اور اسلام کا دعویٰ ہے کہ وہ اصلی اور بلا تحریف الہامی کتابوں کے موافق ہے۔

اسلام کا یہ دعویٰ جو اس وقت ہمارے پیش نظر ہے اہل فہم حضرات کے نزدیک قابل قبول نہیں، کیونکہ قرآن کی اخلاقیات، اس کا نظریہ دربارہ فطرۃ اللہ، اس کے وقائع (واقعات)

تاریخی اور بہت سی دوسری باتیں ایسی ہیں جن کی بنا پر ہم اس بات میں ہرگز شبہ نہیں کر سکتے کہ وہ خود محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تصنیف کردہ کتاب ہے۔ اسی کے ساتھ یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ وہ خیالات، وہ بیانات اور وہ اقوال جو محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے مذہب میں داخل کئے وہ کہاں سے لئے گئے؟ کون سی باتیں خود ان کی ایجاد ہیں اور کون سی باتیں دوسرے مقامات سے لی گئی ہیں؟ جو لوگ دیگر مذاہب کے پیرو تھے ان کی تعلیمات سیکھنے کے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کیا ذرائع حاصل تھے؟ اگر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کچھ باتیں دیگر مذاہب سے لی ہیں تو وہ کیا ہیں اور کس کس مذہب سے کون کون سی بات لی گئی؟ اور جو نتائج دین اسلام نے پیدا کئے ان میں کس قدر اسوۂ محمدی کے اور کس قدر حالت زمانہ کے رہین منت ہیں؟ یہ ہیں وہ چند مسائل جو ہم حتی الامکان نہایت وضاحت کے ساتھ اور مدلل طور پر ظاہر کریں گے۔''

یہ اقتباس گویا مصنف کی کتاب کا خلاصہ اور دعویٰ ہے، کہ کتاب کو اس لئے مرتب کیا گیا ہے کہ اس میں مذکورہ دعویٰ ثابت کیا جاسکے۔ مگر قارئین کرام جب اس دعویٰ کے بعد دلائل کو دیکھیں گے، تو ان پر یہ امر روشن ہوگا کہ بقول داغ دہلوی ؎

کس کا یقین کیجیے کس کا یقیں نہ کیجیے
لائے ہیں اس کی بزم سے یار خبر الگ الگ

فصل سوم: باب دوم کا ابطال

اسلام پر قدیم عربی عقائد و رسوم کا اثر:

یہ عنوان لگا کر مصنف اس باب میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کیا ہے کہ اسلام پر قدیم عربی عقائد و رسوم کا اثر ہے، یعنی ماقبل اسلام جو عقائد و رسوم رائج تھے، ان میں کچھ اب بھی اسلام میں باقی ہے۔اور اس سے جناب نے یہ ثابت کیا ہے کہ گویا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ عقائد و رسوم قدیم عربوں سے لیا ہے جو ان سے پہلے موجود تھے۔

یہ بات تو واضح ہے کہ اسلام سے قبل کچھ افعال و اعمال ایسے تھے جن کو اسلام نے برقرار رکھا ،ان کو منسوخ نہیں کیا گیا جسے اصول فقہ میں افعال حسیہ کہتے ہیں۔ جیسے زنا، جھوٹ بولنا، ان کو شریعت سے پہلے بھی برے افعال سمجھا جاتا اسلام کے بعد بھی یہ ایسے ہی ہے۔

مگر مصنف کا یہ خام خیالی ہے کہ وہ اس کو اسلام یا قرآن کا ماخذ قرار دے رہے ہیں کہ اسلام نے یہ افعال ماقبل مذاہب یا کسی قوم سے لیا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ پیغمبروں کو بھیجتا ہیں لوگوں کی ہدایت و رہنمائی کے لئے، ماقبل شریعت کوئی اچھی بات کو برقرار رکھنا یا وہ جسے عقلا برا کہا جا سکے یا لوگ اس کو برا جانتے ہیں یا فطرۃً وہ برا ہے، اس سے منع کرنے سے یہ کہا لازم آتا ہے کہ یہ شریعت معاذ اللہ جھوٹی ہے یا پیغمبر جھوٹا ہے، کیونکہ وہ یہ باتیں فلاں مذہب سے لیا ہے یا فلاں قوم سے۔

مصنف شریعت اور پیغمبر کی تشریف آوری کے مقاصد سے ناواقف ہے۔ کیونکہ پیغمبر تشریف لاتے ہیں لوگوں کی رہنمائی کے لئے، مگر مصنف کی باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ پیغمبر اس کو سمجھتا ہیں جو ایسی باتوں کا حکم دے جو اس سے پہلے کسی نے نہ دیا ہو، اور جو باتیں ماقبل شرع میں مشروع تھے ان کو کالعدم قرار دے اور جو غیر مشروع تھے ان کو مشروع قرار دے

حالانکہ عقلا یہ غلط ہے، کیونکہ اگر یہ تسلیم کرلیا جائے پھر تو عیسائی مذہب بھی کوئی مذہب نہیں اور نہ حضرت عیسی علیہ السلام اللہ کا رسول ہوگا ۔ کیونکہ اس صورت میں کہا جائے گا کہ وہ بعض باتیں ایسے بتائی ہیں جو یہودی مذہب میں موجود تھے، اوراس نے وہاں سے لیا ہے، اور پھر یہودی مذہب بھی ایسا ہی ہوگا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے بھی یہ ماننا پڑے گا، پھر آگے اسی طرح یہ سلسلہ آگے بڑھتا جائے گا،جس سے تسلسل ودور لازم آئے گا جوکہ باطل ہے، اوراس سے مذہب کی وجود ختم ہوگا،حالانکہ خود مصنف عیسائی مذہب سے تعلق رکھتے ہیں، اگران کا یہ قضیہ تسلیم کیا جائے تو وہ بھی لامذہب ہوں گے۔

کسی سلطنت کا بادشاہ اگر حکمرانی کرکے وفات پائے اور دوسرا بادشاہ آجائے تو یہ کچھ اصلاحات جدید کے ساتھ پرانے بادشاہ کی کچھ باتوں کو بھی بروئے کار لاکر رعایا کو ان کے کرنے نہ کرنے کا حکم دیتا ہے ۔تو کیا عوام صرف اس لئے اس کو جھٹلائے کہ یہ باتیں تو سابق سلطان کے ہیں، ان سب کا ماخذ ومنبع تو وہی ہے، لہذا آپ سلطان نہیں ہوسکتے ۔ارباب دانش کیا رعایا کے اس بات سے متفق ہوں گے، بالکل بھی نہیں۔

غرانیق کا واقعہ:

اس باب میں مصنف نے غرانیق کا واقعہ بھی پیش کیا ہے،جس کا جواب تفاسیر اور علماء کرام کے کتب میں تفصیلاً موجود ہیں، یہ واقعہ بے بنیاد، من گھڑت اور ضعیف ہے، عقلا ونقلا دونوں اعتبار سے غیر معتبر ہے، جسے علماء اسلام نے رد کیا ہے۔ہم مختصراس کا تذکرہ کریں گے۔

یہ واقعہ عموماً سورۃ الحج کی ایک آیت کے ذیل میں بیان کیا گیا ہے، آیت یہ ہے:

’’ وَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِکَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّ لَا نَبِیٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓی اَلْقَی الشَّیْطٰنُ فِیْٓ اُمْنِیَّتِهٖ ۚ فَیَنْسَخُ اللّٰهُ مَا یُلْقِی الشَّیْطٰنُ ثُمَّ یُحْكِمُ اللّٰهُ اٰیٰتِهٖ ؕ وَ اللّٰهُ

عَلِیْمٌ حَکِیْمٌ''

ترجمہ: اور (اے پیغمبر!) تم سے پہلے ہم نے جب بھی کوئی رسول یا نبی بھیجا تو اس کے ساتھ یہ واقعہ ضرور ہوا کہ جب اس نے (اللہ کا کلام) پڑھا تو شیطان نے اس کے پڑھنے کے ساتھ ہی (کفار کے دلوں میں) کوئی رکاوٹ ڈال دی، پھر جو رکاوٹ شیطان ڈالتا ہے، اللہ اسے دور کر دیتا ہے، پھر اپنی آیتوں کو زیادہ مضبوط کر دیتا ہے، اور اللہ بڑے علم کا، بڑی حکمت کا مالک ہے۔

ابن ابی حاتم میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ شریف میں سورۃ النجم کی تلاوت فرمائی جب یہ آیتیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم پڑھ رہے تھے'' اَفَرَأَیْتُمُ اللَّاتَ وَالْعُزّٰی وَمَنَاۃَ الثَّالِثَۃَ الْاُخْرٰی'' تو شیطان نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک پر یہ الفاظ ڈالے کہ ''تِلْکَ الْغَرَانِیقِ الْعُلٰی وَإِنَّ شَفَاعَتهنَّ تُرْتَجٰی'' پس مشرکین خوش ہو گئے کہ آج تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے معبودوں کی تعریف کی جو اس سے پہلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی نہیں کی۔ چنانچہ ادھر حضور نے سجدہ کیا ادھر وہ سب بھی سجدے میں گر پڑے اس پر یہ آیت اتری ''وَمَا أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ مِن رَّسُولٍ وَلَا نَبِيٍّ إِلَّا إِذَا تَمَنّٰى أَلْقَى الشَّيْطَانُ فِي أُمْنِيَّتِهِ'' (22الحج: 52)

قصہ غرانیق اور حافظ ابن کثیر:

ابو الفداء اسماعیل بن عمر بن کثیر القرشی الدمشقی لکھتے ہیں:

'' قَدْ ذَكَرَ كَثِيرٌ مِنَ الْمُفَسِّرِينَ هَاهُنَا قِصَّةَ الْغَرَانيق، وَمَا كَانَ مِنْ رُجُوعِ كَثِيرٍ مِنَ الْمُهَاجِرَةِ إِلَى أَرْضِ الْحَبَشَةِ، ظَنا مِنْهُمْ أَنَّ مُشْرِكِي قُرَيْشٍ قَدْ أَسْلَمُوا. وَلَكِنَّهَا مِنْ طُرُقٍ كُلُّهَا مُرْسَلَةٌ، وَلَمْ أَرَهَا مسندة من وجه صحيح، والله أعلم''

(تفسیر ابن کثیر تحت هذہ الآیۃ)

یہاں پر اکثر مفسرین نے غرانیق کا قصہ نقل کیا ہے اور یہ بھی کہ اس واقعہ کی وجہ سے اکثر مہاجرین حبش یہ سمجھ کر کہ مشرکین مکہ اب مسلمان ہو گئے واپس مکے آ گئے۔ لیکن یہ روایت ہر سند سے مرسل ہے۔ کسی صحیح سند سے مسند مروی نہیں، وَاللہُ اَعْلَمُ

علامہ قرطبی کا نظریہ:

ابوعبداللہ محمد بن أحمد بن أبي بکر الأنصاری القرطبی اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں:

''الْأَحَادِيثُ الْمَرْوِيَّةُ فِي نزول هذه الآية، وليس منها شي يَصِحُّ.''

(تفسیر قرطبی)

''وہ احادیث جو اس آیت کے نزول کے بارے میں نازل ہوئے ہیں، ان میں کوئی بھی روایت صحیح نہیں ہے۔''

اور پھر آگے علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے ان احادیث اور اس کے سند اور ضعف پر کلام کیا ہے۔

امام بزار کی نظر میں:

امام بزار رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ:

''هَذا حَدِيثٌ لا نَعْلَمُهُ يُرْوى عَنِ النَّبِيِّ صَلّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وآلِهِ وسَلَّمَ بِإِسْنادٍ مُتَّصِلٍ''

(بحوالہ فتح القدیر للشوکانی تحت هذہ الآیۃ)

''یہ حدیث جس کے بارے میں ہم نہیں جانتے کہ اس کو روایت کیا گیا ہو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے متصل سند کے ساتھ۔''

امام بیہقی اور واقعہ مذکورہ:

امام بیہقی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ:

’’ هَذِهِ الْقِصَّةُ غَيْرُ ثَابِتَةٍ مِن جِهَةِ النَّقْلِ. ثُمَّ أَخَذَ يَتَكَلَّمُ أَنَّ رُوَاةَ هَذِهِ الْقِصَّةَ مَطْعُونٌ فِيهِمْ ‘‘

’’یہ قصہ ثابت نہیں ہے بطرق النقل، پھر اس میں کلام کیا کہ اس قصہ کو روایت کرنے والوں پر جرح کیا گیا ہے۔‘‘

امام ابن خزیمہ کے ہاں اس قصہ کے واضع زندیق ہے:

امام الائمہ ابن خزیمہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ:

’’ إِنَّ هَذِهِ الْقِصَّةَ مِن وَضْعِ الزَّنَادِقَةِ ‘‘

(بحوالہ ایضا)

’’اس قصہ کو زنادیق میں سے کسی نے وضع کیا ہے۔‘‘

قاضی شوکانی رحمہ اللہ کا نظریہ:

آپ اپنی تفسیر (فتح القدیر) میں اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں:

’’ وَلَمْ يَصِحَّ شَيْءٌ مِن هَذَا وَلَا ثَبَتَ بِوَجْهٍ مِنَ الْوُجُوهِ. وَمَعَ عَدَمِ صِحَّتِهِ بَلْ بُطْلَانُهُ فَقَدْ دَفَعَهُ الْمُحَقِّقُونَ بِكِتَابِ اللَّهِ سُبْحَانَهُ ۔۔۔الخ ‘‘

(فتح القدیر از قاضی شوکانی)

’’اور ان روایات میں کچھ بھی صحیح نہیں ہے، اور نہ یہ کئی وجوہات کی بناء پر ثابت ہے، باوجود عدم صحت کے، بلکہ یہ باطل ہے اور محققین نے اس کو رد کیا ہے اللہ تعالیٰ کی کتاب کے ذریعے۔۔۔ الخ‘‘

علامہ ابن جوزی کا نظریہ:

علامہ ابن جوزی رحمہ اللہ آیت مذکورہ کے ذیل میں لکھتے ہیں کہ:

’’ قَالَ الْعُلَمَاءُ الْمُحَقِّقُونَ: وَهَذَا لَا يَصِحُّ؛ لِأَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ مَعْصُومٌ

عَنْ مِثْلِ هَذا''

(تفسیر ابن جوزی)

''محققین علماء نے کہا ہے کہ یہ قصہ صحیح نہیں ہے، اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس جیسے باتوں سے معصوم ہے۔''

امام رازی کا نظریہ:

امام فخر الدین الرازی رحمہ اللہ مذکورہ آیت کے ذیل میں لکھتے ہے کہ:

''أمّا أهْلُ التَّحْقِيقِ فَقَدْ قالُوا: هَذِهِ الرِّوايَةُ باطِلَةٌ مَوْضُوعَةٌ واحْتَجُّوا عَلَيْهِ بِالقُرْآنِ والسُّنَّةِ والمَعْقُولِ.۔۔۔۔ الخ''

(تفسیر رازی)

''محققین نے اس قصہ کے بارے میں کہا ہیں کہ یہ روایت باطل، موضوع ہے، اور انہوں نے اس پر استدلال کیا ہیں قرآن وسنۃ اور عقل سے۔۔۔۔۔ الخ''

پھر آگے انہوں نے اس کا بطلان عقل اور نقل سے کیا ہے، خوف طوالت سے ہم نے صرف نظریہ پیش کرنے پر اکتفاء کیا، اہل ذوق وہاں مراجعت کرے۔

علامہ نجم الدین النسفی کا نظریہ:

علامہ نسفی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ:

'' وهَذا القَوْلُ غَيْرُ مَرْضِيٍّ لِأنَّهُ لا يَخْلُو إمّا أنْ يَتَكَلَّمَ النَبِيُّ صلى الله عليه وسلم بِها عَمْدًا وإنَّهُ لا يَجُوزُ. لِأنَّهُ كُفْرٌ ولِأنَّهُ بُعِثَ طاعِنًا لِلْأصْنامِ لا مادِحًا لَها أوْ أجْرى الشَيْطانُ ذَلِكَ عَلى لِسانِ النَبِيِّ عَلَيْهِ الصَلاةُ والسَلامُ جَبْرًا بِحَيْثُ لا يَقْدِرُ عَلى الِامْتِناعِ مِنهُ وهو مُمْتَنِعٌ. لِأنَّ الشَيْطانَ لا يَقْدِرُ عَلى ذَلِكَ في حَقِّ غَيْرِهِ''

’’ اور یہ بات ناپسندیدہ ہے، اس لئے کہ (غرانیق) کے الفاظ نبی صلی اللہ علیہ وسلم یا تو قصدا پڑھیں گے، یہ جائز نہیں کیونکہ یہ کفر ہے اس لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا گیا ہے بتوں پر طعن کے لئے نہ کہ ان کی مدح کے لئے۔ یا پھر شیطان نے زبردستی نبی کریم صلی اللہ علیہ کی زبان پر وہ الفاظ جاری کئے اس طور پر کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس کے منع پر قادر نہیں تھے۔ اور یہ ممتنع ہے کیونکہ شیطان کو غیر کے حق میں قدرت نہیں ہے۔‘‘

قاضی ابوبکر بن العربی المالکی کا نظریہ:

تفسیر ثعالبی کے حاشیہ پر ہے کہ:

’’وكذا أنكر القصة القاضي أبو بكر بن العربي وطعن فيها من جهة النقل‘‘

(حاشیہ تفسیر ثعالبی تحت ھذہ الآیۃ)

اور اسی طرح قاضی ابوبکر بن العربی نے اس قصہ کا انکار کیا ہے اور اس کے نقل کے طریقے پر طعن کیا ہے۔

امام ابو منصور الماتریدی کا نظریہ:

امام ابو منصور ماتریدی رحمہ اللہ نے بھی اس قصہ کو موضوع قرار دیا ہے۔ (حاشیہ تفسیر ثعالبی تحت ھذہ الآیۃ)

اس کے بعد بھی اگر کوئی بغض وعناد میں سرشار متعصب اس واقعہ کو مذکورہ جوابات سے ہٹ کر دوبارہ وہی پرانا اعتراض دوہراتا ہے، تو اصولا اس کا جواب دینا ہمارا حق نہیں بنتا۔ اور رہی بات ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ کی، جو اس روایت کی ثبوت کی طرف گئے ہے ، تو اس کا جواب علامہ شنقیطی صاحب نے اپنی تفسیر ’’اضواء البیان‘‘ میں تفصیلا دیا ہے۔

کیا کوئی عقلمند اس واقعہ کو درست مان لے گا، ہرگز نہیں کیونکہ اس سے تو نبی کی نبوت مشکوک

بنے گا معاذ اللہ۔ پھر نبی کوئی بھی بات کہے تو لوگ کہیں گے ہوسکتا ہے شیطان نے پھر اس کی زبان میں ملاوٹ کی ہو، اور یہ باتیں جو کہہ رہا ہے حقیقت میں ایسا نہ ہو۔

دوسری بات علماء اسلام کا یہ بھی نظریہ ہیں کہ اگر کسی نے خواب میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تو حقیقت میں اس نے رسول اللہ کو ہی دیکھا، کیونکہ شیطان نبی کی صورت میں نہیں آسکتا۔ جب شیطان نبی کی صورت میں نہیں آسکتا تو اس کی زبان میں کیسے ملاوٹ کرسکتا ہے۔

فصل چہارم: باب سوم کا جواب

اسلام پر صابی و یہودی خیالات و رسوم کا اثر:

باب سوم کو یہ عنوان دے کر مصنف نے صابی اور یہودی عقائد و رسوم کو پیش کیا ہے جو اسلام کے معاملات سے ملتے جلتے ہیں، جیسے نماز، روزہ، و دیگر کچھ اعمال ایسے ہیں جو اسلام میں مسلمان کرتے ہیں، اور پھر ان سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اسلام نے ان رسوم و معاملات کو انہی مذاہب سے اخذ کیا ہے۔

اگر چہ اس کا آسان جواب ہم ماقبل دے چکے ہیں کہ عقائد و رسوم کے مماثلت سے یہ کہا ثابت ہوتا ہے کہ مذہب یا قوم کے ماخذ وہی ہے جو اس سے ماقبل مذاہب کے تھے۔

لہذا مصنف یا اس کا کوئی شاگرد اگر دنیا میں موجود ہے تو یہ ثابت کرے کہ مماثلت سے ماخذ لازم آتا ہے۔ اور اس کا بطلان ماقبل میں ثابت ہو چکا ہے۔

پہلے مصنف نے صابی قوم کے بارے میں کچھ مفروضات پیش کئے ہیں۔ ہم یہاں مختصر صابی مذہب اور قوم کے متعلق عرض کریں گے۔

صابی کون ہے اور ان کے عقائد و خیالات کیا ہے اور یہ کب کا ہے ان سوالات کے جوابات حتمی نہیں دیا جاسکتا، کیونکہ ان کے بارے میں مختلف باتیں لکھا جاچکا ہے بعض لوگ ان کے بارے میں کہتے ہیں کہ ان کا نہ کوئی مذہب ہے نہ کوئی دین اور نہ کسی رسول پر ایمان رکھتے ہیں ،اور بعض لوگ کہتے ہیں یہ ایسے ہیں جیسے زندیق جنہوں نے اپنے مذہب کو چھوڑ دیا ہیں، اور بعض لوگ اسے عیسائی اور یہودی کے درمیان ایک اور قوم قرار دیتے ہیں۔

علامہ ابن حزم اندلسی نے اپنی کتاب ''الملل والنحل'' میں صابیہ کا تعارف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''جو کہتے ہیں کہ مدبر عالم ایک سے زائد ہیں، انھیں میں صابی بھی ہیں، یہ لوگ قدامت اصلین کے قائل ہیں، جیسا کہ ہم نے پہلے مجوس کا قول بیان کیا ہے کواکب سبعہ کی تعظیم کرتے ہیں، بارہ بروج کے قائل ہیں۔ اپنے بت خانوں میں ان کی تصویر بناتے ہیں۔ قربانیاں چڑھاتے ہیں۔ عود کی دھونی دیتے ہیں۔ رات دن میں ان کی بھی پانچ نمازیں ہیں جو مسلمانوں کی نمازوں سے ملتی جلتی ہیں، رمضان کے روزے بھی رکھتے ہیں، اپنی نماز میں کعبے اور بیت الحرام کی طرف رخ کرتے ہیں مکے و کعبے کی تعظیم کرتے ہیں، مردار اور خون اور سور کے گوشت کو حرام سمجھتے ہیں، ان رشتہ دار عورتوں کو بھی حرام سمجھتے ہیں جو مسلمانوں کے نزدیک حرام ہیں۔

(الملل والنحل مترجم ص/ 64 مطبوع المیزان ناشران لاہور)

مزید علامہ ابن حزم رحمہ اللہ نے اس مذہب کو قدیم مذہب قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

''صابیوں کا مذہب روئے زمین میں قدیم ترین اور دنیا پر غالب تھا''

(الملل والنحل ص/ 64)

ابوجعفر الطبری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ:

'' قال أبو جعفر: و"الصابئون" جمع"صابئ"، وهو المستحدث سوى دينه ديناً، كالمرتد من أهل الإسلام عن دينه. وكل خارج من دين كان عليه إلى آخر غيره، تسميه العرب: "صابئا"''

(تفسیر الطبری تفسیر سورۃ البقرہ آیت 62)

''ابوجعفر نے کہا ہے کہ صابئون جمع ہے صابی کی اور یہ وہ لوگ ہے جو اپنے دین کے علاوہ دوسرا دین نکالتے ہیں۔ جیسے کہ اہل اسلام میں سے مرتد اپنے سے نکلتے ہیں، اور جو اپنے دین سے خارج ہوا عرب اس کو صابی کے نام سے مسمی کرتے تھے۔''

امام مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ:

'' الصابئون ليسوا بيهود ولا نصارى، ولا دين لهم ''

(تفسیر الطبری)

''صابی نہ یہودی ہے اور نہ نصاری اور نہ ان کا کوئی دین ہے۔''

مزید فرماتے ہیں کہ:

''صابی مجوسی اور یہودی کے درمیان ایک گروہ ہے۔ نہ ان کے ذبیحہ کھایا جائے اور نہ ان کی عورتوں سے نکاح کیا جائے۔''

(بحوالہ تفسیر الطبری تحت آیت المذکورہ)

اور یہی بات ابن ابی نجیح نے فرمائی ہے۔

حضرت قتادہ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا:

'' الصابئون قوم يعبدون الملائكة، يصلون إلى القبلة، ويقرءون الزبور''

(تفسیر الطبری)

''صابی ایسی قوم ہے جو ملائکہ کی عبادت کرتے ہیں اور قبلہ کی جانب نماز پڑھتے ہیں اور زبور کو پڑھتے ہیں۔''

حضرت ابن عالیہ فرماتے ہیں کہ:

'' الصابئون فرقة من أهل الكتاب يقرءون الزبور ''

(تفسیر الطبری)

''صابی اہل کتاب میں سے ایک گروہ ہے جو زبور پڑھتے ہیں۔''

ابوجعفر الرازی کہتے ہیں کہ:

'' وبلغني أيضا أن الصابئين قوم يعبدون الملائكة، ويقرءون الزبور، ويصلون إلى القبلة''

(تفسیر الطبری)

''مجھے بھی ایسا ہی خبر پہنچی ہے کہ صابی ایسی قوم ہے جو ملائکہ کی عبادت کرتے ہیں اور زبور پڑھتے ہیں اور قبلہ کی جانب نماز پڑھتے ہیں۔''

حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ:

'' وَأَظْهَرُ الْأَقْوَالِ، وَاللَّهُ أَعْلَمُ، قَوْلُ مُجَاهِدٍ وَمُتَابِعِيهِ، وَوَهْبِ بْنِ مُنَبِّهٍ: أَنَّهُمْ قَوْمٌ لَيْسُوا عَلَى دِينِ الْيَهُودِ وَلَا النَّصَارَى وَلَا الْمَجُوسِ وَلَا الْمُشْرِكِينَ، وَإِنَّمَا هُمْ قَوْمٌ بَاقُونَ عَلَى فِطْرَتِهِمْ وَلَا دِينٌ مُقَرَّرٌ لَهُمْ يَتْبَعُونَهُ وَيَقْتَفُونَهُ؛ وَلِهَذَا كَانَ الْمُشْرِكُونَ يَنْبِزُونَ مَنْ أَسْلَمَ بِالصَّابِئِيِّ، أَيْ: أَنَّهُ قَدْ خَرَجَ عَنْ سَائِرِ أَدْيَانِ أَهْلِ الْأَرْضِ إِذْ ذَاكَ''

(تفسیر ابن کثیر تفسیر سورۃ البقرۃ آیت 62)

''بہتر قول (اللہ بہتر جانتا ہے) امام مجاہد اور اس کے متبعین اور وہب بن منبہ کا ہیں، کہ صابی وہ قوم ہے جو نہ یہودی دین پر ہیں اور نہ نصاری ، اور نہ مجوسی ہے نہ مشرکین، اور یہ وہ قوم ہے جو اپنی فطرت پر قائم ہے ان کے لئے کوئی دین مقرر نہیں ہے کہ جس کا یہ لوگ اتباع اور پیروی کرتے۔ اور اسی لئے جو کفار یا مشرک اسلام قبول کرتا مشرکین اس کو صابی کہتے تھے یعنی کہ زمین پر جتنے ادیان ہیں سب سے نکل گیا۔''

اقوال مذکورہ سے ثابت ہوتا ہے کہ صابی کے متعلق مختلف اقوال پائے جاتے ہیں، اور ابن کثیر رحمہ اللہ نے امام مجاہد رحمہ اللہ کے قول کو ترجیح دیا ہے کہ صابی کا کوئی مذہب نہیں اور نہ کسی مذہب سے اس کا تعلق ہے، یہ اپنی فطرت پر ہے۔ اور اسی کو ہم بھی لیتے ہیں۔

لہذا ڈاکٹر ٹسڈل نے جو نظریہ اور عقائد ان کا پیش کیا ہے جو الملل والنحل میں موجود ہے، وہ بھی حتمی اور یقینی نہیں۔ لہذا جو بات یقینی نہیں اس کے ذریعہ آپ کسی کو الزام کیسے دے سکتے ہیں۔ جب کہ خود مصنف بھی اس کے متعلق کہتے ہے کہ:

''اگرچہ صابئین کے متعلق ہم کو بہت کم معلومات حاصل ہیں مگر جتنی حاصل ہیں وہ ہمارے مقصد کے لئے کافی ہیں۔''

مزید لکھتے ہیں کہ:

''چونکہ صابئین کے متعلق ہماری معلومات محدود ہیں اور یہ بھی یقینی طور پرنہیں کہا جاسکتا کہ وہ ''ماندئین'' تھے اس لئے یہ کہنا دشوار ہے کہ ان کا اثر اسلام پر اس سے زیادہ اور کن صورتوں سے ہوا۔''

موصوف کو خود ان کے بارے میں یقینی طور پر معلومات حاصل نہیں ہے، اور جو معلومات حاصل ہیں وہ بھی غیر یقینی ہے، تو اہل انصاف فیصلہ کرے کہ کیا اس طرح غیر یقینی باتوں سے اپنا دعوی کو ثابت کرنا اور خصم کو الزام دینا انصاف ہے۔

اور دوسری بات بالفرض اگر ثابت ہوجائے کہ صابی قوم کے عقائد و رسوم وہی ہے جو ''الملل والنحل'' میں ابن حزم نے بیان کیا ہے، تو بھی مصنف کے لئے مفید اور ہمارے لئے مضر نہیں۔ کیونکہ ہم کہہ چکے ہیں کہ مماثلت سے ماخذ اور من گھڑت یا جھوٹا ہونے کا دعویٰ کیسے ثابت کیا جاسکتا ہے۔

مماثلت و مشارکت سے ماخذ کا غیر معقول دعویٰ:

پہلے بھی عرض کیا جاچکا ہے کہ مماثلت یا مشارکت سے ماخذ کا دعویٰ غیر منطقی و غیر معقولی ہے، جس پر مصنف نے قلم اٹھائی ہے یقینا یہ ان کی جہالت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ مصنف کو کم از کم مفکرین و مبصرین اور تجزیہ نگاروں کے کالم اور مضامین دیکھنے چاہیے تھا اس موضوع پر۔ مگر ظاہر ہے متعصب کو ایسی چیزیں دیکھنے کی توفیق نہیں ہوتی۔

اللہ تعالیٰ نے نظام عالم بنایا اور پھر انسان کی تخلیق کی، پھر انسانوں کی رہنمائی کے لئے اپنے برگزیدہ اور چنیدہ پیغمبروں کا سلسلہ جاری کیا، جب بھی کوئی قوم گمراہ یا غلط راہ پر چلتے تو اللہ تعالیٰ

ان کی رہنمائی کے لئے پیغمبر بھیج دیتے۔

جب پیغمبر آتے تو اللہ تعالیٰ احکام وحدود، اوامر ونواہی نازل کرتے ان کے لئے کہ آپ نے یہ کام کرنا ہے اوراس سے بچنا ہے۔

ظاہر ہے اللہ تعالیٰ کے احکام وحدود میں فرق تو آئے گا موقع ومحل اور مناسبت کے اعتبار سے ۔قوم کو دیکھ کر اسی کے مطابق ہی احکام کے نزول فرماتے ہے۔ جیسے نماز ہے، اللہ تعالیٰ کی عبادت ہے اللہ نے اس کا حکم دیا ہے، تو ممکن ہے نماز کی صورت پہلے مذاہب میں کچھ اور ہو، اور کیفیت مختلف ہو، بعد میں آنے والے اقوام ومذاہب کے لئے کچھ اور ہے۔ یہ تو اللہ تعالی اپنی حکمت سے احکام کو منسوخ کرتا ہے بندوں کے لئے تا کہ بندوں پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہ ہو۔

اس کی آسان مثالیں ملاحظہ ہو:

(1) شریعت موسیٰ میں بیوی کو طلاق دینی کی عام اجازت تھی۔ (کتاب مقدس استثنا ۲۴: ا۔ ۳ صفحہ/ 277 ناشر جیولنکس ریسورس کنسلٹنٹس)

لیکن جناب مسیح علیہ السلام نے فقط حرام کاری کرنے والی بیوی کو طلاق دینے کی اجازت دی اور باقی تمام صورتیں منسوخ کردیں۔ (متیٰ ۱۹: ۷۔۹، صفحہ 1341)

(2) تورات میں جھوٹی قسم کھانے سے منع کیا گیا اور سچی قسم کی اجازت تھی۔ (احبار ۱۹: ۱۲، ص/ 173، گنتی ۳۰: ۲ ص/ 233)

جبکہ جناب مسیح علیہ السلام نے ہر طرح کی قسم سے روک دیا۔ (متیٰ ۵: ۳۳۔ ۳۴ صفحہ 1315)

(3) موسیٰ علیہ السلام نے کئی طرح کے جانور حرام کیے تھے۔ (استثنا ۱۴: ۷۔ ۲۰) جبکہ پولوس نے کسی چیز کو حرام نہیں رہنے دیا۔ (رومیوں ۱۴: ۱۴، کُلسیوں ۲: ۱۴۔ ۱۶) شاید یہی وجہ

ہے کہ مسیحی لوگ اب حرام وحلال میں کوئی تمیز نہیں کرتے۔

(4) شریعتِ موسوی میں قصاص کا حکم تھا، جبکہ جناب مسیح نے فرمایا: جوکوئی تیسرے داہنے گال پر طمانچہ مارے، دوسرا بھی اس کی طرف پھیر دو۔(متیٰ ۵:۳۸۔۳۹)

(5) پولوس جو موجودہ مسیحیت کا اصل بانی ہے، اس نے تو تمام کی تمام شریعت منسوخ کر دی۔لکھا ہے: مسیح جو ہمارے لیے لعنتی بنا، اس نے ہمیں مول لے کر شریعت کی لعنت سے چھڑایا۔(گلتیوں ۳: ۱۳) مزید دیکھیں: (گلتیوں ۲: ۱۶، ۲: ۲۱، ایضاً ۵: ۴، رومیوں ۴: ۱۴۔۱۵، عبرانیوں: ۷: ۱۲)

(6) ختنہ کا حکم تھا۔(پیدایش: ۱۷: ۱۴) پولوس نے اسے بھی ختم کر دیا۔(گلتیوں ۵: ۲، ۶: ۱۵، کرنتھیوں ۷: ۱۸)

یہ چند مثالیں ہیں، اگر چہ ہمیں تورات اور انجیل پر اعتبار نہیں ہیں اوران میں تبدیلی کی گئی ہے، خود عیسائیوں کے نزدیک بھی ان میں بہت تبدیلیاں ہوئی ہیں، حتی کہ اب یہ نہیں معلوم کہ یہ اصل انجیل وتورات ہے یا نہیں۔مگر قطع نظر اس قضیہ سے بالفرض اگر تسلیم کرلیا جائے کہ ان میں تبدیلی نہیں ہوئی ہے یہ اصل پر برقرار ہے۔تو دریافت طلب یہ امر ہے کہ خُداوند عالم کیوں تورات میں کچھ اور کہاں ہے اور انجیل میں کچھ اور؟

صاف مطلب یہی ہے تورات میں اللہ نے اپنی حکمت عملی کے ساتھ اس قوم کی حالت دیکھ کر اسی کے مطابق احکام کا نزول فرمایا اور انجیل میں اسی قوم کے مناسبت سے احکام کا نزول فرمایا۔

اسی طرح پھر شریعت محمدی میں بھی اسی قوم کے مطابق احکام کا نزول فرمایا۔ اب اگر شریعت محمدی میں کچھ عقائد یا معاملات یا عبادات کی مماثلت ماقبل مذاہب میں پایا جاتا ہے تو اس میں کچھ حرج نہیں ۔ کیونکہ شارع ایک ہی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ ہے، ظاہر ہے مماثلت و

اشتراک تو ہوتا ہے۔

اگر مصنف کا یہ قضیہ تسلیم کر لیا جائے تو میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ تمام مذاہب میں خدا کا تصور پایا جاتا ہے، دریافت طلب یہ امر ہے کہ خدا کا یہ تصور کہاں سے لیا گیا ہے؟ اگر ابتداء مذہب سے تو کیا بعد میں آنے والے جتنے مذاہب بشمول عیسائی و یہودی یہ سب اس مذہب کا ماخذ قرار پائیں گے اور بقول مصنف بعد والے مذاہب کو اس لئے جھٹلایا جائے یا غلط قرار دیا جائے کہ یہ تو اس تصور کو فلاں مذہب سے لیا ہے۔ جیسے کہ تورات میں ہیں کہ:

''سن اے اسرائیل! رب ہمارا خدا ایک ہی رب ہے''

(کتاب مقدس استثنا 4:6 صفحہ/253)

اور یہی بات اسی الفاظ کے ساتھ انجیل میں موجود ہے۔ (مرقس 19:12 صفحہ/1390)

عیسائی مشنری ہمیں بتائیں اگر کوئی یہ کہے کہ عیسائیت نے خدا کا تصور یہودیت سے لی ہے اور جو باتیں تورات کے تھے وہی انجیل میں نقل ہوا ہے اس کا مطلب انجیل جھوٹی ہے اور حضرت عیسی علیہ السلام (معاذ اللہ) نبی نہیں۔ کیا کوئی عیسائی اس قضیہ کو تسلیم کرے گا؟

یہ تو ایک مثال پیش کیا گیا ورنہ اس جیسے بہت سارے مثال پیش کیا جا سکتا ہے جس میں یہودی اور عیسائی عبادات و معاملات و رسوم میں مماثلت اور مشارکت پائی جاتی ہے، تو کیا ہم مصنف کی زبان میں عیسائی مع انجیل کو یہودیت کا ماخذ قرار دے؟ اور کہے انجیل کو حضرت عیسی علیہ السلام نے (معاذ اللہ) گھڑی ہے اپنی طرف سے اور اکثر باتیں ماقبل مذاہب سے لیا ہے۔

یہودی عقائد و رسوم کا اثر:

صابی کے بعد مصنف یہود کی جانب رخ کرتا ہے، جہاں وہ یہ ثابت کرنے پر مصر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود سے بہت کچھ مستعار لیا ہے۔ چنانچہ موصوف رقمطراز ہے:

''اب ہم یہود کی طرف رجوع کرتے ہیں جن سے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے مذہب میں اتنا کچھ

مستعار لیا کہ اگر ہم اسلام کو یہودیت ہی کی بگڑی ہوئی صورت کہیں تو غالباً غلط نہ ہوگا۔‘‘

یہ دعوی محض دعویٰ اور مصنف کے اپنے خیالات و وہمیات ہے، اور اس کا جواب ماقبل دیا گیا ہے کہ آسمانی کتب اور شرائع میں عقائد و رسوم و معاملات کا مماثلت و مشارکت کوئی امر بعید نہیں۔

کیا رسول اللہ نے بیت المقدس کو یہودیوں کی خاطر قبلہ بنایا؟

مصنف اپنے خیالات فاسدہ کے ذریعے یہ ثابت کرنے کی کوشش کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیت المقدس کو یہودیوں کی خاطر اپنے مذہب کا قبلہ قرار دیا پھر بعد میں عربوں کی تالیف قلوب کے لئے کعبہ کو قبلہ قرار دیا۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ:

’’قدیم عرب مورخین لکھتے ہیں کہ جب محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی نبوت کا اعلان کیا تو اس وقت یہود ایک مسیح کی آمد کے منتظر تھے اور وہ عموماً اپنے دشمنوں کو ڈرایا کرتے تھے کہ ان کا مسیح بہت جلد آکر ان سے انتقام لے گا۔ اس خیال کا یہ اثر ہوا کہ عربوں میں سے بعض لوگوں خصوصاً مدینہ کے بنوخزرج نے (بقول ابن اسحٰق) محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو وہ نبی تسلیم کر لیا جس کے وہ منتظر تھے۔ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ اعلان کیا کہ وہ نیا مذہب لے کر نہیں آئے ہیں بلکہ لوگوں کو ’’دین ابراہیم‘‘ کی طرف بلانے کے لئے آئے ہیں۔ پس یہ قدرتی امر تھا کہ وہ یہودیوں کو اپنا طرف دار بنانے کی سعی کرتے اور یہی کوشش انہوں نے مدینہ میں کی اور کچھ عرصہ تک تو ایسا معلوم ہوتا تھا گویا وہ اپنی سعی میں بہت کچھ کامیاب ہو جائیں گے۔ ایک تدبیر جو انہوں نے اس مقصد کے لئے اس وقت کی یہ تھی کہ بیت المقدس یعنی یروشلیم کو اپنے مذہب کا قبلہ بنا لیا، مگر کچھ عرصہ بعد جب محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہودیوں سے کھٹک ہوگئی تو انہوں نے عربوں کی تالیف قلوب زیادہ مفید سمجھی اور کعبہ کو اپنا قبلہ قرار دیا۔‘‘

یہ بات تو درست ہے یہود ایک نبی کے منتظر تھے، مگر یہ بات کہی سے ثابت نہیں کہ نبی بنی اسرائیل میں منحصر ہیں، یہودیوں نے صرف بغض و عناد اور تعصب کی بناء پر رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم کی نبوت کا انکار کیا کہ یہ نبی بنی اسرائیل سے کیوں نہیں؟ ورنہ یہود جانتے تھے کہ محمد واقعی رسول اللہ ہے، ان کا انکار صرف بغض پر مبنی تھی۔

اور ابتدا میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر عمل میں اہلِ کتاب کی مخالفت نہیں کرتے تھے، بلکہ ابتداء اسلام میں بہت سے اعمال میں تالیفِ قلوب کے لیے نرمی کی گئی، مگر جب اہل کتاب کی طرف سے بجائے حق کو قبول کرنے کے بغض وعناد کی وجہ سے سازش کرنے لگے تو بعد میں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی مخالفت کی۔

پھر آگے یوم عاشورہ اور عید الاضحیٰ کے عبادات کو بھی یہودیوں کا ماخذ قرار دیا ہے، وہ بھی مصنف کے اپنے خیالات ہے، جس کی تردید خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اعمال اور افعال واقوال میں موجود ہے۔

کیونکہ رسول اللہ نے یوم عاشورہ کا روزہ حضرت موسی علیہ السلام کے اتباع وموافقت میں رکھا نہ کہ یہود کے۔ کیونکہ عاشورہ کا روزہ حضرت موسیٰ علیہ السلام رکھتے تھے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے روزہ کی وجہ سے بھی اتباع موسی ہو قرار دیا جیسا کہ مسلم شریف میں حدیث موجود ہے:

"حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ تشریف لائے، آپ نے یہود کو بھی یوم عاشورہ کا روزہ رکھتے ہوئے پایا، ان سے اس کے بارے میں پوچھا گیا۔ انھوں نے جواب دیا: یہی دن ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کو فرعون پر غلبہ عطا فرمایا تھا، ہم اس (دن) کی تعظیم کرتے ہوئے اس کا روزہ رکھتے ہیں۔ اس پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "ہمیں موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ تمہاری نسبت زیادہ لگاؤ ہے۔" اس کے بعد آپ نے اس (دن) کا روزہ رکھنے کا حکم دیا۔"

(صحیح مسلم باب عاشورہ کے دن کا روز)

اور عید الاضحیٰ بھی ایسا ہی حضرت ابرہیم علیہ السلام کی سنت پر عمل کا دن ہے۔ اس لئے حضور

صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے منانے کا حکم دیا۔

قرآن میں واقع واقعات وقصص کا ماخذ یہودیوں سے:

آگے مصنف نے قرآن میں موجود بہت سارے قصص وواقعات پر یہ دعوی قائم کیا ہے کہ وہ سب یہودیوں سے ماخذ ہے اوران سے لیا گیا ہیں۔ چنانچہ موصوف اپنے کمزور دعوی بمثل تارعنکبوت کو یوں قائم کرتا ہے:

''اب ہم آگے بڑھ کر یہ بات دکھاتے ہیں کہ قرآن کا بہت بڑا حصہ روایات براہ راست یہود سے ماخوذ ہے۔''

اس تارعنکبوت سے زیادہ کمزور دعوی کا ابطال ماقبل میں ہو چکا ہیں، مزید یہ کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی نبی ہے اوران کو بھی آسمانی کتاب دی گئی ہیں، لہذا اگر واقعات کا مماثلت ماقبل آسمانی کتب سے آجائے تو اسے ماخذ قرار نہیں دیا جاسکتا۔ کیونکہ وہ کتابیں بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی ہے اور یہ کتاب بھی۔ ہاں یہ الگ بات ہے کہ ان کتابوں کی صحت مشکوک ہے مگر قرآن کی صحت مشکوک نہیں اور نہ تحریف ہوئی ہے۔ تو ظاہر ہے صحیح واقعات وہی ہے جو قرآن نے بیان کردیا ہے۔

واقعات کے ماخذ پر معترضین سے دو سوال:

یہاں ہم مصنف کے حواریوں سے یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ جتنے واقعات قرآن سے پیش کرکے ماخذ کا دعوی قائم کیا ہیں، کیا رسول اللہ نے براہ راست بلا واسطہ یہودی کتابوں سے لی ہے یا بالواسطہ۔ اگر بلا واسطہ براہ راست لی ہے تو کیا اس زمانے میں یہودیوں کی کتب کا عربی میں ترجمہ موجود تھا یا نہیں؟ اگر موجود تھا تو اس کا کیا ثبوت ہے؟ اگر ثابت بھی ہوجائے کہ ترجمہ ہوا تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو امی تھے، کسی سے پڑھے لکھے نہیں تھے پھر کیسے ان کتب کو

سمجھ گئے ؟ (خیال رہے امی کے بارے میں مصنف و دیگر ملحدین نے یہ شوشہ چھوڑا ہے کہ یہ بات ہرگز قابل قبول نہیں کہ محمد امی تھے، بلکہ وہ پڑھنا لکھنا سب کچھ جانتا تھا۔ اس کا جواب آگے اسی باب میں آئے گا جہاں مصنف نے امی پر کلام کیا ہے۔) اور پھر اس دور کی یہود نے یہ اعتراض کیوں نہیں کیا کہ یہ واقعہ تو آپ نے ہماری کتاب سے لی ہے کیونکہ یہ ہماری کتاب میں موجود ہیں؟ اور اگر ترجمہ موجود نہیں تھا تو محمد نے یہ واقعات کہاسے اور کیسے لی؟ اور اگر بالواسطہ لی ہے تو وہ واسطہ کون ہے؟ کس سے لیا ہے اس کے شواہد اور دلائل کیا ہے؟۔ (خیال رہے ورقہ بن نوفل یا بحیرا راہب کا ثبوت پیش کرنا بالکل قابل قبول نہیں، کیونکہ ورقہ اور بحیرا سے ایک ہی مرتبہ رسول اللہ ملا ہے، ایک ہی مرتبہ ملنے سے کیا یہ سب کچھ ہوسکتا ہے؟ اگر ہوسکتا ہے تو یہ تو رسول اللہ کا معجزہ ہوگا کہ ایک ہی مرتبہ وہ سب کچھ سن بھی لیا اور یاد بھی کیا۔ مگر ایسا نہیں ہے، اور نہ یہ ثابت ہے۔ ان شاء اللہ اس پر کلام اپنے موقع پر ہوگا۔۔ از محمد عدنان)

یادرہے ہمارا سوال کا تعلق اس سے نہیں ہے جو محمد کے دور میں کفار نے کہا تھا کہ یہ قرآن اللہ کا کلام نہیں۔ اپنی طرف سے گھڑی ہے۔ کوئی اس کو سکھاتا ہے۔ یا یہ پہلے لوگوں کے قصے ہیں ۔ اس جیسے آیات قرآن میں موجود ہیں۔ کفار کی جانب سے ایسے اعتراضات کیا گیا تھا۔ ہمارا سوال یہ ہے اگر یہ واقعات رسول اللہ نے یہودی کتب سے لیا ہے تو اس وقت کے یہودی کیوں اس پر شور نہیں کیا کہ یہ تو ہماری کتب سے واقعات پڑھ رہا ہے۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہودی کتاب سے واقعات لی تو اصل واقعہ کو بقول معترضین اس وجہ سے نقل نہیں کیا کہ لوگ پہچان نہ لے، قطع نظر اس مفروضے سے، تو پھر کچھ باتیں جو وہاں الگ ہے قرآن میں الگ، اصل واقعہ کو چھوڑ کر کچھ باتیں جو رسول اللہ نے ملائی ہے وہ کہاسے لی ہے؟ کیونکہ یہودی کتاب میں تو بعینہ وہ واقعہ موجود نہیں ہے جو قرآن میں ہے، ظاہر ہے کچھ اضافہ اور کمی کے ساتھ ہے۔ تو بقول معترضین کچھ اضافہ ہو یا کمی ہو۔ وہ اضافہ

اور کمی والی باتیں محمد نے کہاں سے لی؟ اپنی طرف سے یا کسی کتاب سے؟ ظاہر ہے کہی اور تو وہ واقعات نہیں تھے جو وہاں سے لے۔ اپنی طرف سے کیا ہوگا۔ اگر اپنی طرف سے کیا ہے تو عقلا یہ بات درست نہیں۔ کیونکہ متواتر واقعات میں تبدیلی کرنے والے کو الزام ضرور دیا جاتا ہے کہ آپ نے یہ تبدیلی کی ہے اصل میں ایسا نہیں ہے، جیسے آج کے دور میں کوئی مشہور واقعہ کو اٹھا کر اس میں تبدیلی کرے تو ظاہر ہے لوگ اس کو کہیں گے اصل واقعہ ایسا ہے آپ نے یہ اضافہ اور کمی اپنی طرف سے کیا ہے۔ تو اس دور میں کیا کسی نے رسول اللہ کو یہ الزام دیا کہ آپ نے یہ جو واقعہ پیش کیا ہے یہ در اصل یہودی کتاب میں موجود ہے اور اصل میں ایسا ہے، آپ نے کمی بیشی کی ہے۔ اگر ایسا اعتراض اس دور میں کسی نے کیا ہے تو پیش کیا جائے۔

قصہ ہابیل اور قابیل:

مصنف نے ہابیل اور قابیل کے واقعہ کو بھی یہودی کتب کا ماخذ قرار دیا ہے۔ پہلے ہم یہاں اس کا ذکر قرآن سے پیش کریں گے اس کے بعد جو ماخذ کا شور مچایا ہے اس کی حقیقت بھی پیش کریں گے۔

عربی عبارت کو چھوڑ کر صرف ترجمہ نقل کر رہے ہیں :

’[اور (اے پیغمبر !) ان کے سامنے آدم کے دو بیٹوں کا واقعہ ٹھیک ٹھیک پڑھ کر سناؤ۔ جب دونوں نے ایک ایک قربانی پیش کی تھی، اور ان میں سے ایک کی قربانی قبول ہوگئی، اور دوسرے کی قبول نہ ہوئی۔ اس (دوسرے نے پہلے سے) کہا کہ میں تجھے قتل کر ڈالوں گا۔ پہلے نے کہا کہ اللہ تو ان لوگوں سے (قربانی) قبول کرتا ہے جو متقی ہوں۔ اگر تم نے مجھے قتل کرنے کو اپنا ہاتھ بڑھایا تب بھی میں تمہیں قتل کرنے کو اپنا ہاتھ نہیں بڑھاؤں گا۔ میں تو اللہ رب۔ العالمین سے ڈرتا ہوں۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ انجام کار تم اپنے اور میرے دونوں کے گناہ میں پکڑے جاؤ، اور دوزخیوں میں شامل

ہو۔اور یہی ظالموں کی سزا ہے۔آخر کار اس کے نفس نے اس کو اپنے بھائی کے قتل پر آمادہ کرلیا، چنانچہ اس نے اپنے بھائی کو قتل کر ڈالا، اور نامرادوں میں شامل ہو گیا۔ پھر اللہ نے ایک کوا بھیجا جو زمین کھودنے لگا تا کہ اسے دکھائے کہ وہ اپنے بھائی کی لاش کیسے چھپائے۔ (یہ دیکھ کر) وہ بولا ہائے افسوس! کیا میں اس کوے جیسا بھی نہ ہو سکا کہ اپنے بھائی کی لاش چھپا دیتا۔اس طرح بعد میں وہ بڑا شرمندہ ہوا۔''

(سورۃ المائدہ آیت 27-31 از ترجمہ مفتی تقی عثمانی صاحب)

یہ ہابیل اور قابیل کا واقعہ ہے جو قرآن میں مذکور ہے۔ اس کا ماخذ مصنف نے یہودی کتاب سے کیا پیش ہے ملاحظہ فرمائیں:

''قابیل و ہابیل کے درمیان ایک مکالمہ یا بحث (Targum of Jonathan) اور (Targum of Jerusalem) یہودی روایات میں بھی اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ قابیل نے کہا: ''گناہ کے لئے سزا نہیں، نہ نیکوکاری کے لئے کوئی انعام ہے''۔اس کے جواب میں ہابیل نے کہا ''خدا نیکی کا انعام اور بدی کی سزا دیتا ہے''۔اس بات پر خفا ہو کر قابیل نے ایک پتھر لے کر اپنے بھائی پر دے مارا اور اسے قتل کر ڈالا''۔اس بیان اور اُس بیان میں جو قرآن میں پایا جاتا ہے چنداں مطابقت نہیں ہے۔''

قارئین کرام! ملاحظہ فرمائیں قرآن نے جو واقعہ بیان کیا اور مصنف نے جو واقعہ پیش کیا ہے دونوں میں کتنا فرق ہے۔مگر مصنف نے تورات کی عبادت چھوڑ کر نہ جانے کیوں دوسرے عہد قدیم کی تفاسیر کو پیش کیا ہے جن کی صحت بھی مشکوک ہے۔تورات میں جو واقعہ ذکر ہے وہ بھی ملاحظہ کرے:

''(قابیل اور ہابیل) آدم حوا سے ہم بستر ہوا تو اُن کا پہلا بیٹا قابیل پیدا ہوا۔حوا نے کہا، ''رب کی مدد سے میں نے ایک مرد حاصل کیا ہے۔'' بعد میں قابیل کا بھائی ہابیل پیدا ہوا۔ ہابیل بھیڑ بکریوں کا چرواہا بن گیا جبکہ قابیل کھیتی باڑی کرنے لگا۔ کچھ دیر کے بعد قابیل

نے رب کو اپنی فصلوں میں سے کچھ پیش کیا۔ ہابیل نے بھی نذرانہ پیش کیا، لیکن اُس نے اپنی بھیڑ بکریوں کے کچھ پہلوٹھے اُن کی چربی سمیت چڑھائے۔ ہابیل کا نذرانہ رب کو پسند آیا مگر قابیل کا نذرانہ منظور نہ ہوا۔ یہ دیکھ کر قابیل بڑے غصے میں آ گیا، اور اُس کا منہ بگڑ گیا۔ رب نے پوچھا، تو غصے میں کیوں آ گیا ہے؟ تیرا منہ کیوں لٹکا ہوا ہے؟ کیا اگر تو اچھی نیت رکھتا ہے تو اپنی نظر اُٹھا کر میری طرف نہیں دیکھ سکے گا؟ لیکن اگر اچھی نیت نہیں رکھتا تو خبردار! گناہ دروازے پر دبکا بیٹھا ہے اور تجھے چاہتا ہے۔ لیکن تیرا فرض ہے کہ اُس پر غالب آئے۔" ایک دن قابیل نے اپنے بھائی سے کہا، " آؤ، ہم باہر کھلے میدان میں چلیں۔" اور جب وہ کھلے میدان میں تھے تو قابیل نے اپنے بھائی ہابیل پر حملہ کر کے اُسے مار ڈالا۔ تب رب نے قابیل سے پوچھا، " تیرا بھائی ہابیل کہاں ہے؟ قابیل نے جواب دیا، " مجھے کیا پتا! کیا اپنے بھائی کی دیکھ بھال کرنا میری ذمہ داری ہے؟" رب نے کہا، تو نے کیا کیا ہے؟ تیرے بھائی کا خون زمین میں سے پکار کر مجھ سے فریاد کر رہا ہے۔ اس لئے تجھ پر لعنت ہے اور زمین نے تجھے رد کیا ہے، کیونکہ زمین کو منہ کھول کر تیرے ہاتھ سے قتل کئے ہوئے بھائی کا خون پینا پڑا۔ اب سے جب تو کھیتی باڑی کرے گا تو زمین اپنی پیداوار دینے سے انکار کرے گی۔ تو مفرور ہو کر مارا مارا پھرے گا۔" قابیل نے کہا،" میری سزا نہایت سخت ہے۔ میں اسے برداشت نہیں کر پاؤں گا۔ آج تو مجھے زمین کی سطح سے بھگا رہا ہے اور مجھے تیرے حضور سے بھی چھپ جاتا ہے۔ میں مفرور کی حیثیت سے مارا مارا پھرتا رہوں گا، اس لئے جس کو بھی پتا چلے گا کہ میں کہاں ہوں وہ مجھے قتل کر ڈالے گا۔" لیکن رب نے اُس سے کہا،" ہرگز نہیں۔ جو قابیل کو قتل کرے اُس سے سات گنا بدلہ لیا جائے گا۔" پھر رب نے اُس پر ایک نشان لگایا تا کہ جو بھی قابیل کو دیکھے وہ اُسے قتل نہ کر دے۔ اس کے بعد قابیل رب کے حضور سے چلا گیا اور عدن کے مشرق کی طرف نود کے علاقے میں جا بسا۔''

(کتاب مقدس، پیدائش باب 4 / 16:2 صفحہ 15)

اہل انصاف غور کر کے بتائے دونوں کتابوں کے واقعات میں کتنا فرق ہے۔فرق نہ بھی ہو تب بھی ہمیں مضر نہیں کیونکہ ہم کہہ چکے ہیں دونوں آسمانی کتاب ہے، ظاہر ہے واقعات ایک جیسے ہوں گے، اب اگر تورات میں واقعہ الگ ہے اور قرآن میں الگ تو صاف ظاہر ہے تورات میں تبدیلی کی گئی ہے اور قرآن میں نہیں۔اور قرآن کا بیان کردہ واقعہ صحیح قرار دیا جائے گا۔

مگر مصنف اس کو یہودی کتب کا ماخذ قرار دے رہا ہے۔اس پر ہمارا سوال برقرار ہے کہ اگر حقیقت میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے تورات یا دوسری یہودی کتاب سے یہ واقعہ لیا ہے، تو من و عن وہ واقعہ تو یہودی کتب میں موجود نہیں ہے، پھر یہ کمی اضافی والی عبارات رسول اللہ نے کہا سے لی؟ کس سے سنا؟ کونسی کتب سے دیکھا وہ کتب کہاں ہے آجکل؟ اگر محمد نے اپنی طرف سے گھڑا ہے تو وہ تو امی تھے کسی سے پڑھے لکھے نہیں تھے کیسے وہ واقعات اپنی طرف سے فصیح انداز میں گھڑ لیتا ہے؟

کلام اللہ اور کلام رسول اللہ میں واضح فرق:

مصنف کا دعویٰ ہے کہ رسول اللہ نے تورات سے کچھ باتیں قرآن میں داخل کیا ہے۔اس کا جواب خود حضور کے کلام میں موجود ہے ملاحظہ فرمائیں:

”عن عمر بن الخطاب وانس بن مالک عن رسول الله صلی الله علیه وسلم قال فی التوراۃ مکتوب من بلغت ابنته اثنتی عشرۃ سنة ولم یزوجها فاصابت اثما فاثم ذالک علیه“

(شعب الایمان للبیہقی بحوالہ مشکوٰۃ ص/ 271 باب الولی فی النکاح واستیذان المرأۃ)

”حضرت عمر اور حضرت انس رضی اللہ عنہما سے روایت ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تورات میں لکھا ہے کہ جس کی بیٹی بارہ (12) سال کو پہنچ جائے اور وہ اس کی شادی نہ کرائے پس اگر وہ لڑکی گناہ کی طرف گئی، تو یہ گناہ اس کے والد پر ہوگا۔“

قارئین کرام! غور کرے یہ کلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام ہے، جو تورات کی بات فرما رہے ہیں، میں پوچھنا چاہتا ہوں، اگر رسول اللہ دوسرے واقعات جو قرآن میں موجود ہے، تورات سے لیا ہے تو پھر دونوں کلام میں زمین اور آسمان کا فرق کیوں ہے؟ حالانکہ بقول تمہارے دونوں ایک ہی بشر کے کلام ہے، پھر قرآن میں جو باتیں تورات سے لیا ہے وہ کلام اور اس کلام میں فرق کیوں ہے؟

مصنف کو اور کتب نہیں ملی جس سے اپنے مدعیٰ کو ثابت کر سکے، مگر ایک مجہول التاریخ کتاب سے چھوٹا سا اقتباس پیش کیا ہے جو اس واقعہ سے ملتا جلتا ہے، مگر کتاب خود اسلام کے بعد لکھی گئی ہے جس کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے اس واقعہ کو خود اسلام سے لیا ہے اور قرآن سے لیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ:

''لیکن قرآن کے بقیہ بیان کا ماخذ وہی یہودی روایت ہے جو Pirke De-Rabbi Eliezer کے باب نمبر ۲۱ میں درج ہے۔ اس کا ترجمہ یہ ہے: ''آدم اور اس کی مددگار دونوں بیٹھے ہوئے اس (ہابیل) پر نوحہ وزاری کر رہے تھے اور نہیں جانتے تھے کہ وہ ہابیل کا کیا کریں کیونکہ وہ تکفین و تدفین سے واقف نہ تھے۔ ایک کوّا جس کا ایک ساتھی مر گیا تھا آیا۔ اس نے اس کو لیا، زمین کھودی اور اسے ان کی (آدم و حوا) کی آنکھوں کے سامنے دفن کر دیا۔ آدم نے کہا ''جیسا اس کوّے نے کیا ہے، ویسا ہی میں کروں گا۔ چنانچہ انہوں نے فوراً ہابیل کی لاش لی، زمین کھودی اور اسے دفن کر دیا۔''

قارئین کرام! جو واقعہ ''پِرکے دے ربّی الیزر'' (Pirke De-Rabbi Eliezer) کتاب سے پیش کیا ہے وہ خود اسلام کے بعد مرتب ہوا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ انہوں نے اسلام یا قرآن سے لیا ہے۔ اور یہ کس نے لکھا ہے، مرتب کون ہے اس کا کچھ پتہ نہیں۔

اب ذرا مصنف کا مضحکہ خیز تبصرہ سن لیجئے:

''جب ہم اس بیان کا قرآن مجید کے بیان سے مقابلہ کرتے ہیں تو صرف اس قدر فرق نکلتا

ہے کہ یہودی روایت میں کوے نے آدم کو اور قرآن کی روایت میں قابیل کو دفن کرنا سکھایا۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ قرآن میں جو کچھ درج ہے وہ کسی یہودی کتاب کا لفظی ترجمہ نہیں ہے بلکہ محمد ﷺ نے اپنے کسی یہودی دوست سے جس طرح سنا تھا اسی طرح بیان کر دیا۔ لہٰذا اگر یہ غلطی ہے تو رسول عربی کی نہیں ہے بلکہ ان یہودیوں کی ہے جنہوں نے یہ روایت بیان کی۔''

واہ جناب کیا بات ہے! مصنف کے نزدیک قرآن میں یہودی کتب کا لفظی ترجمہ نہیں بلکہ محمد نے اپنے کسی یہودی دوست سے جیسے سنا اسی طرح بیان کر دیا اور یہ غلطی محمد کی نہیں بلکہ ان یہودیوں کی ہیں جنہوں نے یہ روایت بیان کی۔ مصنف یہاں ہواس باختہ ہو چکا تھا ان کو معلوم نہیں میں کیا لکھ رہا ہوں۔ قطع نظر مصنف کے اس جھوٹ سے کہ محمد کا ایک ساتھی یہودی نے اسے بتایا، اس بات پر آتے ہیں کہ یہودی نے محمد کو غلط روایت بیان کی۔ تو محمد نے وہی بیان کر دیا، اب یہ معمہ مصنف کے حواری ہمیں حل کر کے بتائے کہ کوے نے دفن کا طریقہ کس کو سکھایا؟ حضرت آدم کو یا قابیل کو؟ اگر حضرت آدم کو سکھایا تو جو قابیل والی روایت ہے بقول مصنف وہ یہود کی غلطی ہے جو رسول اللہ کو جیسے بتایا رسول اللہ نے ویسے بیان کیا۔ اس کا مطلب محمد نے یہودی کتاب سے نہیں لی بلکہ سنا ہے۔ اگر سنا ہے تو اس کا کیا ثبوت ہے؟ اور وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نبوت کے دعوی کے بعد وہ یہودی کیوں یہ اعتراض نہیں کیا کہ یہ واقعہ تو ہم سے سنا ہے یا ہماری کتب سے لیا ہے؟

واقعہ کے ربط پر اعتراض:

مصنف واقعہ کے سیاق وسباق اور ربط پر اعتراض کرتے ہوئے رقمطراز ہے کہ:

''سورۂ مائدہ کی ۳۵ ویں آیت میں جو کچھ لکھا ہے اس کا سابقہ آیتوں کے مضمون سے بظاہر کوئی تعلق نظر نہیں آتا۔ اس لئے صاف ظاہر ہے کہ کوئی درمیانی کڑی گم ہے۔ اگر اس باب

میں ہم (Mishnah Sanhedrin) کے باب ۴ فقرہ ۵ کو دیکھیں تو مذکورہ بالا آیت کا تعلق قتل ہابیل کے واقعہ سے بالکل واضح ہو جائے گا۔ یہ یہودی مفسر ''ناموس موسیٰ'' کے ان الفاظ کی تفسیر کرتا ہوا جو خدا نے قابیل سے فرمائے تھے یعنی ''یہ تو نے کیا کیا؟ تیرے بھائی کے خون کی آواز مجھے زمین سے پکارتی ہے'' (پیدائش ۱۰:۴) (اس عبارت میں لفظ خون عبرانی زبان میں جمع آیا ہے)۔ یوں لکھتا ہے کہ: ''تیرے بھائی کا خون'' نہیں بلکہ ''تیرے بھائی کے خون'' جس سے نہ صرف شخص مقتول بلکہ اس کی اولاد کا خون بھی مراد ہے۔ اسی وجہ سے آدم کو تنہا پیدا کیا گیا تھا تا کہ وہ تجھے سکھائے کہ ہر وہ شخص جو بنی اسرائیل میں کسی ایک نفس کو بھی قتل کرتا ہے، وہ کتاب مقدس کے نزدیک تمام دنیا کو قتل کرتا ہے اور جو شخص بنی اسرائیل میں سے ایک نفس کو بھی زندہ رکھتا ہے وہ تمام دنیا کو زندہ رکھتا ہے''۔ ہم کو اس تفسیر کی صحت یا غلطی سے کوئی تعلق نہیں، مگر دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ سورۂ مائدہ کی ۳۵ ویں آیت اس اقتباس کا تقریباً لفظی ترجمہ ہے۔ قرآن میں مشناہ کے اول حصہ کو حذف کر دیا ہے۔ شاید اس وجہ سے کہ محمد ﷺ یا اس کے بیان کرنے والے نے اسے پوری طرح نہیں سمجھا تھا۔ لیکن اگر یہ حصہ جوڑ دیا جائے تو ۳۵ ویں آیت کا آیات ماسبق سے تعلق پورا ظاہر جاتا ہے۔''

مصنف کو اگر ماقبل آیات سے ربط اور تعلق نظر نہیں آتا تو ان کا اپنا قصور ہے ؎

گر نہ بیند بروز شپرہ را
چہ گناہ آفتاب را باشد

اگر چمگادڑ کو دن میں کچھ نظر نہیں آتا تو اس میں سورج کا کیا قصور۔

آیات کا ماقبل سے ربط موجود ہے۔ علامہ فخر الدین الرازی رحمہ اللہ نے اس آیت کے ربط یوں بیان کیا ہے کہ:

'' قَوْلُه تَعَالٰى (واتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ ابْنَيْ آدَمَ بِالحَقِّ) وفي الآيَةِ

مَسائِلُ: المَسْأَلَةُ الأولى: في تَعَلُّقِ هٰذِهِ الآيَةِ بِما قَبْلَها وُجوهٌ: الأَوَّلُ: أَنَّهُ تَعالى قالَ فِيما تَقَدَّمَ: ﴿يا أَيُّها الَّذِينَ آمَنُوا اذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّهِ عَلَيْكم إذْ هَمَّ قَوْمٌ أَنْ يَبْسُطُوا إلَيْكم أَيْدِيَهم فَكَفَّ أَيْدِيَهم عَنْكُمْ﴾ فَذَكَرَ تَعالى أَنَّ الأَعْداءَ يُرِيدُونَ إيقاعَ البَلاءِ والمِحْنَةِ بِهِمْ لٰكِنَّهُ تَعالى يَحْفَظُهم بِفَضْلِهِ ويَمْنَعُ أَعْداءَهم مِن إيصالِ الشَّرِّ إلَيْهِمْ. ثُمَّ إنَّهُ تَعالى لِأَجْلِ التَّسْلِيَةِ وتَخْفِيفِ هٰذِهِ الأَحْوالِ عَلى القَلْبِ ذَكَرَ قِصَصًا كَثِيرَةً في أَنَّ كُلَّ مَن خَصَّهُ اللّهُ تَعالى بِالنِّعَمِ العَظِيمَةِ في الدِّينِ والدُّنْيا فَإنَّ النّاسَ يُنازِعُونَهُ حَسَدًا وبَغْيًا. فَذَكَرَ أَوَّلًا قِصَّةَ النُّقَباءِ الِاثْنَيْ عَشَرَ وأَخْذِ اللّهِ تَعالى المِيثاقَ مِنهم. ثُمَّ إنَّ اليَهُودَ نَقَضُوا ذٰلِكَ المِيثاقَ حَتّى وقَعُوا في اللَّعْنِ والقَساوَةِ. وذَكَرَ بَعْدَهُ شِدَّةَ إصْرارِ النَّصارى عَلى كُفْرِهِمْ وقَوْلِهِمْ بِالتَّثْلِيثِ بَعْدَ ظُهُورِ الدَّلائِلِ القاطِعَةِ عَلى فَسادِ ما هم عَلَيْهِ. وما ذاكَ إلّا لِحَسَدِهِمْ لِمُحَمَّدٍ ﷺ فِيما آتاهُ اللّهُ مِنَ الدِّينِ الحَقِّ. ثُمَّ ذَكَرَ بَعْدَهُ قِصَّةَ مُوسى في مُحارَبَةِ الجَبّارِينَ وإصْرارِ قَوْمِهِ عَلى التَّمَرُّدِ والعِصْيانِ. ثُمَّ ذَكَرَ بَعْدَهُ قِصَّةَ ابْنَيْ آدَمَ أَنَّ أَحَدَهُما قَتَلَ الآخَرَ حَسَدًا مِنهُ عَلى أَنَّ اللّهَ تَعالى قَبِلَ قُرْبانَهُ. وكُلُّ هٰذِهِ القِصَصِ دالَّةٌ عَلى أَنَّ كُلَّ ذِي نِعْمَةٍ مَحْسُودٌ. فَلَمّا كانَتْ نِعَمُ اللّٰه عَلى مُحَمَّدٍ ﷺ أَعْظَمَ النِّعَمِ لا جَرَمَ لَمْ يَبْعُدِ اتِّفاقُ الأَعْداءِ عَلى اسْتِخْراجِ أَنْواعِ المَكْرِ والكَيْدِ في حَقِّهِ. فَكانَ ذِكْرُ هٰذِهِ القِصَصِ تَسْلِيَةً مِنَ اللّهِ تَعالى لِرَسُولِهِ ﷺ لَمّا هَمَّ قَوْمٌ مِنَ اليَهُودِ أَنْ يَمْكُرُوا بِهِ وأَنْ يُوقِعُوا بِهِ آفَةً ومِحْنَةً. والثّانِي: أَنَّ هَذا مُتَعَلِّقٌ بِقَوْلِهِ: ﴿يا أَهْلَ الكِتابِ

قَدْ جاءَكم رَسُولُنا يُبَيِّنُ لَكم كَثِيرًا مِمّا كُنْتُمْ تُخْفُونَ مِنَ الكِتابِ ويَعْفُو عَنْ كَثِيرٍ﴾ وهٰذِهِ القِصَّةُ وكَيْفِيَّةُ إيجابِ القَصاصِ عَلَيْها مِن أسْرارِ التَّوْراةِ.والثّالِثُ: أنَّ هَذِهِ القِصَّةَ مُتَعَلِّقَةٌ بِما قَبْلَها، وهي قِصَّةُ مُحارَبَةِ الجَبّارِينَ، أيِ اذْكُرْ لِلْيَهُودِ حَدِيثَ ابْنَيْ آدَمَ لِيَعْلَمُوا أنَّ سَبِيلَ أسْلافِهِمْ في النَّدامَةِ والحَسْرَةِ الحاصِلَةِ بِسَبَبِ إقْدامِهِمْ عَلى المَعْصِيَةِ كانَ مِثْلَ سَبِيلِ ابْنَيْ آدَمَ في إقْدامِ أحَدِهِما عَلى قَتْلِ الآخَرِ.والرّابِعُ: قِيلَ هَذا مُتَّصِلٌ بِقَوْلِهِ حِكايَةً عَنِ اليَهُودِ والنَّصارى ﴿نَحْنُ أبْناءُ اللّٰه وأحِبّاؤُهُ﴾ أيْ لا يَنْفَعُهم كَوْنُهم مِن أوْلادِ الأنْبِياءِ مَعَ كُفْرِهِمْ كَما لَمْ يَنْتَفِعْ ولَدُ آدَمَ عِنْدَ مَعْصِيَتِهِ بِكَوْنِ أبِيهِ نَبِيًّا مُعَظَّمًا عِنْدَ اللّٰه تَعالى، الخامِسُ: لَمّا كَفَرَ أهْلُ الكِتابِ بِمُحَمَّدٍ ﷺ حَسَدًا أخْبَرَهُمُ اللَّهُ تَعالى بِخَبَرِ ابْنِ آدَمَ وأنَّ الحَسَدَ أوْقَعَهُ في سُوءِ العاقِبَةِ، والمَقْصُودُ مِنهُ التَّحْذِيرُ عَنِ الحَسَدِ''

(تفسیر کبیر جلد 11 صفحہ 208 / 209 مطبوعہ دار الفکر بیروت)

''اللہ تعالیٰ نے فرمایا: (اور ان کو آدم کے دونوں بیٹوں کی خبر سچائی کے ساتھ سناؤ) اور آیت میں کئی مسائل ہیں: پہلا مسئلہ: اس آیت کا تعلق ماقبل آیات کے ساتھ کئی وجوہات کی بنا پر ہیں: پہلا: یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلے جو فرمایا {اے ایمان والو اپنے اوپر اللہ کی اس نعمت کو یاد کرو جب لوگوں نے تم پر ہاتھ پھیلانے کا ارادہ کیا، پس اللہ نے ان کے ہاتھ تم سے روک دیا)۔ پس خدائے بزرگ و برتر نے ذکر کیا کہ وہ دشمن ان پر آفت اور فتنہ ڈالنا چاہتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ان کی حفاظت فرماتا ہے اور ان کے دشمنوں کو ان پر برائی لانے سے روکتا ہے۔ پھر دل کو تسلی دینے اور ان حالات کو دور کرنے کے لیے خدا تعالیٰ نے بہت سے قصے بیان کیے کہ کس طرح ہر وہ شخص جسے اللہ تعالیٰ نے دین و دنیا

کی عظیم نعمتوں سے نوازا ہے لوگ حسد اور بغض کی بنا پر اس سے جھگڑیں گے۔ چنانچہ، اس نے سب سے پہلے بارہ سرداروں کی کہانی اور اللہ تعالی نے ان سے وعدہ لیا اس کا ذکر کیا۔ پھر یہودیوں نے اس عہد کو توڑ دیا یہاں تک کہ وہ لعنت اور ظلم میں پڑ گئے۔ اس کے بعد اس نے عیسائیوں کے اپنے کفر پر شدید اصرار اور تثلیث پر ان کے اعتقاد کا تذکرہ کیا دلائل و براہین کے ساتھ جس پر وہ تھے، یہ صرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کے حسد کی وجہ سے تھا، جو اللہ نے انہیں سچا دین دیا تھا۔ پھر اس کے بعد حضرت موسیٰؑ کا قصہ کا ذکر کیا ظالموں کے خلاف لڑائی اور قوم کی بغاوت اور نافرمانی کا۔ پھر اس کے بعد آدم کے دو بیٹوں کا قصہ بیان کیا جن میں سے ایک نے حسد کی وجہ سے دوسرے کو مار ڈالا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی قربانی قبول فرمائی۔ یہ تمام قصے اس بات پر دال ہیں کہ ہر وہ شخص جسے نعمتیں ملی ہیں اس سے حسد کیا جاتا ہے۔ چونکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر خدا کی رحمتیں سب سے بڑی نعمتیں تھیں، اس لیے بعید نہیں کہ دشمن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف طرح طرح کے فریب اور سازشیں کرنے پر راضی ہوں۔ پس ان واقعات کا ذکر خدا کی طرف سے رسول اللہ کو تسلی تھی۔ جب یہودیوں کے ایک گروہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف سازشیں کرنے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر مصیبت اور آزمائش کا ارادہ کیا۔ دوسرا: اس کا تعلق اس قول سے ہے: ''اے اہل کتاب تمہارے پاس ہمارا رسول آیا ہے وہ تمہارے لئے بیان کرتا ہیں وہ باتیں جو تم بہت سی چیزیں چھپاتے تھے کتاب میں سے اور بہت سی باتوں سے چشم پوشی کرتے تھے''۔ یہ قصہ اور اس پر انتقامی کارروائی کا طریقہ تورات کے رازوں میں سے ہے۔ تیسرا: یہ قصہ اس سے پہلے والے سے متعلق ہے جو ظالموں کے خلاف جنگ کا قصہ ہے۔ یعنی یہودیوں کے سامنے آدم کے دو بیٹوں کا قصہ بیان کرو تاکہ وہ جان لیں کہ ان کے آباءواجداد کا اپنے گناہ کے نتیجے میں پشیمانی اور پشیمانی کا راستہ ایسا تھا جیسے آدم کے دو بیٹوں کا راستہ ان میں سے ایک نے دوسرے کو قتل کیا تھا۔ اور چوتھا: یہ کہا گیا کہ یہ ان کے اس قول سے مربوط ہے جو یہود و نصاریٰ سے روایت ہے۔ { ہم خدا کے فرزند اور اس

کے پیارے ہیں }۔یعنی انبیاء کی اولاد ہونا، ان کے کفر کے باوجود، ان کو فائدہ نہیں دے گا، جس طرح حضرت آدم کے فرزند، جب انہوں نے نافرمانی کی، حالانکہ ان کے والد اللہ کے ہاں معزز نبی تھے۔ پانچویں: جب اہل کتاب نے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نبوت کا انکار کیا حسد کی وجہ سے تو خدا تعالیٰ نے انہیں ابن آدم کا قصہ سنایا اور اسی حسد نے انہیں برے انجام تک پہنچا دیا۔ اس کا مقصد حسد کے خلاف تنبیہ کرنا ہے۔''

آگے مصنف جس یہودی مفسر کی تفسیر پیش کر کے یہ کہہ رہا ہے کہ سورۃ مائدہ کی پینتیس ویں (35) آیت اس اقتباس کا لفظی ترجمہ ہے، تو عرض ہے کہ وہ پینتیس ویں آیت نہیں بلکہ بتیسویں آیت ہے ملاحظہ ہو ترجمہ:

''اسی وجہ سے ہم نے بنی اسرائیل کو یہ فرمان لکھ دیا تھا کہ جو کوئی کسی کو قتل کرے، جبکہ یہ قتل نہ کسی اور جان کا بدلہ لینے کے لیے ہو اور نہ کسی کے زمین میں فساد پھیلانے کی وجہ سے ہو، تو یہ ایسا ہے جیسے اس نے تمام انسانوں کو قتل کر دیا، اور جو شخص کسی کی جان بچا لے تو یہ ایسا ہے جیسے اس نے تمام انسانوں کی جان بچالی۔ اور واقعہ یہ ہے کہ ہمارے پیغمبران کے پاس کھلی کھلی ہدایات لے کر آئے، مگر اس کے بعد بھی ان میں سے بہت سے لوگ زمین میں زیادتیاں ہی کرتے رہے ہیں۔''

(مترجم آسان ترجمہ قرآن از مفتی تقی عثمانی صاحب)

جب اللہ تعالیٰ خود فرما رہے ہیں کہ ''اسی وجہ سے ہم نے بنی اسرائیل کو یہ فرمان لکھ دیا'' تو اس کو پھر کسی یہودی تفسیر یا یہودی کتاب کی اقتباس کا لفظی ترجمہ کیسے کہا جا سکتا ہے، وہ تو حقیقتاً اللہ نے لکھ دیا ہے بنی اسرائیل کے لئے۔ اگر اللہ تعالیٰ بنی اسرائیل کا نام لئے بغیر یہ کہتا کہ جس نے کسی انسان کو ناحق قتل کیا تو گویا اس نے تمام انسانیت کا قتل کیا تو اعتراض بن سکتا تھا کہ فلاں یہودی عبارت کا ترجمہ ہے، مگر جب اللہ نے کہہ دیا کہ یہ بات بنی اسرائیل کے لئے ہم نے لکھ دیا ہے تو پھر اس کو لفظی ترجمہ کہنا مصنف کے کم فہمی اور لاعلمی ہے۔

آگے مصنف کا یہ کہنا کہ ''قرآن میں مشناہ کے اول حصہ کو حذف کر دیا ہے۔شاید اس وجہ سے کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا اس کے بیان کرنے والے نے اسے پوری طرح نہیں'' کھلم کھلا تضاد ہے، کیونکہ ایک جانب یہ دعوی کیا جاتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کو اپنی طرف سے بنایا ہے پھر یہ کہنا کہ اس کو کچھ کچھ چیزیں سمجھ میں نہیں آتی، سمجھ سے بالاتر ہے، کیونکہ ایک شخص اگر ایسی فصیح و بلیغ کتاب لکھ کر پوری عرب وعجم کو چیلنج دے رہا ہے کہ اس جیسا کلام پیش کر و تو کوئی پیش ہی نہیں کرسکتا، پھر اس کے متعلق یہ کہنا کہ اس کو فلاں چیز سمجھ میں نہیں آیا، جو کہ آسان بھی ہے۔کیا یہ اس دعویٰ کو زمین بوس نہیں کر رہا کہ قرآن کو محمد نے خود لکھا اور گھڑا ہے۔پس خوب سمجھ لو۔

قصہ ابراہیم اور آتش نمرود:

مصنف نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ کو بھی یہودی ماخذ قرار دیا ہے،مگر یہاں بھی اپنے مدعیٰ میں کامیابی سے ہمکنار نہ ہوسکا۔حضرت ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ قرآن و حدیث میں تفصیلاً موجود ہیں، اور ہر مسلمان کو اس سے واقفیت بھی ہیں، لہذا واقعہ نقل کر کے ہم یہاں صفحات کو بڑھانا نہیں چاہتے، مصنف نے یہودیوں کی کتاب سے جو اقتباس پیش کیا ہے، وہ نقل کر کے فیصلہ اور سوالات قارئین کے ذمہ چھوڑ دیتے ہیں۔ چنانچہ مصنف واقعہ ابراہیم کو نقل کرنے کے بعد یہودی کتاب ''مدارش ربہ'' سے ایک اقتباس عبرانی زبان میں نقل کیا ہے ہم انہیں کا ترجمہ پیش کرتے ہیں:

''ترجمہ: ''تیراہ (Terah) ایک بُت بنانے والا شخص تھا۔ایک مرتبہ وہ کہیں باہر گیا اور دوکان پر اپنی بجائے ابراہیم کو بٹھا گیا۔جب کوئی شخص بُت خریدنے آتا تو ابراہیم اس سے کہتا ''تمہاری کیا عمر ہے؟ اور وہ شخص جواب دیتا کہ ''پچاس یا ساٹھ سال''۔اس پر ابراہیم اس سے کہتا کہ ''افسوس ہے اے شخص تیری حالت پر کہ تیری عمر ساٹھ سال ہے اور تو ایک ایسی چیز کی پرستش کرنا چاہتا ہے جو صرف چند روز ہوئے بنی ہے۔یہ سن کر وہ دوسرا شخص

شرمندہ ہو جاتا اور اپنی راہ لیتا۔ایک مرتبہ ایک عورت آئی جس کے ہاتھ میں گیہوں کے آٹے کی ایک تھالی تھی۔اس عورت نے ابراہیم سے کہا ''یہ لو اور بُتوں کے آگے رکھ دو''۔وہ اٹھا اپنے ہاتھ میں ایک ڈنڈا لے کر سب بُتوں کو پاش پاش کر دیا۔بعد ازاں اس نے وہ ڈنڈا سب سے بڑے بُت کے ہاتھ میں رکھ دیا۔جب اس کا باپ واپس آیا تو اس نے ابراہیم سے دریافت کیا کہ ''ان کے ساتھ یہ حرکت کس نے کی ہے''۔ابراہیم نے کہا کہ ''آپ سے کون سی بات پوشیدہ ہے۔ایک عورت یہاں آرد (آٹا) گندم کی تھالی لے کر آئی اور مجھ سے کہنے لگی کہ ''لو یہ تھالی بُتوں کے آگے رکھ دو''۔میں نے وہ تھالی رکھ دی۔اس بُت نے کہا کہ پہلے میں کھاؤں گا اور اس دوسرے بُت نے کہا کہ نہیں پہلے میں کھاؤں گا۔یہ بُت جو سب سے بڑا تھا، (اس نے) ڈنڈا لیا اور سب کو توڑ دیا''۔اس نے (ابراہیم کے باپ نے) کہا کہ مجھ سے ایسے جھوٹے قصے کیوں بیان کرتا ہے؟ کیا یہ سمجھتے ہیں؟ ابراہیم نے اس سے کہا کہ ''جو بات تیرے لب کہتے ہیں کیا وہ تیرے کان نہیں سنتے ؟''اس بات پر تیراہ نے ابراہیم کو پکڑ لیا اور نمرود کے حوالہ کر دیا۔نمرود نے ابراہیم سے کہا ''آؤ آگ کی پرستش کریں''۔ابراہیم نے اس سے کہا کہ ''پانی کی پوجا کیوں نہ کریں جو آگ کو بجھا دیتا ہے''۔پھر نمرود نے کہا کہ ''اچھا آؤ پانی کی پرستش کریں''۔اس پر ابراہیم نے جواب دیا کہ ''اگر ایسا ہی ہے تو پھر بادل کی پوجا کیوں نہ کریں جو پانی لاتا ہے''۔نمرود نے کہا کہ ''اچھا آؤ بادل ہی کی پوجا کریں''۔اس پر ابراہیم نے کہا کہ ''اگر ایسا ہے تو پھر ہوا ہی کی پرستش کیوں نہ کی جائے جو بادلوں کو لے جاتی ہے''۔نمرود نے کہا کہ ''اچھا آؤ ہوا کی پرستش کریں''۔اس پر ابراہیم نے کہا کہ ''پھر انسان ہی کی پوجا کیوں نہ کی جائے جو ہوا کو روک لیتا ہے۔اس پر نمرود نے بگڑ کر کہا کہ ''تو مجھ سے زبان درازی کرتا ہے، بس میں کسی چیز کی پرستش نہیں کرتا۔صرف آگ کی پرستش کرتا ہوں۔دیکھ میں تجھے آگ میں ڈالے دیتا ہوں۔دیکھیں وہ خدا جس کی تو پرستش کرتا ہے تجھے آ کر کیونکر بچا تا ہے۔''

اس کے بعد مصنف کا تبصرہ بھی دیکھ لیجئے، چنانچہ لکھتے ہیں کہ:

''دونوں بیانات کا مقابلہ کرنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمانوں والا قصّہ براہ راست یہودی روایت سے ماخوذ ہے اور چونکہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس قصّہ کو کسی ایک جگہ مسلسل اور مفصل بیان کرنا ضروری نہیں سمجھا اس لئے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ قصّہ عرب میں بہت پہلے سے مشہور تھا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید میں ابراہیم کے باپ کا آذر بتایا گیا ہے، تیراہ (تارح) نہیں جیسا کہ توریت کی کتاب پیدائش میں لکھا ہے۔ مگر مشرقی ممالک کے یہودی بعض اوقات اس کا نام ذارہ (Zarah) بھی لیتے ہیں۔ ممکن ہے کہ عربی نام ''آذر'' اسی کی بگڑی ہوئی صورت ہو اور یہ بھی ممکن کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ نام ملک شام میں معلوم کیا ہو جہاں سے یوسیبئیس Eusebius نے اس نام کی صورت ''ρ θ'' نکالی اور اسے استعمال کیا۔ زمانۂ حال کے ایرانی مسلمان اس نام کو ''آذر'' لکھتے ہیں مگر تلفظ اس کا بالکل اسی طرح کرتے ہیں جیسا کہ عربی میں ہوتا ہے۔ اگرچہ اصلی فارسی تلفظ آذھر (Adhar) تھا، یعنی تقریباً وہی جو یوسیبئیس نے استعمال کیا ہے۔ فارسی زبان میں اس لفظ کے معنی ''آگ'' ہیں اور دراصل یہ اس موکل یا دیوتا کا نام تھا جس کا تعلق آگ سے ہے اور یہ ''ہورامزدا'' کی اچھی مخلوق میں سمجھا جاتا تھا۔''

قارئین کرام! مکمل واقعہ کو چھوڑ کر صرف درمیان سے چھوٹا سا واقعہ لے کر اس کے مماثل کوئی واقعہ بیان کرنے کے بعد یہ دعوی کرنا کہ قصہ ابراہیم یہودیوں کا ماخذ ہے، انصاف کے دھجیاں بکھیرنے کے ساتھ ساتھ اپنی جہالت کا منہ بولتا ثبوت ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ تفصیل سے قرآن وحدیث میں موجود ہیں، یہاں صرف ان کے والد اور بت توڑنے کا واقعہ ہے، اور وہ بھی عین مماثل نہیں بلکہ کچھ باتوں میں مماثلت ہیں۔

پہلی بات ہمیں بالکل فرق نہیں پڑتا کہ مکمل واقعہ یہودی کتب میں موجود ہو یا پھر یہودیوں کا بیان کردہ ہو، ماقبل میں عرض کیا جاچکا ہے کہ بالفرض اگر کچھ واقعات اور قصص کی مماثلت ماقبل کتب سماوی میں موجود ہو تو بھی اس سے کلام اللہ پر کچھ فرق نہیں آئے گا، کیونکہ اس سے کلام

اللہ کی تصدیق ہوسکتی ہے۔ اور پھر جب مسلمانوں کی جانب سے یہ قضیہ پیش کیا گیا کہ اگر ایسا واقعہ یہودی کتب میں موجود ہے تو اس سے تو کلام الٰہی کی تائید ہوتی ہے کہ واقعی یہ الہامی کتاب ہے۔ تو مصنف پینترا بدلتے ہوئے یوں لب کشائی کرتا ہیں کہ:

''اس کے جواب میں صرف اس قدر کہنا کافی ہے کہ یہ روایت صرف جاہل یہودیوں کی ہے اور پڑھے لکھے یہودی اس کا اعتبار نہیں کرتے۔ عہد ابراہیم کے متعلق جتنی قابل اعتبار یہودی روایات ہیں وہ ''ناموس موسیٰ'' (Pentateuch) میں درج ہیں اور ان میں یہ طفلانہ قصّہ موجود نہیں ہے۔ علاوہ اس کے توریت کی کتاب پیدائش سے ظاہر ہوتا ہے کہ نمرود کا عہد ابراہیم سے بہت پہلے گزرا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ نمرود کا نام قرآن میں نہیں آیا ہے، مگر مسلمانوں کی احادیث، روایات، تفاسیر اور ''مدراش ربہ'' کی روایات میں ضرور پایا جاتا ہے۔ علاوہ اس کے نمرود کا یہ تمام قصہ ایک یہودی کی جاہلانہ غلطی پر مبنی ہے۔''

اگر یہ واقعہ بے بنیاد اور من گھڑت ہے تو ہمارا سوال اپنے جگہ قائم ہے کہ اگر رسول اللہ نے یہ واقعہ یہودیوں سے لیا ہے یا سنا ہے تو وہ یہودی کون تھے؟ رسول اللہ کا ان سے ملنا اور سماع کہا سے ثابت ہے؟ اور اگر یہودی کتاب سے دیکھ کر نقل کیا ہے تو کیا وجہ ہے قرآن میں کچھ اور جزئیات ہے اور یہودی کتاب میں کچھ اور۔

اگر رسول اللہ نے کچھ باتیں اپنی طرف سے ملایا ہے یعنی یہودی روایت کے برخلاف تو اس وقت کے یہودی جس سے رسول اللہ نے کلام کیا تھا ضرور اس پر نکیر کرتے کہ یہ بات تو آپ نے مجھ سے سنا ہے، اور اگر کہا جائے کہ ممکن ہے وہ یہودی مر گئے یا کہی چلے گئے پھر محمد نے یہ کلام پیش کیا تو عرض ہے کہ دوسرے یہودی تو موجود تھے، وہ یہ الزام ضرور لگا لیتے کہ محمد نے یہ کلام فلاں یہودی سے سنا یا پڑھا۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ تاریخ میں ایسا کچھ نہیں نہ یہودیوں کی کتابوں میں اس کی حقیقت موجود ہے، پس معلوم ہوا کہ یہ بعد کے گھڑا ہوا مفروضہ ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں۔

یاد رہے ہمارے اس سوال کے جواب میں ممکن ہے یہ کہا جائے کہ خود قرآن میں ایسی آیتیں موجود ہیں کہ کافروں نے کہا رسول اللہ یہ کلام خود گھڑا ہے یا کسی سے سنا ہے، تو عرض ہے کہ یہ عام کفار اور مشرکین کی جانب سے کہا جاتا تھا، جو وہاں موجود تھے، باقی رسول اللہ کہا سے سیکھا یا پڑھا یا سنا اس کا کوئی ثبوت نہیں۔ اور اگر ایسا ہوتا تو ضرور یہودی اس تاریخ کو بیان کرتے اس شخص کی حالات بیان کرتے اور وہ شخص یہودی خود بھی کہتا کہ اس نے مجھ سے سنا یا پڑھا ہے۔ حالانکہ ایسا کچھ بھی نہیں۔

کتاب ”عرائس المجالس المعروف قصص الانبیاء“ کے بارے میں وضاحت :

مصنف نے اس کتاب سے بہت واقعات اور اقتباسات نقل کیا ہے، مگر یاد رہے یہ کتاب غیر مستند ہے اور اس میں اسرائیلی روایات موجود ہیں، جن سے مصنف کچھ اقتباس نقل کر کے مماثلت ثابت کیا ہے۔

قصہ ملکہ سبا و سلیمان :

اس واقعہ کو بھی مصنف یہودی ماخذ قرار دیتے ہیں، مگر ہم کہہ چکے ہے کہ یہاں مماثلت سے ماخذ کا دعویٰ باطل ہے، کیونکہ کتب سماوی میں مماثلت کا پایہ جانا واضح ہے، مزید اس واقعہ کا جواب خود مصنف نے واقعہ کے آخر میں دیا ہے، جسے آپ چاہے تو کھلا تضاد کہہ سکتے ہیں یا پھر جواب۔ واقعات بیان کرنے کے بعد مصنف آخر میں لکھتے ہیں کہ:

”اگرچہ قرآن میں اور بہت سے قصے ایسے ہیں جو یہودی افسانوں سے لئے گئے ہیں۔ لیکن یہاں ان کو مفصل لکھنے کی ضرورت نہیں۔ صرف اسی ایک افسانے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انبیا کی جو صحیح تاریخ بائبل میں لکھی ہے اس سے محمد ناواقف تھے اور اس

کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ عرب یہودی جن کو یہ روایتیں یاد تھیں، زیادہ پڑھے لکھے نہ تھے اور انہیں بمقابلہ بائبل کے تالمود کی روایات زیادہ معلوم تھیں۔''

لیجئے جناب صیاد خود اپنے جال میں پھنس گیا۔ ع

لو آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا

پہلے تو کہتے تھے کہ یہ واقعات اور باتیں رسول اللہ نے یہود سے سنا یا پڑھا ہے اور پھر خود اپنا کلام بنا کر اللہ تعالیٰ کی طرف اس کو منسوب کیا۔ مگر یہاں مصنف اپنے دعویٰ کو خود جوتے کے نوک پر رکھ کر اچھال رہے ہے۔ ے

خود ہی اپنی بات کا انکار کر بیٹھا
دعوے بھی عجیب تھے ، دلیلیں بھی

اگر محمد بائبل سے ناواقف تھے، تو قرآن میں جو واقعات بیان ہوئے وہ کس نے بیان کیا؟ بقول تمہارے محمد نے کہی سے سنا یا پڑھا تھا، تو وہ تو ناواقف تھے پھر کیسے ان واقعات کو شامل کر سکتا ہے۔ عقل کے اندھوں کو ہر چیز الٹا نظر آتا ہے۔ ایک ناواقف شخص نے ایک ایسی کتاب تیار کی ہے جس کی نظیر آج تک پیش کرنے سے دنیا قاصر ہے، بھلا یہ بھی کوئی معقولی بات ہے۔

قصّہ ہاروت و ماروت:

تفاسیر اور کتابوں میں ہاروت و ماروت کے متعلق بہت سارے اسرائیلیات نقل کیا گیا ہیں، جسے مصنف نے بھی پیش کیا ہے، ان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ دو فرشتے تھے بطور امتحان اللہ نے ان میں شہوت کا مادہ رکھا اور زمین پر بھیج دیا اور یہاں وہ ایک لڑکی پر فریفتہ ہو گئے جسے زہرہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، اور دونوں کا دل چاہا اس سے ملنے کا، پھر لڑکی نے کچھ شرائط کے ساتھ ملنے کو مشروط کیا اور ان میں ایک شراب کا تھا، چنانچہ دونوں فرشتوں نے شراب پی لیا اور نشے میں آ کر اس لڑکی سے زنا کیا اور کوئی بندہ آ کر انہیں دیکھ لیا چنانچہ انہوں نے اس راز کو

چھپانے کے لئے اس کو قتل کیا ، پھر حالت نشہ میں دونوں نے وہ دعا بھی اس لڑکی کو بتادی جس کو پڑھ کر فرشتے اوپر آسمانوں پر چڑھتے ہیں، چناچہ وہ عورت دعا پڑھ کر آسمان پر گئی، اور پھر وہ ستارہ بن گئی جسے زہرہ کہا جاتا ہے، جو آج بھی مشہور ہے، اور پھر فرشتوں کو بطور سزا بابل شہر میں کسی کنوئیں میں لٹکایا گیا۔

یہ سب اسرائیلیات میں سے ہیں، جسے بعض مفسرین نے نقل کیا ہیں اور کچھ روایات بھی اس کی تائید میں پیش کیا گیا ہیں، جو من گھڑت اور مجہول ہے درست نہیں ہیں۔ اور مصنف نے اس سے متعلق جو یہودی کتب سے واقعہ نقل کیا ہے، جس کے متعلق ہم کہہ رہے ہیں کہ یہ واقعات جتنے بھی ہے سب اسرائیلیات میں سے ہیں کوئی واقعہ ایسا ثابت نہیں ہیں۔ اصل واقعہ ہم قارئین کے سامنے پیش کریں گے۔

مگر پیش کرنے سے پہلے ایک بات کی وضاحت کروں کہ کسی کو یہ شبہ نہ ہو کہ آپ نے اس واقعہ کے متعلق کہا یہ اسرائیلی روایات میں سے ہیں، یا اس کے علاوہ اور بھی ایسے واقعات ہیں جس کے متعلق آپ کہتے ہیں کہ یہ اسرائیلی روایات میں سے ہیں۔ حالانکہ مصنف کا بھی یہی دعویٰ ہے کہ یہ رسول اللہ نے اسرائیلی کتب سے لیا ہے اور یہی بات آپ نے بھی تسلیم کرلی کہ یہ واقعہ جو مفسرین نے نقل کیا ہیں اسرائیلی روایات میں سے ہیں۔ تو عرض ہے کہ مصنف کا دعویٰ قرآن سے متعلق ہیں کہ قرآن کا ماخذ اسرائیلی یا دیگر کتب ہیں، نہ کہ تفسیر قرآن کے متعلق۔ اور قرآن میں تو ایسا کچھ نہیں ہے۔

اس لئے قرآن تو تاریخ کی کتاب نہیں کہ وہ واقعہ کے ساتھ تاریخ بھی بیان کرے، بلکہ قرآن ہدایت و رہنمائی کی کتاب ہے اور جگہ جگہ بقدر ضرورت واقعات اور قصص بھی بیان کرتا ہے وہ بھی بطور عبرت اور نصیحت مع نشانی علی النبوۃ۔ لہذا قرآن میں ایسا واقعات نہیں ہیں۔

اور اگر اس پر کوئی یہ کہے کہ یہ بات آپ کی ٹھیک ہے ہاروت اور ماروت کا واقعہ تو قرآن

میں ایسا نہیں جو بعض مفسرین نے بیان کیا ہے، جس کے متعلق آپ کہتے ہیں وہ اسرائیلی روایات میں سے ہیں، مگر دیگر جو واقعات ہے جو قرآن میں بھی ہے اور یہودی کتب میں بھی معمولی اختلاف کے ساتھ واقعہ ایک جیسا ہے، وہ تو پھر ماخذ میں شمار ہوں گے اور ان سے تو معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ نے یہ باتیں وہی سے لی ہے۔تو اس کے متعلق عرض ہے کہ وہ اسرائیلی روایات جو قرآن وحدیث اور معتقدات اسلامی کے موافق ہیں اسے ہم تسلیم کرتے ہیں اور انہیں سے قرآن کی تائید بھی ہوتی ہے۔ کیونکہ قرآن میں یہ مذکور ہے کہ یہ کتاب پچھلی کتب کی تصدیق کرنے والی ہے،اور جن واقعات کا تذکرہ قرآن نے کیا ہے اگر اس سے مشابہ یا مماثل واقعہ اس سے پہلے کتب میں موجود ہوتو ہم قرآن کے واقعہ کو درست سمجھیں گے، کیونکہ عقل کا تقاضا بھی یہی ہے کہ جس کتاب کی صحت تواتر ہو اور اس میں تحریف کا شبہ بھی نہ ہو اس کی بات معتبر سمجھا جائے گا، بنسبت اس کتاب کی جس کی تحریف وتبدیلی کے قائلین اکثریت میں ہیں۔ اور جو روایات قرآن وحدیث ومعتقدات اسلامی کے خلاف ہو اسے ہم تسلیم نہیں کرتے۔ جیسے ہاروت وماروت سے متعلق واقعات اور اس جیسے اور بھی واقعات ہیں۔

اصل واقعہ:

اب اصل واقعہ کی طرف آتے ہیں، راقم الحروف کی نظر میں اس آیت کی بہترین ومختصر اور آسان تفسیر شیخ الاسلام فی زماننا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب بارک اللہ فی عمرہ نے پیش کیا ہیں، وہی سے اس کی تفسیر پیش کیا جارہا ہے، ملاحظہ ہو پوری آیت:

''وَ اتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّیٰطِیْنُ عَلٰی مُلْکِ سُلَیْمٰنَ ۚ وَ مَا کَفَرَ سُلَیْمٰنُ وَ لٰکِنَّ الشَّیٰطِیْنَ کَفَرُوْا یُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ٭ وَ مَاۤ اُنْزِلَ عَلَی الْمَلَکَیْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَ مَارُوْتَ ؕ وَ مَا یُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰی یَقُوْلَاۤ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَکْفُرْ ؕ فَیَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا یُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَیْنَ الْمَرْءِ وَ زَوْجِهٖ ؕ وَ مَا هُمْ

بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَ يَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ وَ لَا يَنْفَعُهُمْ ؕ وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِى الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۟ؕ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ ؕ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ '' (سورۃ البقرہ آیت 102)

''اور یہ (بنی اسرائیل) ان (منتروں) کے پیچھے لگ گئے جو سلیمان (علیہ۔السلام) کی سلطنت کی زمانے میں شیاطین پڑھا کرتے تھے۔اور سلیمان (علیہ۔السلام) نے کوئی کفر نہیں کیا تھا، البتہ شیاطین لوگوں کو جادو کی تعلیم دے کر کفر کا ارتکاب کرتے تھے۔(66) نیز (یہ بنی اسرائیل) اس چیز کے پیچھے لگ گئے جو شہر بابل میں ہاروت اور ماروت نامی دو فرشتوں پر نازل کی گئی تھی۔ (67) یہ دو فرشتے کسی کو اس وقت تک کوئی تعلیم نہیں دیتے تھے جب تک اس سے یہ نہ کہہ دیں گے کہ: ہم محض آزمائش کے لیے (بھیجے گئے) ہیں، لہذا تم (جادو کے پیچھے لگ کر) کفر اختیار نہ کرنا۔پھر بھی یہ لوگ ان سے وہ چیزیں سیکھتے تھے جس کے ذریعے مرد اور اس کی بیوی میں جدائی پیدا کردیں۔(ویسے یہ واضح رہے کہ) وہ اس کے ذریعے کسی کو اللہ کی مشیت کے بغیر کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے تھے۔(68) (مگر) وہ ایسی باتیں سیکھتے تھے جو ان کے لیے نقصان دہ تھیں، اور فائدہ مند نہ تھیں۔اور وہ یہ بھی خوب جانتے تھے کہ جو شخص ان چیزوں کا خریدار بنے گا ، آخرت میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہوگا۔اور حقیقت یہ ہے کہ وہ چیز بہت بری تھی جس کے بدلے انہوں نے اپنی جانیں بیچ ڈالیں۔کاش کہ ان کو (اس بات کا حقیقی) علم ہوتا ۔(69)''

''(66) ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کی ایک اور بدعملی کی طرف اشارہ فرمایا ہے، اور وہ یہ کہ جادو ٹونے کے پیچھے لگنا شرعاً ناجائز تھا، بالخصوص اگر جادو میں شرکیہ کلمات منتر کے طور پر پڑھے جائیں تو ایسا جادو کفر کے مترادف ہے۔حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے میں کچھ شیاطین نے، جن میں انسان اور جنات دونوں شامل ہو سکتے ہیں، بعض

یہودیوں کو یہ پٹی پڑھائی کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی سلطنت کا سارا راز جادو میں مضمر ہے، اور اگر جادو سیکھ لو گے تو تمہیں بھی حیرت انگیز اِقتدار نصیب ہوگا۔ چنانچہ یہ لوگ جادو سیکھنے اور اس پر عمل کرنے میں لگ گئے، حالانکہ جادو پر عمل کرنا نہ صرف ناجائز تھا، بلکہ اس کی بعض قسمیں کفر تک پہنچتی تھیں۔ دوسرا غضب یہودیوں نے یہ کیا کہ خود حضرت سلیمان علیہ السلام کو جادوگر قرار دے کر ان کے بارے میں یہ مشہور کردیا کہ انہوں نے آخری عمر میں بتوں کو پوجنا شروع کردیا تھا۔ ان کے بارے میں یہ جھوٹی داستانیں انہوں نے اپنی مقدس کتابوں میں شامل کردیں جو آج تک بائبل میں درج چلی آتی ہیں۔ چنانچہ بائبل کی کتاب سلاطین اول 11۔ 1 تا 12 میں ان کے معاذ اللہ مرتد ہونے کا بیان آج بھی موجود ہے۔ قرآنِ کریم نے اس آیت میں حضرت سلیمان علیہ السلام پر اس ناپاک بہتان کی تردید فرمائی ہے۔ اس سے یہ بات بھی واضح ہوجاتی ہے کہ جن لوگوں نے قرآنِ کریم پر یہ الزام لگایا ہے کہ وہ یہودیوں اور عیسائیوں کی کتابوں سے ماخوذ ہے، وہ کتنا غلط الزام ہے۔ یہاں قرآنِ کریم صریح الفاظ میں یہود ونصاریٰ کی کتابوں کی تردید کر رہا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایسا کوئی ذریعہ نہیں تھا جس سے وہ یہ خود معلوم کرسکتے کہ یہودیوں کی کتابوں میں کیا لکھا ہے۔ اس بات کا علم آپ کو وحی کے سوا کسی اور راستے سے نہیں ہوسکتا تھا۔ لہٰذا یہ آیت بذاتِ خود آپ کے صاحب وحی رسول ہونے کی واضح دلیل ہے کہ آپ نے نہ صرف یہ بتلایا کہ یہودیوں کی کتابوں میں حضرت سلیمان علیہ السلام پر کیا بہتان لگایا گیا ہے، بلکہ اس قدر جم کر اس کی تردید فرمائی ہے۔ (67): بابل عراق کا مشہور شہر تھا۔ ایک زمانے میں وہاں جادو کا بڑا چرچا ہوگیا تھا، اور یہودی بھی اس ناجائز کام میں بُری طرح ملوث ہوگئے تھے۔ انبیائے کرام اور دوسرے نیک لوگ انہیں جادو سے منع کرتے تو وہ بات نہ مانتے تھے۔ اس سے بھی خطرناک بات یہ تھی کہ لوگوں نے جادوگروں کے شعبدوں کو معجزے سمجھ کر انہیں اپنا دِینی مقتدا بنالیا تھا۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے اپنے دو فرشتے جن کا نام ہاروت اور ماروت تھا دُنیا میں انسانی شکل میں بھیجے تاکہ وہ

لوگوں کو جادو کی حقیقت سے آگاہ کریں، اور یہ بتائیں کہ خدائی معجزات سے ان کا کوء تعلق نہیں ہے۔ معجزہ براہِ راست اللہ تعالیٰ کا فعل ہے جس میں کسی ظاہری سبب کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس جادو کے ذریعے جو کوئی شعبدہ دکھایا جاتا ہے وہ اسی عالمِ اسباب کا ایک حصہ ہے۔ یہ بات واضح کرنے کے لئے ان فرشتوں کو جادو کے مختلف طریقے بھی بتانے پڑتے تھے، تاکہ یہ دکھایا جاسکے کہ کس طرح وہ سبب اور مسبب کے رشتے سے منسلک ہیں، لیکن جب وہ ان طریقوں کی تشریح کرتے تو ساتھ ساتھ لوگوں کو متنبہ بھی کردیتے تھے کہ یاد رکھو! یہ طریقے ہم اس لئے نہیں بتارہے ہیں کہ تم ان پر عمل شروع کردو، بلکہ اس لئے بتارہے ہیں کہ تم پر جادو اور معجزے کا فرق واضح ہو، اور تم جادو سے پرہیز کرو۔ اس لحاظ سے ہمارا وجود تمہارے لئے ایک امتحان ہے کہ ہماری باتوں کو سمجھ کر تم جادو سے پرہیز کرتے ہو یا ہم سے جادو کے طریقے سیکھ کر ان پر عمل شروع کردیتے ہو۔ یہ کام انبیا کے بجائے فرشتوں سے بظاہر اس بنا پر لیا گیا کہ جادو کے فارمولے بتانا، خواہ وہ صحیح مقصد سے کیوں نہ ہو، انبیائے کرام کو زیب نہیں دیتا تھا۔ اس کے برعکس فرشتے چونکہ غیر مکلف ہوتے ہیں، اس لئے ان سے بہت سے تکوینی کام لئے جاسکتے ہیں بہر حال! نافرمان لوگوں نے ان فرشتوں کی طرف سے کہی ہوئی باتوں کو تو نظر انداز کردیا، اور ان کے بتائے ہوئے فارمولوں کو جادو کرنے میں استعمال کیا اور وہ بھی ایسے گھناونے مقاصد کے لئے جو ویسے بھی حرام تھے، مثلاً میاں بیوی میں پھوٹ ڈال کر نوبت طلاق تک پہنچا دینا۔ (68): یہاں سے جملہ معترضہ کے طور پر ایک اور اُصولی غلطی پر متنبہ کیا جارہاہے، اور وہ یہ کہ جادو پر ایمان رکھنے والے یہ سمجھتے تھے کہ جادو میں بذاتِ خود ایسی تاثیر موجود ہے جس سے مطلوبہ نتیجہ خود بخود اللہ کے حکم کے بغیر بھی برآمد ہوجاتا ہے، گویا اللہ چاہے یا نہ چاہے، وہ نتیجہ پیدا ہوکر رہے گا۔ یہ عقیدہ بذاتِ خود کفر تھا، اس لئے واضح کردیا گیا کہ دنیا کے دوسرے اسباب کی طرح جادو بھی محض ایک سبب ہے اور دنیا میں کوئی سبب بھی اپنا مسبّب یا نتیجہ اس وقت تک ظاہر نہیں کرسکتا جب تک اللہ کی مشیت اس کے ساتھ متعلق نہ ہو۔

کائنات کی کسی چیز میں بذاتِ خود نہ کسی کو نفع پہنچانے کی طاقت ہے نہ نقصان پہنچانے کی۔ لہٰذا اگر کوئی ظالم کسی پر ظلم کرنا چاہتا ہے تو وہ اللہ کی قدرت اور مشیت کے بغیر کچھ نہیں کرسکتا۔ البتہ چونکہ یہ دنیا ایک امتحان کی جگہ ہے اس لئے یہاں اللہ کی سنت یہ ہے کہ جب کوئی شخص اللہ کی نافرمانی کرتے ہوئے کوئی گناہ کرنا چاہتا ہے یا کسی پر ظلم کرنا چاہتا ہے تو اگر اللہ تعالیٰ تکوینی مصلحت کے مطابق سمجھتا ہے تو اپنی مشیت سے وہ کام کرادیتا ہے۔ اِسی کے نتیجے میں ظالم کو گناہ اور مظلوم کو ثواب ملتا ہے، ورنہ اگر اللہ اسے کام کی قدرت ہی نہ دے تو امتحان کیسے ہو؟ لہٰذا جتنے گناہ کے کام دنیا میں ہوتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ ہی کی قدرت اور مشیت سے ہوتے ہیں، اگرچہ اس کی رضامندی ان کو حاصل نہیں ہوتی۔ اور اللہ تعالیٰ کی مشیت اور اس کی رضامندی میں فرق یہی ہے کہ مشیت اچھے بُرے ہر کام سے متعلق ہوسکتی ہے، مگر رضامندی صرف جائز اور ثواب کے کاموں سے مخصوص ہے۔ (69): اس آیت کے شروع میں تو یہ کہا گیا ہے کہ وہ یہ حقیقت جانتے ہیں کہ جو مشرکانہ جادو کا خریدار ہوگا اس کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں، لیکن آیت کے آخری حصہ میں فرمایا ہے کہ ''کاش وہ علم رکھتے''، جس کا مطلب یہ ہے کہ انہیں اس حقیقت کا علم نہیں ہے۔ بظاہر دونوں باتیں متضاد لگتی ہیں، لیکن درحقیقت اس اندازِ بیان سے یہ عظیم سبق دیا گیا ہے کہ نرا علم جس پر عمل نہ ہو حقیقت میں علم کہلانے کا مستحق نہیں، بلکہ وہ کالعدم ہے۔ لہٰذا اگر وہ یہ بات جانتے تو ہیں مگر ان کا عمل اس کے برخلاف ہے تو وہ علم کس کام کا؟ کاش کہ وہ حقیقی علم رکھتے تو اس پر ان کا عمل بھی ہوتا۔''

(آسان ترجمہ قرآن)

یہ ہے اصل واقعہ، اور اس کے برخلاف مصنف اور دیگر بعض مفسرین کرام نے جو واقعات نقل کیے ہیں، وہ اسرائیلیات میں سے ہیں جو غیر معتبر اور غیر مستند ہیں۔

مذکورہ آیت سے مصنف کے دعوی کی تردید:

مذکورہ آیت کی تفسیر سے مصنف کے دعویٰ کا مکمل تردید ہوتی ہے، جو ان کا دعویٰ ہے کہ قرآن کا ماخذ یہودی کتب و واقعات ہیں۔ جس کی طرف شیخ الاسلام نے اپنی تفسیر میں بھی اشارہ کیا ہے کہ یہودیوں نے یہ بات مشہور کی تھی کہ حضرت سلیمان علیہ السلام آخر وقت میں بتوں کی پرستش شروع کیا اور اللہ کے حکم کی نافرمانی کی چنانچہ بائبل میں موجود تاریخی صحائف میں سے سلاطین میں یہ واقعہ موجود ہیں کہ:

''لیکن سلیمان بہت سی غیر ملکی خواتین سے محبت کرتا تھا۔ فرعون کی بیٹی کے علاوہ اُس کی شادی موآبی، عمونی، ادومی، صیدانی اور حِتّی عورتوں سے ہوئی۔ ان قوموں کے بارے میں رب نے اسرائیلیوں کو حکم دیا تھا، "نہ تم ان کے گھروں میں جاؤ اور نہ یہ تمہارے گھروں میں آئیں، ورنہ یہ تمہارے دل اپنے دیوتاؤں کی طرف مائل کر دیں گے۔" تو بھی سلیمان بڑے پیار سے اپنی ان بیویوں سے لپٹا رہا۔ 3 اُس کی شاہی خاندانوں سے تعلق رکھنے والی 700 بیویاں اور 300 داشتائیں تھیں۔ ان عورتوں نے آخر کار اُس کا دل رب سے دور کر دیا۔ جب وہ بوڑھا ہو گیا تو انہوں نے اُس کا دل دیگر معبودوں کی طرف مائل کر دیا۔ یوں وہ بڑھاپے میں اپنے باپ داؤد کی طرح پورے دل سے رب کا وفادار نہ رہا بلکہ صیدانیوں کی دیوی عستارات اور عمونیوں کے دیوتا ملکوم کی پوجا کرنے لگا۔ غرض اُس نے ایسا کام کیا جو رب کو ناپسند تھا۔ وہ وفاداری نہ رہی جس سے اُس کے باپ داؤد نے رب کی خدمت کی تھی۔ یروشلم کے مشرق میں سلیمان نے ایک پہاڑی پر دو مندر بنائے، ایک موآب کے گھنونے دیوتا کموس کے لئے اور ایک عمون کے گھنونے دیوتا ملک یعنی ملکوم کے لئے۔ ایسے مندر اُس نے اپنی تمام غیر ملکی بیویوں کے لئے تعمیر کئے تا کہ وہ اپنے دیوتاؤں کو بخور اور ذبح کی قربانیاں پیش کر سکیں۔ رب کو سلیمان پر بڑا غصہ آیا، کیونکہ وہ اسرائیل کے خدا سے دور ہو گیا تھا، حالانکہ رب اُس پر دو بار ظاہر ہوا تھا۔ گو اُس نے اُسے دیگر معبودوں کی پوجا کرنے سے صاف منع کیا تھا تو بھی سلیمان نے اُس کا حکم نہ مانا۔''

(کتاب مقدس ،سلاطین اول باب 11 ص/ 495-496)

انہیں تہمت اور جھوٹی باتوں کی صفائی قرآن نے دی ہے ، اس کے علاوہ یہودیوں نے حضرت سلیمان علیہ السلام پر جادوگر کا بہتان بھی ٹھوک دیا کہ ان کی سلطنت سحر کی بنیاد پر قائم ہے۔قرآن مجید نے اس کی تردید کی اور کہا کہ سلیمان علیہ السلام نے کوئی کفر نہیں کیا۔ یہ مصنف کے منہ پر زوردار تمانچہ ہے، جس کا وہ دعوی کررہا ہے کہ قرآن کا ماخذ یہودی کتب وروایات ہیں ،اگر قرآن کا ماخذ یہودی کتب ہوتا تو رسول اللہ بھی وہی کلام پیش کرتا جو یہودی کتب میں ہے، مگر رسول اللہ نے تو ان کی صفائی پیش کی بذریعہ وحی۔

اب مصنف کے حواریوں کے پاس دو راستہ ہیں: یا تو وہ تسلیم کریں گے کہ رسول اللہ نے یہ کلام یہودیوں سے نہیں لیا، جس پر مذکورہ واقعہ دال ہیں، اگر یہودیوں سے لیتا تو رسول اللہ بھی حضرت سلیمان کے بارے میں وہی جھوٹی داستان پیش کرتا جو یہودیوں نے پیش کیا ہیں۔ حالانکہ ایسا ہرگز نہیں، ایک بات تو حل ہوا کہ یہ بات رسول اللہ نے یہودیوں سے نہیں لی۔اب رہ گئی یہ بات کہ کہا سے پھر لیا؟ ہم تو کہتے ہیں بذریعہ وحی اللہ نے خبر دی۔اور منکرین ومعترضین کے نزدیک ایک ہی راستہ بچ جاتا ہے اور وہ خود گھڑنے کی ، اس کے علاوہ معترضین کے پاس دوسرا راستہ نہیں۔ جب رسول اللہ نے یہ کلام خود گھڑی ہے تو مصنف اور اس کے حواری معترضین کا یہ دعویٰ غلط ہوگا کہ قرآن کو محمد نے یہودیوں یا دوسرے مذاہب سے لیا ہیں۔خود گھڑنے کا دعویٰ بھی باطل ہے کیونکہ رسول اللہ امی تھے کسی سے پڑھے لکھے نہیں اور یہ بات حد تواتر کو پہنچ چکا ہیں، اور امی سے ایسے کلام کا صادر ہونا بعید از عقل ہے۔لہذا ثابت ہوتا ہے کہ یہ کتاب کلام اللہ اور الہامی کتاب ہے، نہ کہی سے لیا گیا ہے اور سنا گیا ہے اور گھڑا گیا ہے۔

واقعہ سے متعلق روایات اور اسرائیلیات پر مفسرین کا تبصرہ:

علامہ فخر الدین رازی (المتوفی 606ھ) ان واقعات کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

''واعْلَمْ أنَّ هَذِهِ الرِّوايَةَ فاسِدَةٌ، مَرْدُودَةٌ غَيْرُ مَقْبُولَةٍ لِأنَّهُ لَيْسَ في كِتابِ اللّٰه ما يَدُلُّ عَلى ذَلِكَ، بَلْ فِيهِ ما يُبْطِلُها مِن وُجُوهٍ''

(تفسیر کبیر تحت ھذہ الآیۃ)

''جان لو کہ یہ روایت فاسد، مردود اور غیر مقبول ہے، اس لئے کہ قرآن مجید میں ایسا واقعہ نہیں ہے جس پر یہ دلالت کرے، بلکہ کئی وجوہات کی بناء پر یہ باطل ہیں۔''

پھر آگے تین وجوہات کی بناء پر اس کو رد کیا ہے۔

علامہ قرطبی (671ھ) رحمہ اللہ ان واقعات کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''قُلْنَا: هَذَا كُلُّهُ ضَعِيفٌ وَبَعِيدٌ عَنِ ابن عمر وغيره، لا يصح منه شي''

(تفسیر قرطبی)

''ہم نے کہا کہ یہ سارے واقعات ضعیف ہے اور حضرت ابن عمر و دیگر سے جو روایات (اس حوالے سے) منقول ہے وہ ثابت نہیں ہیں۔ان میں سے کچھ بھی درست نہیں ہے۔''

مفسر قرآن علامہ خازن رحمہ اللہ نے اس مسئلہ پر کلام کیا ہے کہ کیا فرشتوں سے گناہ ہوسکتا ہے یا وہ معصوم ہے، اس بات پر امت کا اجماع ہیں کہ جو فرشتے پیغام بھیجنے والے ہیں وہ معصوم ہیں، اور جو فرشتے ان کے علاوہ ہیں ان میں بھی جمہور محققین کا رائے یہی ہے کہ وہ بھی معصوم ہیں لیکن کچھ محققین اس بات کی تصریح کی ہے کہ وہ معصوم نہیں ان سے گناہ ہوسکتا ہے۔ اور دلیل میں یہی ہاروت و ماروت کا واقعہ اور اس سے متعلق جو روایات ہیں وہ پیش کرتے ہیں، مگر جمہور کی جانب سے جواب دیا گیا ہیں کہ اس سے متعلق جو روایات اور اخبار ہیں وہ موضوع اور اسرائیلی روایات ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں۔ پھر آخر میں علامہ خازن رح فرماتے ہیں کہ:

''والاولیٰ تنزیه الملائكة عن كل ما لا يليق بمنصبهم''

تفسیر خازن جلد/ 1 ص/ 121 مطبوع بیروت)

''صحیح بات یہ ہے کہ فرشتے ہر اس چیز سے پاک ہیں جو ان کے منصب کے خلاف ہیں۔''

علامہ ابوحیان رحمہ اللہ (745ھ) فرماتے ہیں:

'' أَنَّ جَمِيعَ ذَلِكَ لا يَصِحُّ مِنهُ شَيْءٌ، ولَمْ يَصِحَّ أَنَّ رَسُولَ اللّٰه صَلّى اللَّهُ تَعالى عَلَيْهِ وسَلَّمَ كانَ يَلْعَنُ الزُّهَرَةَ''

بحوالہ روح المعانی تفسیر تحت ھذہ الآیۃ)

''بے شک یہ سارے واقعات ان میں سے کوئی بھی صحیح نہیں ہے اور نہ یہ روایت صحیح ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زھرہ پر لعنت کیا تھا۔''

علامہ شہاب عراقی رحمہ اللہ نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ:

''مَنِ اعْتَقَدَ في هارُوتَ ومارُوتَ أَنَّهُما مَلَكانِ يُعَذَّبانِ عَلى خَطِيئَتِهِما مَعَ الزُّهَرَةِ فهو كافِرٌ بِاللّٰه تَعالى العَظِيمِ. فَإِنَّ المَلائِكَةَ مَعْصُومُونَ (لا يَعْصُونَ اللَّهَ ما أَمَرَهم ويَفْعَلُونَ ما يُؤْمَرُونَ)''

(روح المعانی)

''جو شخص یہ عقیدہ رکھے کہ ہاروت و ماروت دونوں فرشتے ہیں جن کو زھرہ (عورت) کے ساتھ گناہ کی وجہ سے عذاب دیا جارہا ہیں پس وہ اللہ تعالیٰ کا منکر ہے، اس لئے فرشتے معصوم ہے (وہ اللہ کی نافرمانی نہیں کرتے جب انہیں حکم دے اور وہی کرتے ہیں جس کا انہیں حکم دیا جاتا ہیں)''

علامہ قاضی بیضاوی رحمہ اللہ (685ھ) فرماتے ہیں کہ:

'' وَمَا رُوِيَ أَنَّهُما مُثِّلا بَشَرَيْنِ، ورُكِّبَ فِيهِما الشَّهْوَةُ فَتَعَرَّضا لِامْرَأَةٍ يُقالُ لَها: زُهَرَةُ. فَحَمَلَتْهُما عَلى المَعاصِي والشِّرْكِ. ثُمَّ صَعِدَتْ إلى السَّماءِ بِما تَعَلَّمَتْ مِنهُما فَمَحْكِيٌّ عَنِ اليَهُودِ''

(تفسیر بیضاوی تحت ھذہ الآیۃ)

''اور جو بیان کرتے ہیں کہ ان کو انسانی شکل میں بھیجا گیا اور ان میں شہوت رکھی گئی، پس وہ عورت کے پیچھے لگ گئی جسے زھرہ کہا جاتا ہے، اور اس عورت نے ان کو شرک و معاصی پر آمادہ کیا، پھر ان سے دعا سیکھ کر آسمان پر چلی گئی یہ سب یہود یوں کی گھڑی ہوئی باتیں ہیں ہے''

قارئین کرام! مفسرین کرام کی عبارات آپ نے ملاحظہ کیا، وہ ان روایات اور حکایات کو من گھڑت اور موضوع قرار دیتے ہیں، اور یہی علماء اسلام کا نقطہ نظر ہے، اور مصنف نے جو باتیں پیش کی ہے وہ بھی اسرائیلی روایات ہیں جس کا ہم نے کہا کہ بعض مفسرین نے انہیں نقل کیا ہیں۔

اور جن مفسرین نے روایات نقل کیے ہیں اس سے متعلق جیسے ابن جریر طبری اور علامہ جلال الدین سیوطی رحمھما اللہ نے اگر وہ صحیح بھی ہو تب بھی روح المعانی میں علامہ آلوسی نے محققین کی جانب سے اس کا جواب نقل کیا ہیں کہ سند کے صحیح ہونے سے واقعہ کی صحت پر استدلال قائم نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ ہوسکتا ہے سند صحیح ہو مگر واقعہ فی نفسہ درست نہ ہو۔

آخر میں علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ (774ھ) کا قول جسے اگر فیصل قول قرار دیا جائے تو بجا ہوگا اور خود راقم اثیم علامہ ابن کثیر رح کے موقف کو پسند کرتا ہے اور اسی کو لیتا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ:

'' وَقَدْ رَوَى فِي قِصَّةِ هَارُوتَ وَمَارُوتَ عَنْ جَمَاعَةٍ مِنَ التَّابِعِيْنِ، كَمُجَاهِدٍ وَالسُّدِّيِّ وَالْحَسَنِ [الْبَصرِيِّ]وَقَتَادَةَ وَأَبِي الْعَالِيَةِ وَالزُّهْرِيِّ وَالرَّبِيعِ بْنِ أَنَسٍ وَمُقَاتِلِ بْنِ حَيَّانَ وَغَيْرِهِمْ، وَقَصَّهَا خَلْقٌ مِنَ الْمُفَسِّرِينَ مِنَ الْمُتَقَدِّمِينَ وَالْمُتَأَخِّرِينَ، وَحَاصِلُهَا رَاجِعٌ فِي تَفْصِيلِهَا

إِلَى أَخْبَارِ بَنِي إِسْرَائِيلَ، إِذْ لَيْسَ فِيهَا حَدِيثٌ مَرْفُوعٌ صَحِيحٌ مُتَّصِلُ الْإِسْنَادِ إِلَى الصَّادِقِ الْمَصْدُوقِ الْمَعْصُومِ الذِي لَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَى، وَظَاهِرُ سِيَاقِ الْقُرْآنِ إِجْمَالُ الْقِصَّةِ مِنْ غَيْرِ بَسْطٍ وَلَا إِطْنَابٍ فِيهَا، فَنَحْنُ نُؤْمِنُ بِمَا وَرَدَ فِي الْقُرْآنِ عَلَى مَا أَرَادَهُ اللَّهُ تَعَالَى، وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِحَقِيقَةِ الْحَالِ''

تفسیر ابن کثیر بحث تحت هذه الآية)

''تحقیق روایت بیان کیا ہیں ہاروت و ماروت کے بارے میں تابعین کی جماعت میں سے کچھ لوگوں نے، جیسے مجاہد، سدی، حسن (بصری) قتادہ، ابوالعالیہ، زہری، ربیع بن انس، مقاتل بن حیان وغیرھم۔ اور متقدمین ومتاخرین مفسرین میں سے کئی لوگوں نے اس قصہ کو بیان کیا ہیں، خلاصہ یہ ہے کہ ان سب کا ماخذ و تفصیل بھی اسرائیلی خبریں ہیں، اس لئے اس بارے میں کوئی صحیح مرفوع حدیث نہیں ہیں جس کی سند متصل ہو اس سچے اور پاکباز اور معصوم شخص تک جو اپنی طرف سے کچھ نہیں بولتا، اور قرآن کی آیت سے اجمال قصہ ظاہر ہوتا ہے، نہ اس میں تفصیل ہے اور نہ تطویل، پس قرآن میں جس طرح واقع ہے ہم اسی طرح اس پر ایمان لاتے ہیں اس سے اللہ کی مراد جو بھی ہو، اور اس کی حقیقت اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔''

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے حرف آخر کہہ دیا، اس کے بعد مزید اس بحث میں الجھنا مناسب نہیں، قرآن میں جیسا اللہ نے فرمایا ہیں ہمارا اس پر ایمان ہیں، باقی حقیقت حال اور اللہ کی مراد جو بھی ہو ہمیں اس سے غرض نہیں، کیونکہ قرآن تاریخ کی کتاب نہیں کہ ہر واقعہ کو بیان کر کے تحقیق اور تاریخ بھی بیان کریں۔

واقعہ کوہ طور:

مصنف نے کوہ طور کے واقعہ کو بھی پیش کیا ہے، سورۃ الاعراف کی آیت نمبر 171 اور جلالین کے حوالے سے واقعہ پیش کیا ہے کہ:

> ''خدا نے کوہ طور سینا کو اس کی بنیادوں سے اوپر اٹھا دیا اور اسے بیابان میں بنی اسرائیل کے سروں پر اٹھائے رکھا تاکہ اگر وہ احکام توریت کی پابندی نہ کریں تو وہ پہاڑ گرا کر انہیں کچل دیا جائے۔ انہوں نے اس سے پیشتر احکام توریت ماننے سے انکار کر دیا تھا کیونکہ وہ احکام سخت زیادہ تھے۔ مگر جب خدا کی طرف سے ان کو یہ تہدید (تنبیہہ) کی گئی تو انہوں نے توریت کو قبول کر لیا''۔

اور سورۃ البقرہ کی آیت نمبر 63 میں بھی اس کی تفسیر موجود ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب تورات لے کر آئے تو انہوں نے دیکھا کہ کچھ احکام سخت ہے تو بہانے تراشنے شروع کیا اور پہلے تو کہا ہم خود اللہ کو دیکھیں کہ وہ بذات خود ہمیں ان احکام کا حکم دے، پھر جب حضرت موسیٰ نے ان کا یہ کہنا مان لیا اور کہا اپنے اندر سے 70 آدمی چن لو، اور ان کو کوہ طور پر لے گیا، وہاں اللہ نے خود ان کو احکام ماننے کا حکم دیا۔ اب یہ واپس آکر بیان کیا کہ حقیقت میں اللہ نے حکم تو دیا مگر ایک بات اپنی طرف سے ملا کر کہا کہ اللہ نے یہ بھی فرمایا کہ جس حکم پر تم عمل کر سکتے ہو کرو جو سخت ہو اس کو چھوڑو۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے کوہ طور ان کے سروں پر بلند کر دیا کہ تورات کے تمام احکام کو تسلیم کرو، جب انہیں یہ اندیشہ ہوا کہ کہیں پہاڑ ان پر گرا نہ دیا جائے تب ان لوگوں نے تورات کو ماننے اور اس پر عمل کرنے کا عہد کیا۔

سورۃ البقرہ اور الاعراف کی مذکورہ آیت سے اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہیں۔ مصنف نے اسی سے مشابہت واقعہ یہودی کتاب سے پیش کیا ہے، پھر آگے اس کو یہودی غلطی شمار کر کے جھوٹی اور من گھڑت روایت کہا ہے، مگر بات وہی ہے روایت صحیح ہو یا غلط دنیا کی تاریخ میں

موجود ہو یا نہ ہو، کسی مذہب میں ہو یا نہ ہو، قرآن نے جو بیان کر دیا وہی حقیقت ہے، اس پر ہم نے بحث کیا ہے۔ کیونکہ اگر قرآن یہودی کتب کا ماخذ ہوتا تو لازمی طور پر ہر وہ بات جو یہودی کتب میں موجود ہیں وہ قرآن میں بعینہ موجود ہوتا، یا بعینہ نہیں تو کم از کم اس کی تائید اور اثبات ہوتا، مگر ہم دیکھتے ہیں بعض باتیں یہودی کتب میں اثبات کے ساتھ موجود ہیں جب کہ قرآن اس کی نفی بیان کرتا ہیں اور بعض باتیں وہاں منفی ہوتے ہیں قرآن اس کا اثبات بیاں کرتا ہیں۔ جیسے حضرت سلیمان علیہ السلام کا واقعہ یہود میں وہ جادوگر اور بتوں کی پوجا کرنے والا گردانا جاتا تھا، مگر قرآن نے واضح اس کی تردید کردی کہ حضرت سلیمان علیہ السلام ایسا نہیں تھا۔ لہذا اگر یہ کلام واقعی رسول اللہ نے یہودیوں سے لیا ہے تو اثبات ونفی کا مسئلہ یہاں نہ ہوتا۔ بلکہ جیسے یہودی کتب میں موجود ہوتے ویسے نقل کرتے۔

اور اس کی دوسری دلیل خود مصنف کا اپنا قول ہے جو انہوں نے اس بحث کے آخر میں پیش کیا ہے، چنانچہ مصنف اسی طرح کا ایک واقعہ ہندو روایت پیش کرنے کے بعد جو تبصرہ کرتا ہے وہ ملاحظہ فرمائے:

> ''پہاڑ کے اٹھانے کا قصّہ ایک ہندو روایت میں بھی پایا جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ''جب سری کرشن جی مہاراج نے اپنے وطن گوکل کے لوگوں کو ایک شدید طوفان بادو باراں سے محفوظ رکھنا چاہا تو انہوں نے دنیا کا سب سے بڑا پہاڑ جس کا گوبردھن تھا جڑ سے اکھاڑ لیا اور اسے چھتری کی طرح اپنے ہاتھ کی انگلیوں کے سروں پر سات دن تک لوگوں کے سروں پر تھامے رکھا''۔ ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ یہودیوں نے یہ روایت ہندوؤں سے لی ہے، لیکن قرآن میں جو حصہ درج ہے وہ ضرور یہودیوں سے لیا گیا ہے۔''

قطع نظر یہودی روایت کی کہ وہ کہا تک درست ہے اور کیا یہ واقعہ قرآن یا یہودی واقعہ کے متبادل یا مشابہت بن سکتا ہے، یہ قارئین خود پڑھ کر اندازہ لگائے۔ ہم صرف محل استشہاد پر آتے ہیں یہاں پر آخر میں مصنف نے جو کہا کہ ''ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ یہودیوں نے یہ

روایت ہندوؤں سے لی ہے، لیکن قرآن میں جو حصہ درج ہے وہ ضرور یہودیوں سے لیا گیا ہے۔'' خود مصنف اپنے دعویٰ کے دھجیاں بکھیر رہے ہیں، اور بالکل مثل مشہور'' اپنے پاؤں پر آپ کلہاڑی مارنا'' کو اپنے اوپر چسپاں کردیا۔ کیونکہ جب ہندو روایت بقول مصنف یہودی روایت سے ملتا جلتا ہے تو پھر کیسے اس کا انکار کر کے یہ کہتے ہو کہ ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہودیوں نے یہ روایت ہندوؤں سے لی ہیں، قرآن کا کوئی واقعہ اگر یہودی کتب میں موجود کسی واقعہ سے ملتا جلتا ہے وہاں آپ فورا کہتے ہو کہ یہ تو یہودیوں سے لیا گیا ہیں۔ مگر یہاں تو یہ اصول خود توڑ رہے ہیں، اس لئے ہم کہتے ہیں کہ کس بنیاد پر قرآن کا واقعہ یہودیوں سے لیا گیا ہیں اور یہودیوں کا واقعہ ہندوؤں سے نہیں لیا گیا ہیں؟ آپ کے اصول کے مطابق یہودیوں نے یہ روایت ہندوؤں سے لیا ہیں مگر آپ اس کے انکار کر رہے ہیں، آپ کے پاس اس کا پیمانہ کیا ہے؟ کس بنیاد پر قرآن میں اگر ایسا واقعہ نقل ہو جو اس سے پہلے کسی مذہب میں ہو تو قرآن کا ماخذ وہی قرار پاتا ہے مگر جب ہندو مذہب میں ایسا کوئی ہو یا یہودی مذہب میں تو وہ ایسا نہیں ہے؟

مصنف کے اس جملے سے ہماری اس بات کی بھی تائید ہوتی ہے کہ مماثلت یا مشارکت سے ماخذ ثابت نہیں ہوتا، اگر ثابت ہوتا تو مصنف یہاں یہودیوں کے بارے میں بھی وہی حکم لگا لیتا جو قرآن پر لگا رہا ہیں۔ مگر بات صرف اور صرف حسد، بغض، تعصب کی ہے جس کا کوئی علاج نہیں۔ مصنف سے پہلے جس وقت کلام اللہ رسول اللہ پر نازل ہو رہا تھا اس وقت یہودی رسول اللہ کو بہت خوب جانتے تھے کہ یہ اللہ کا رسول ہے اور ان کی نشانی ہماری کتاب میں موجود ہیں، مگر صرف بغض اور حسد کی وجہ سے ماننے سے انکار کرتے۔ یہی حال مصنف و دیگر معترضین کا ہیں، یہ بخوبی جانتے ہیں قرآن برحق ہیں محض تعصب کی بناء پر انکار کرتے ہیں، اگر غلط فہمی کی بنیاد پر ہوتا تو اب تک ان کے جتنے اعتراضات ہیں سب کا جواب دیا جا چکا ہیں اس کے بعد ان کو تسلیم کر لینا چاہیے تھا، مگر بجائے تسلیم کی بات کو گول کرنا یہ بنی اسرائیل کا خاصہ ہیں جس کے

اثرات آج تک مصنف کی عبارت میں دکھائی دے رہی ہیں۔

قصہ سامری اور مصنف کی جہالت وحماقت وتضاد:

مصنف بیچارہ خود اپنی باتوں کا قیدی بن گیا ہیں، ایک بات کہتے ہیں دوسرے سے کاٹتے ہیں، کب کیا کہا، کیا لکھا خود بھول جاتے ہے مجھے تو ان کی عقل پر نہیں حافظے پر افسوس ہوتا ہے، مگر سچ ہے کہ ع

دروغ گو را حافظہ نباشد

میں خود حیران ہوں مصنف کی حماقت پر بات کروں یا جہالت پر یا تضاد بیانی پر، موصوف اس مضمون میں تینوں کے مرتکب ہو چکے ہیں۔

سامری اور بچھڑے کا قصہ موصوف نے نقل کیا ہے، دراصل سامری حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم میں ایک منافق تھے بظاہر ایمان لائے تھے، اور جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کوہ طور پر چلے گئے تو اس نے ایک بچھڑے جیسے مورتی بنائی، پھر اس سے آواز آئی، آواز کیسی آئی اس کی کیفیت اللہ ہی بہتر جانتا ہے، مگر بعض کہتے ہیں کہ ہوا کی وجہ سے اس میں آواز پیدا ہوگئی، بہر حال آواز جیسے بھی ہو مطلب کچھ آواز اس سے نکل گئی، اور پھر قوم کے لوگوں کو کہا کہ اصل میں تمہارا معبود تو یہ ہے موسیٰ بھول کر وہاں چلے گئے ہیں، اور قوم نے اس کی عبادت شروع کی، جب حضرت موسیٰ علیہ السلام واپس آ گئے تو قوم کو اس حال پر دیکھ کر حضرت ہارون علیہ السلام کو ڈانٹا کہ آپ نے کیسے چھوڑ دیا اور پھر سامری کو سرزنش اور سزا دی۔

مصنف نے جو واقعہ ''پرکی دے ربی الیزر'' (Pirke De-Rabbi Eliezer) سے پیش کیا ہے جس میں یہ ذکر ہے کہ بچھڑے سے آواز سمائیل نے نکالی جو اس میں پوشیدہ تھی، اور سمائیل یہودیوں کے ہاں ایک فرشتے کو کہتے ہیں گویا ان کے نزدیک اس میں ایک فرشتہ پوشیدہ تھا جس سے آواز نکال رہا تھا، مگر یہ من گھڑت اور غلط ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ ”پر کی دے ربی الیزر“ اسلام کے بعد مدون اور مرتب کیا گیا ہیں، اور بائبل میں ایسا واقعہ موجود نہیں ہے، بلکہ وہاں کچھ اور ہے جس کا آگے ہم ذکر کریں گے۔ جب یہ کتاب بعد میں مرتب ہوئی تو کیسے کہا جاتا ہے کہ یہ واقعہ یہودی ماخذ ہے۔ بلکہ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اس کتاب میں بائبل و دیگر یہودی کتب کی جو تفسیر پیش کیا گیا ہیں ان میں اسلامی واقعات سے بھی مدد لیا گیا ہے۔

دوسری بات اس وقت راقم کے پاس مذکورہ یہودی کتاب نہیں ہے جس سے واقعات کی جانچ پڑتال کرے، ممکن ہے جب تک میں یہ کتاب مکمل کروں (ان شاءاللہ) تو یہ کتاب مجھے کہی سے مل جائے، مگر اس وقت میں صرف ایک سوال چھوڑ کر آگے جاتا ہوں۔ مصنف نے جو واقعہ مذکورہ یہودی کتاب سے پیش کیا ہے، میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ بچھڑہ کس نے بنایا؟ اور مذکورہ کتاب میں اس سے متعلق کیا واقعہ ہے؟ اگر بچھڑہ بنانے والے کا نام حضرت ہارون علیہ السلام ہے (معاذ اللہ) بقول تورات تو یہ واقعہ رسول اللہ نے یہودی کتاب سے نہیں لی، کیونکہ اگر وہاں سے لیتا تو ضرور رسول اللہ بھی یہی کہتا کہ بچھڑہ حضرت ہارون نے بنایا۔ حالانکہ قرآن میں ہے کہ بچھڑہ سامری نے بنایا۔ لہذا ثابت ہوا کہ رسول اللہ نے یہ واقعہ یہودی کتب سے نہیں لیا۔

اور اگر کوئی کہے کہ بائبل سے محمد نے نہیں لیا ہے بلکہ ”پر کے دے ربی الیزر“ سے لیا ہے جیسا کہ مصنف کا خام خیال ہے، اور چونکہ مذکورہ یہودی کتاب میں سامری کے بجائے سمائیل کا لفظ آیا ہے تو مصنف اپنے ترکش سے آخری تیر نکال کر یوں چلاتے ہے کہ سامری سمائیل کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔ جب کہ یہودی کتاب میں ایسا کچھ بھی نہیں ہے کہ سمائیل نے بچھڑہ بنایا۔

حیف باشد مصنف کے عقل اور دماغ پر، اس پر بجز اس کے اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ ع

برین عقل و دانش بباید گریست

ملاحظہ فرمائیں کتاب کی عبارت جو مصنف نے پیش کیا ہیں:

''وہ گوسالہ ڈکارتا ہوا نکلا اور بنی اسرائیل نے اسے دیکھا۔ربی یہوداہ کا قول ہے کہ اس گوسالہ کے اندر سمائیل پوشیدہ تھا اور وہی ڈکار رہا تھا تا کہ بنی اسرئیل کو دھوکا دے''۔(پر کے دے ربی الیزر)

مصنف خود تو اپنے کئے کا سزا کاٹنے چلے گئے ہے اس دنیا سے،اس کے حواری اگر اس دنیا میں موجود ہیں تو غور کریں اس عبارت پر اور اگر نظر نہیں آتا تو عینک لگا کر ایک مرتبہ نہیں دس مرتبہ پڑھے۔اور اپنے آقا کے عقل پر ماتم کرے، مصنفین میں جاہل تو بہت دیکھے مگر ایسے جاہل بلکہ جاہل مرکب سے پہلی مرتبہ واسطہ پڑ رہا ہے،جس کو پتہ بھی نہیں میں کیا لکھ رہا ہوں،فضول میں اتنے صفحات سیاہ کئے ہیں ۔اگر مسئلہ خداوند عالم کی کتاب اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کا نہ ہوتا،تو اس جیسے احمق کے ان صفحات کا جواب لکھ کر کون اپنی قیمتی وقت ضائع کرتا۔ اللہ میری قلم کو طاقت صبر دے۔

یہودی کتاب میں یہ موجود ہے کہ سمائیل (فرشتہ) اس بچھڑے میں پوشیدہ تھا اور وہی آواز نکال رہا تھا،مگر اس کمبخت مصنف نے اس کو اس بات پر چسپاں کر دیا کہ قرآن میں جو واقعہ موجود ہے سامری کے بچھڑے بنانے کا یہ سامری وہی سمائیل کی بگڑی ہوئی صورت ہے ۔ یہودی کتاب میں تو یہ نہیں ہے کہ بنانے والا سمائیل ہے،اور خود مصنف بھی یہی کہتا ہے کہ بنانے والا سمائیل نہیں ہے،اگر وہاں یہ ہوتا کہ بنانے والا سمائیل تھا تو مصنف کا مستدل درست ہوتا۔ مگر وہاں تو بنانے والے کا تذکرہ ہی نہیں پھر کیسے یہ سامری سمائیل کی بگڑی ہوئی صورت بنی اور بچھڑہ بنایا۔عقل نام کی کوئی چیز ہے بھی کہ نہیں۔

اور اگر کوئی عقل سے یتیم یہ کہے کہ رسول اللہ جانتا تھا اگر مکمل واقعہ بعینہ نقل کروں تو لوگ کہیں گے بائبل سے لیا ہے، یا پھر کسی اور وجہ سے تبدیلی کی ، تو اس جیسے کم فہم اور نادان کے

لئے سوائے مصنف کے اس عبارت کے اور کچھ نہیں کہہ سکتے:

''اگر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم روایات بائبل سے زیادہ واقف ہوتے تو ان کو معلوم ہوتا کہ گوسالہ طلائی کا بنانے والا ہارون تھا اور بائبل میں نہ ''سمائیل'' کا کوئی ذکر پایا جاتا ہے، نہ ''سامری'' کا۔''

جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو روایات بائبل سے واقفیت ہی نہیں تھی تو دونوں باتوں کا رد ہو گیا، ایک یہ کہ محمد نے یہ واقعہ یہودیوں سے لیا ہے، دوسرا یہ کہ لوگوں کے کہنے کی وجہ سے، دونوں کا رد اس میں ہو گیا کہ محمد تو ان روایات سے واقف ہی نہیں تھی پھر ماخذ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اور یہ بھی مصنف کی صریح تضاد ہے ایک طرف کہتے ہیں محمد نے فلاں بات بائبل سے لی ہے اور وہ اس کو پڑھنا جانتا تھا، پھر دوسری طرف کہتے ہیں کہ محمد روایات بائبل سے واقف نہیں تھے۔مصنف نے تو زیادہ واقف ہونے کی بات کی ہے، یعنی اگر محمد روایات بائبل سے زیادہ واقف ہوتے تو ایسے کرتے۔۔۔۔ہوسکتا ہے کسی کو شبہ ہو کہ مصنف نے زیادہ کی بات کی ہے کہ زیادہ واقف ہوتے، اس کا مطلب زیادہ تو نہیں البتہ کچھ نا کچھ واقف تھے۔تو عرض ہے کہ کچھ نا کچھ بھی واقف نہیں تھے۔ اس لئے بقول آپ کے کچھ نا کچھ واقف تھے تو ظاہر ہے بقول تمہارے وہی کچھ قرآن میں نقل کیا ہے، مگر یقین جانے پھر بھی بائبل سمیت جن واقعات کو مصنف نے اب تک پیش کیا ہیں یا کرے گا، سب میں قرآن کا انداز بیان اور واقعہ الگ ہیں، البتہ کچھ باتوں میں موافقت ضرور ہے مگر واقعہ ایک جیسا نہیں۔اگر وہی کچھ محمد بائبل سے لیتا تو اختلاف نہ ہوتا۔اس لئے یہ کہنا کہ کچھ نا کچھ واقف تھے یہ بھی غلط ہے۔

کاش مصنف اپنے قلم کو روک دیتا تا کہ مزید تضاد بیانیوں کا شکار نہ ہوتا، مگر مثل مشہور ہے کہ

بے حیاء باش و ہر چیز خواہی کن

گویا یہ مثل مصنف جیسے بے حیاء لوگوں کو دیکھ کر ہی بنایا گیا ہے۔آگے مصنف ایک اور

متضاد مسئلہ چھیڑتا ہے، چنانچہ لکھتے ہیں کہ:

''سامری کا لفظ استعمال کرنے کی ایک وجہ اور یہ بھی ہوسکتی ہے کہ محمد ﷺ جانتے تھے کہ یہودی قوم سامریوں سے نفرت کرتی ہے۔(کیونکہ گوسالہ سامری نے بنایا تھا) اور ممکن ہے انہوں نے کہیں یہ بھی سن لیا ہو کہ یربعام (Jeroboam) نے جو بعد میں سامریہ کا بادشاہ کہلایا، یہودیوں سے گوسالاؤں کی پرستش کرائی تھی۔لیکن لطف یہ ہے کہ جس زمانہ میں گوسالہ کا بنانا ظاہر کیا جاتا ہے اس وقت تک شہر سامریہ آباد بھی نہ ہوا تھا اور غالباً موسیٰ سے کئی سو برس بعد تک اس کا نام بھی یہ نہ رکھا گیا تھا۔اس لئے یہ تاریخی غلطی اور زیادہ دلچسپ ہے''

ہمیں تو اس سے کوئی سروکار نہیں کہ یہودیوں اور سامریوں کے مابین کیا ہوا تھا دونوں ایک دوسرے کے دشمن تھے یا دوست، اور یربعام نے یہودیوں سے بچھڑوں کی پرستش کرائی تھی یا نہیں، اور سامریہ کب آباد ہوا، سامریہ نام کا کوئی شہر ہے یا نہیں۔ یہ تاریخی موضوعات ہیں۔مگر یہاں گویا مصنف یہ کہنا چاہتا ہے کہ رسول اللہ نے سامری کا لفظ یہودیوں کی خاطر استعمال شروع کیا، کیونکہ یہودی سامریوں سے نفرت کرتی ہے۔مگر اس جھوٹے اور کذاب کو پھر اپنی بات بھول گئی، ماقبل میں ہم نے عبارت پیش کیا ہے مصنف کی جس میں وہ کہتا ہے کہ بچھڑے کو بنانے والا ہارون تھا، مگر یہاں کہتا ہے کہ سامری تھا۔مصنف کی عبارات میں تضاد ہی تضاد ہے
۔

اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہودیوں کی خاطر سامری کا لفظ استعمال کیا تو کیا ہی اچھا تھا کہ سامری کے بجائے ہارون کا ذکر کرتے۔کیونکہ بائبل میں تو بچھڑہ بنانے والا ہارون کا نام ہے، چنانچہ بائبل عہد قدیم خروج باب 32 میں ہے جس کا ماحصل یہ ہے:

''جب حضرت موسیٰ پہاڑ پر گئے۔تو لوگ پریشان ہو گئے اور ہارون سے کہا کہ ہمیں کوئی "خدا" بنا دے -ہارون نے ان سے سونا مانگا (عورتوں کے زیورات وغیرہ) -اور

سونے کو پگھلا کر ایک بچھڑے کی مورت بنائی۔ پھر لوگوں نے اس کی پوجا کی“

(خروج باب 32 ص/ 131)

مصنف کا یہ کہنا سراسر غلط ہے کہ رسول اللہ یہودیوں کی خاطر سامری کا لفظ استعمال کیا۔ اگر یہودیوں کی خاطر یہ لفظ استعمال کرتا تو اس سے اچھا تھا وہی لفظ استعمال کرتا جو اس سے پہلے بائبل میں موجود تھا، مگر ایسا نہیں ہے، اور پھر قرآن میں متعدد مقام پر یہ ارشاد ہے کہ قرآن مجید ماقبل کتابوں کی تصدیق وتائید کرتا ہے۔ اگر ایسی بات ہوتی تو یہودی جو رسول اللہ کے دشمن تھے ، بہانہ ڈھونڈتے تھے کہ کلام اللہ میں کوئی نقص نکالے کچھ اعتراض کرے۔ وہ سب سے پہلے یہ اعتراض کرتے کہ آپ ایک طرف کہتے ہو کہ یہ کلام پچھلی کتب کی تصدیق کرتی ہیں، مگر یہاں خود ایسے واقعات بیان کرتے ہو جو ہماری کتاب کے مختلف ہیں۔ وہاں کچھ اور ہے یہاں کچھ اور۔ مگر ہم دیکھتے ہیں ایسا اعتراض ہمیں نہیں ملتا۔ اور اس کے علاوہ یہ بات غلط ہے کہ اپنے مخالف کے دشمن کے ذم بیان کرنے سے وہ خوش نہیں ہوتا بلکہ خود ان کے اور ان کے بڑوں کی باتوں کی تصدیق کرنے سے وہ خوش ہوتا ہے۔ اگر محمد ان کی خاطر یا ان کو خوش کرنے کی خاطر سامری کا لفظ لایا جن سے یہودی نفرت کرتی ہے، تو بجائے اس کے وہ لفظ لاتا جو بائبل میں موجود ہے اس سے یہ زیادہ خوش ہوتے نہ کہ دشمن کے ذم بیان کرنے سے۔

خدا کا مشاہدہ:

خدا کے مشاہدے کے حوالے سے مصنف نے اس آیت سے ملتا جلتا کوئی واقعہ یہودی کتاب سے پیش کیا ہے، قرآن میں ہے کہ بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ سے کہا کہ اے موسیٰ ہم تجھ پر اس وقت تک ایمان نہ لائیں گے جب تک ہم خدا کو صاف طور سے نہ دیکھ لیں گے تو ان پر ایک بجلی گری اور وہ مر گئے۔ مگر بعد میں اللہ نے انہیں پھر زندہ کر دیا۔

اس سے متشابہ ایک واقعہ پیش کیا ہے۔ اس جیسے واقعات کا جواب ماقبل عرض کیا جا چکا ہے،

مزید یہاں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جب نفس الامر اور خارج میں یہ واقعہ پیش آیا ہے، اور قرآن اس کی تصدیق کر رہا ہے، خود قرآن کہتا ہے کہ یہ کتاب پچھلی کتابوں کی تصدیق و تائید کرتا ہے، تو ماخذ کا سوال کہا سے پیدا ہوتا ہے۔

آیئے ذرا تفصیل سے قرآن کی آیت پر غور کرتے ہیں۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے کئی مقامات پر پچھلی کتابوں کے بارے میں فرمایا کہ '' وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ '' کہ یہ کتاب پچھلی کتابوں کی تصدیق کرنے والی ہیں۔ اگر یہ قرآن پچھلی کتابوں سے ماخذ ہوتا تو قطع نظر اس بات سے کہ واقعات ایک جیسے ہوتے بغیر اختلاف کے جیسے وہاں تھے ویسے یہاں ہوتے مگر ایسا نہیں اس بات سے ہم قطع نظر کر کے صرف قرآن کی آیات پر غور کریں تو مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ '' مَأْخُوذٌ لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ '' یا یہ '' مَصْدَرٌ لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ '' بلکہ " مصدقا" کا لفظ استعمال کیا کہ یہ کتاب پچھلی کتابوں کی تصدیق کرنے والی ہے۔ اب تصدیق کیسے ہوگی، ظاہر ہے کسی چیز کی تصدیق کا سوال اس وقت پیدا ہوگا جب اس شئی کے بارے میں تردد میں ہو کہ یہ صحیح ہے یا غلط۔ جب آپ کو یقین ہوا تو آپ تصدیق کریں گے ورنہ تکذیب۔ تو کفار بھی تردد میں تھے، حیران تھے کہ اب اصل بات ہے کیا چیز؟ کیونکہ تورات اور انجیل میں اتنے زیادہ تحریفات ہوئی تھیں اب اصل بات کا اندازہ لگانا مشکل ہوا تھا، اور اس کے علاوہ پیغمبران خدا کے بارے میں عجیب نظریات و خیالات کیا جاتا تھا کبھی ان کو معاذ اللہ زانی کہتے کبھی بت پرست تو کبھی بت بنانے والا، غرض اس جیسے خرافات بہت تھے، اس کے علاوہ دیگر معاملات کا بھی یہی حال تھا، تو ان سب خرافات و نظریات اور دین فطرت کو اللہ تعالیٰ نے ان کو سمجھانا تھا تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سمجھایا، اور ان پر قرآن کا نزول ہوا۔ اور جو باتیں اور خرافات ان میں موجود تھے جن میں ملاوٹ کیا گیا تھا کچھ تو صحیح تھے یعنی واقعہ کچھ اسی طرح تھا جیسے قرآن میں ہے مگر اس میں ملمع

سازی بہت کیا گیا تھا، اس لئے قرآن نے اصل واقعات اور دین فطرت بتادی۔ تو یہ کہنا کہ یہ وہاں سے لیا ہے سراسر جہالت پر مبنی ہے، کیونکہ ماخذ تب ہوتا جب بعینہ وہی واقعات یا باتیں رسول اللہ نقل کرتے یا بتاتے۔ لیکن جب ہم دیکھتے ہے کہ قرآن میں کچھ اور ہے عہد نامہ قدیم وجدید میں کچھ اور۔ تو نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ یہ الہامی کتاب ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اول واقعات اور حقائق ونکات ومعجزات پر مشتمل ہے۔ اس لئے پچھلی کتابوں میں جہاں تحریف ہوئی ہے یا واقعہ کو غلط انداز میں پیش کیا گیا ہیں تو قرآن نے اصل اور صحیح واقعات بیان کر دیا۔ اور اس میں مشابہت اور اختلاف کا ہونا ایک لازمی اور بیّن امر ہے، اس سے کسی کو انکار نہیں۔

لوح محفوظ:

مصنف نے ''لوح محفوظ'' کے بارے میں بھی چہ میگوئیاں کی ہے، اس کا بھی مختصر جائزہ لیتے ہیں۔

لوح محفوظ یعنی محفوظ تختی جس میں روز اول سے انتہاء تک عالم جہاں میں جس کچھ ہونے والا ہے یا ہوگا ان سب کی حالت اس میں درج ہے، اب اس کی حقیقت کیا ہے اور کہاں واقع ہے، یہ اللہ ہی کو بہتر معلوم ہے۔

آغاز بحث میں فاضل مصنف نے سورۃ الانبیاء کی ایک آیت پیش کی ہے، جس سے استدلال یا پھر بطور سوال یہ بات کی ہے کہ، جب قرآن لوح محفوظ میں ازل سے موجود تھا تو مسلمان زبور کو کیوں اتنا قدیم نہیں مانتے۔ چنانچہ مصنف لکھتے ہیں کہ:

> ''تمام مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ قرآن مجید آفرینش عالم سے پہلے بھی بہت پہلے ''لوح محفوظ'' پر لکھ دیا گیا تھا۔ یہ عقیدہ ان کا سورۂ انبیا کی اُن آیات کی بنا پر ہے جہاں قرآن مجید کو لوح محفوظ پر لکھا ہونا بیان کیا گیا ہے۔ مگر حیرت کی بات ہے کہ مسلمان زبور کو کیوں اتنا ہی قدیم نہیں مانتے حالانکہ اسی سورۂ انبیا میں لکھا ہے کہ ''وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ

مِن بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ ''۔''یعنی یقیناً ہم نے زبور کولکھ دیا تھا بعد ذکر کے کہ جہاں تک زمین کا تعلق ہے، میرے نیک بندے زمین کے وارث ہوں گے''۔اس آیت کا اشارہ زبور داؤد ۲۹:۷ ۳ کی طرف جس میں ظاہر کیا گیا ہے''صادق زمین کے وارث ہوں۔''

مذکورہ آیت کے متعلق مفسرین کرام کے مختلف آراء ہیں ، علامہ ابن جریر الطبری (310ھ) نے مختلف اقوال نقل کیے ہیں، پہلا قول یہ ہے کہ زبور سے مراد تمام انبیاءعلیہم السلام کی کتب ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ان پر نازل فرمایا، اور''الذکر'' سے مراد لوح محفوظ ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ زبور سے مراد وہ کتب ہیں جو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کے بعد نازل فرمایا اور الذکر سے مراد تورات ہے۔

تیسرا قول یہ ہے کہ زبور سے مراد وہی زبور مراد ہے جو حضرت داؤد علیہ السلام پر نازل ہوا، اور الذکر سے مراد تورات ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوا۔ (تفسیر ابن جریر طبری تحت ھذہ الآیۃ)

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ (774ھ) نے حضرت عبد الرحمن بن زید بن اسلم کا قول نقل کیا ہے کہ الزبور سے مراد وہ کتب ہیں جو انبیاءعلیہم السلام پر نازل ہوئیں اور الذکر سے مراد ام الکتاب (یعنی لوح محفوظ) جس میں تمام چیزوں کا بیان لکھ دیا۔

(تفسیر ابن کثیر تحت ھذہ الآیۃ)

اس کے علاوہ اور بھی اقوال ہیں قارئین کرام کتب تفسیر کی جانب مراجعت کر سکتے ہیں، ہم یہاں جواب کے حد تک اقوال نقل کیے ہیں۔

مصنف کا جواب اسی آخری قول میں ہے جو ابن جریر طبری کے نزدیک مختار اور راجح ہے، اس لئے مذکورہ آیت میں زبور سے مراد وہ کتب جو انبیاءعلیہم السلام پر نازل ہوئے اور اس میں

تورات، زبور، انجیل، قرآن مجید سب آجاتے ہیں، اور الذکر سے مراد لوح محفوظ ہیں، یعنی یہ سب لوح محفوظ میں پہلے لکھتے جا چکے ہیں، سب محفوظ ہیں۔ لہذا یہ بات کہ سچے لوگ زمین کے وارث ہوں گے ہر کتاب میں موجود ہے، بشمول قرآن مجید کے۔ خود مصنف نے زبور سے بھی ایک آیت پیش کیا ہے اس کے علاوہ دیگر میں بھی موجود ہے۔ انجیل متی میں ہے کہ:

''مبارک ہے وہ جو حلیم ہیں، کیونکہ وہ زمین ورثے میں پائیں گے''

(مجموعہ کتاب مقدس انجیل متی 5/5 ص/1314)

رہی بات زبور کو قدیم ماننے کی تو نہ جانے مصنف کی مراد اس سے کیا ہے کہ مسلمان اسے قدیم نہیں مانتے؟ ہم تو مانتے ہیں کہ جتنے بھی کتب سماوی ہے وہ اللہ تعالی کا کلام ہیں اور قدیم ہے اور سب اللہ کے ہاں محفوظ ہیں۔

آگے مصنف نے اسی پر کلام کیا ہے کہ اگر قرآن لوح محفوظ میں ہے تو اس سے پہلے تو بائبل ہے یعنی تورات انجیل وغیرہ تو مسلمانوں کا یہ کہنا کہ قرآن لوح محفوظ میں ہے اللہ کے ہاں اس کا کیا مطلب حالانکہ اس سے پہلے تو بائبل ہے تو پہلے تو وہ منقوش ہوں گے۔

اس کا جواب ماقبل آیت کی تفسیر میں گزر چکا ہے کہ جتنے بھی آسمانی کتب ہے وہ اللہ کے ہاں محفوظ ہیں۔ قرآن مجید بھی اور دیگر کتب سماوی بھی۔ اور یہ شبہ بھی نہیں ہونا چاہیے کہ جب اللہ کے ہاں محفوظ ہے پھر تم لوگ کیوں کہتے ہو کہ ان میں تحریف ہوئی ہے؟ تو عرض ہے کہ کلام کا معنی و مفہوم اللہ کے ہاں محفوظ ہے باقی نقوش اور الفاظ ان میں تحریف ہوئی ہے نہ کہ اصل کلام میں۔ کیونکہ اس میں تو سوائے اللہ کے اور کون تبدیلی کر سکتا ہے۔

اس کے بعد مصنف نے لوح محفوظ کے بارے میں ''قصص الانبیاء'' نامی کتاب سے لوح محفوظ کے متعلق روایات نقل کی ہے، جس کے بارے میں پہلے ہم نے کہا تھا کہ وہ غیر مستند ہیں، اس میں ضعیف اور اسرائیلی روایات ہیں۔ اور لوح محفوظ کے بارے میں اگر چہ مفسرین کرام

نے روایات نقل کی ہیں، مگر صحیح بات یہ ہے کہ اس کی کیفیت اللہ ہی جانتا ہے اور اس میں سب کچھ درج ہے ۔اس کے علاوہ روایات میں اس کی نشان دہی کی گئی ہیں اور کہا گیا ہے وہ اس طرح ہے اس کی کیفیت بتائی گئی ہے، مگر حقیقت اللہ ہی کو معلوم ہے۔مگر مصنف نے اس کے متشابہ جو واقعہ نقل کیا اس سے تو بالکل بھی لوح محفوظ کی جانب اشارہ ہی نہیں ہوتا، ملاحظہ کریں عبارت:

'' ''لوح محفوظ'' کا خیال مسلمانوں میں یہودیوں سے لیا گیا ہے۔بائبل کی کتاب استثنا ۱۰:۱۔۵ میں لکھا ہے کہ: جب موسیٰ نے خدا کے حکم سے ویسی ہی دو لوحیں پتھر تراش کر بنائیں جیسی انہوں نے توڑ دیں تھیں تو خدا نے ان پر احکام عشرہ تحریر فرما دیئے اور موسیٰ کو حکم دیا کہ وہ ان الواح کو (Shittim) یعنی ببول کی لکڑی کے صندوق میں محفوظ رکھے۔اس مقام پر عبرانی زبان میں جو لفظ تختی کے لئے لکھا ہے، وہ وہی ہے جو عربی زبان میں ہے اور بائبل کی کتاب ۱۔سلاطین ۸:۹ اور صحیفہ عبرانیوں ۴، ۹:۳ سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں لوحیں صندوقِ میثاق میں ''محفوظ'' رکھی گئی تھیں جو موسیٰ نے خدا کے حکم کے مطابق بنایا تھا۔''

قارئین کرام! نہ جانے ہمارا واسطہ کیسے اجہل الکائنات سے پڑی ہے جسے نہ عبارات میں مماثلت کی تمیز ہے اور نہ مشابہت کی نہ متبادلیت کی۔خود ہی انہوں نے لوح محفوظ کے بارے میں قصص الانبیاء سے روایات نقل کی ہیں، خوف طوالت سے وہ روایت کو ترک کرنا پڑا، مگر پھر بھی یہاں صرف بطور نمونہ کچھ پیش کرتا ہوں تا کہ آپ دیکھ لے کہ لوح محفوظ کے بارے میں اسلام میں کیا ہے اور مصنف کیا بات پیش کیا ہے، قصص الانبیاء میں ہے کہ:

''عرش اعظم کے نیچے اس نے ایک دانۂ مروارید (موتی۔گوہر) پیدا کیا اور اس مروارید سے اس نے ''لوح محفوظ'' بنائی۔اس لوح کا طول سات سو برس کی راہ اور اس کا عرض تین سو برس کی راہ تھا۔اس کے حاشیہ پر چاروں طرف اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت سے لعل و

یاقوت کے ذریعہ سے نقاش کی تھی۔ بعدازاں قلم کو حکم ہوا کہ ''لکھ اے قلم میری تمام مخلوق کی نسبت اور جو کچھ تا قیامت ہوگا اس کی نسبت میرا علم''

آخر میں ہے کہ:

''پس قلم نے اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں ہر چیز کی نسبت قیامت تک کا حال لکھا، حتیٰ کہ درخت کا پتہ ہلنے، گرنے یا اوپر اڑنے تک کا حال درج کیا اور اس نے ایسی تمام باتیں اللہ تعالیٰ کی قدرت سے لکھیں۔''

قارئین کرام! غور کرے لوح محفوظ کے بارے میں شروع میں عرض کیا گیا ہے کہ وہ ایسی تختی ہے جس میں روز اول سے تا آخر جو کچھ ہونے والا ہے یا ہوگا ان سب کا احوال وہاں درج ہیں۔ اب اس کی کیفیت کیا ہے، اگر چہ مفسرین کرام نے روایات نقل کیا ہیں جیسے مذکورہ روایت جس قصص الانبیاء سے پیش کیا گیا ہیں۔ مگر پھر بھی ہم کہتے ہیں صحیح حال اللہ ہی کو بہتر معلوم ہے۔

اب مصنف نے قصص الانبیاء سے جو روایت نقل کی ہے لوح محفوظ کے بارے میں ذرا وہ بھی پڑھیں اور اس کے بعد بائبل سے جو بات کی ہے وہ بھی پڑھیں، کیا آپ کو بائبل میں لوح محفوظ کی یہی صفات نظر آئیں گے؟ ہرگز نہیں۔ مصنف نے بائبل کے استثناء سے جو بات پیش کی ہے ہم یہاں اصل متن سے ترجمہ شدہ عبارت پیش کررہے ہیں ملاحظہ فرمائیں:

''اُس وقت رب نے مجھ سے کہا، "پتھر کی دو اور تختیاں تراشنا جو پہلی تختوں کی مانند ہوں۔ انہیں لے کر میرے پاس پہاڑ پر چڑھ آ۔ لکڑی کا صندوق بھی بنانا۔ پھر میں ان تختیوں پر دوبارہ وہی باتیں لکھوں گا جو میں ان تختیوں پر لکھ چکا تھا جو تو نے توڑ ڈالیں۔ تمہیں انہیں صندوق میں محفوظ رکھنا ہے۔" میں نے کیکر کی لکڑی کا صندوق بنوایا اور دو تختیاں تراشیں جو پہلی تختیوں کی مانند تھیں۔ پھر میں دونوں تختیاں لے کر پہاڑ پر چڑھ گیا۔ رب نے ان تختیوں پر دوبارہ وہ دس احکام لکھ دیئے جو وہ پہلی تختیوں پر لکھ چکا تھا۔ (ان ہی احکام کا اعلان اُس نے پہاڑ پر آگ میں سے کیا تھا جب تم اُس کے دامن میں جمع تھے) پھر اُس

نے یہ تختیاں میرے سپرد کیں۔ میں لوٹ کر اُترا اور تختیوں کو اُس صندوق میں رکھا جو میں نے بنایا تھا۔ وہاں وہ اب تک ہیں۔ سب کچھ ویسا ہی ہوا جیسا رب نے حکم دیا تھا۔‘‘

(مجموعہ کتاب مقدس تورات، استثناء 10:1-5 ص/258)

غور فرمائیں کہا لوح محفوظ کا معنی اور مطلب اور کہا یہ عبارت، دور دور تک اس میں لوح محفوظ کا معنی نہیں پایا جاتا۔ مصنف بھی لکیر کا فقیر ہے، قرآن میں اس کو لوح کا معنی نظر آیا اور پھر تورات میں بھی شاید یہی لفظ ملا پھر جناب نے یہاں سے لوح محفوظ والا معنی گھڑ لیا۔ ؎

عقل کے اندھوں کو الٹا نظر آتا ہے
مجنوں نظر آتی ہے لیلیٰ نظر آتا ہے

یہ ایک مختصر بحث تھا جو کچھ طویل ہوا، مصنف کی نادانی کی وجہ سے، ورنہ یہاں ماخذ و مشارکت اور مشابہت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مزید اس پر تبصرہ کرنے کے بجائے یہ فیصلہ قارئین پر چھوڑ کر آگے بڑھتے ہیں۔

آگے مصنف نے ایک لچر قسم کی بات کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذہن میں دو لوحیں تھے یعنی نبی کے خیال میں دو لوحیں ہے، انہوں نے یہ بات سورۃ البروج کی آخری آیت (فی لوح محفوظ) سے لیا ہے وہ کہتا ہے اس کا مطلب (ایک لوح) اس کا مطلب ہے محمد کے ذہن میں دو لوحیں تھے۔ پھر آگے کہتا ہے کہ:

’’اور چونکہ یہ لوحوں والا صندوق ہیکل کے اندر رکھا جاتا تھا جو اس بات کی علامت تھا کہ خدا بنی اسرائیل کے ساتھ موجود ہے۔ لہٰذا ان الواح کی نسبت یہ کہا جانا قدرتی امر تھا کہ وہ ’’لوحیں خدا کی جناب میں محفوظ ہیں‘‘۔ اس طرح سے یہ خیال پیدا ہوا کہ ’’لوح محفوظ‘‘ آسمان پر ہے۔‘‘

یہ ایک فضول بات ہے جو مصنف اپنی طرف سے بیان کر رہے ہیں، مصنف کا دعویٰ یہ ہے کہ قرآن کا ماخذ یہودی کتب ہے، اب اس پر انہوں نے لوح محفوظ والا واقعہ پیش کیا ہے، اب

سوال یہ ہے کہ جو بات قرآن میں ہے لوح محفوظ کے بارے میں، یا اسلام میں جو اس کے متعلق نظریہ ہے، کیا کسی یہودی کتاب میں یہ نظریہ یا یہ بات ہے یا نہیں؟ اگر ہوتا اور مصنف اس کو پیش کرتا پھر یہ ان کے دعوی کے مطابق ہوتا (جو ہمارے نزدیک باطل ہے) اگر چہ غلط تھا پھر بھی ان کے گمان کے مطابق یہ ان کے دعوی کے مطابق ہوتا۔ مگر نہ ایسا واقعہ مصنف نے پیش کیا ہے اور نہ کسی یہودی کتاب میں موجود ہیں، پھر کیسے کہا جاتا ہے کہ یہ نظریہ یہودیوں سے لیا ہے، عقل نام کی کوئی چیز ہے بھی کہ نہیں، اسلام میں لوح محفوظ سے مراد اللہ کے ہاں وہ تختی جس میں روز اول تا آخر سب حالات لکھا گیا ہیں، اور موسی علیہ السلام کے تختیوں میں تو کچھ احکام تھے، اب اس پاگل مصنف کو جب دونوں کا معنی تختی نظر آنے لگا تو انہوں نے موسی علیہ السلام والے تختی کو اللہ کے تختی سے تشبیہ دی کہ وہ بھی ایسا ہی ہے۔ اور پھر کہتا ہے کہ محمد کے ذہن میں دو لوحیں تھے، انہوں نے آیت کا ترجمہ ایک (ایک لوح) سے کر دیا اور اپنی طرف سے معنی گھڑ لیا، کس نے یہ ترجمہ کیا ہے مصنف کو شرم آنی چاہیے تھی جس وقت یہ ترجمہ پیش کر کے غلط معنی گھڑ رہا تھا۔

آگے مصنف نے پھر یہ بات کر دی ہے کہ رسول اللہ نے یہ بات کیوں کہی کہ قرآن لوح محفوظ میں درج ہے۔ پھر آگے اس پر یہودی خیالات پیش کیا ہے کہ اس دور میں یہودیوں کا اس بارے میں کیا خیال تھا، پھر وہی بات کی ہے موسیٰ علیہ السلام کی تختیوں کا کہ وہاں کیا احکام درج تھے۔ اس کا جواب ماقبل مضمون میں ہو چکا ہے کہ اسلام میں لوح محفوظ کا نظریہ الگ معنی اور مفہوم میں ہے اور فاضل مصنف حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تختیوں کو درمیان میں لا رہا ہے، جن پر تو احکام درج تھے، اور وہ بھی کچھ احکام تھے ان کی قوم کے لئے۔ حالانکہ اسلام کا نظریہ اس سے مختلف ہے کہ لوح محفوظ سے کیا مراد ہے۔ جب نظریہ ہی الگ ہے مفہوم و معنی الگ ہیں بحث اور الفاظ الگ ہیں، موقع و محل الگ ہیں، سب سے بڑھ کر دعویٰ اور دلیل مختلف ہیں، تو بجز صفحات سیاہ کرنے کے اور کچھ نہیں۔ اس کے علاوہ آخر میں ایک اور ثبوت پیش کیا جس سے یہ

ثابت کرنا چاہا کہ یہ لوح محفوظ والا واقعہ یہودیوں سے لیا گیا ہے مگر یہاں بھی حسب عادت ناکام ہوا ہے، جس کا نظریہ اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔

کوہ قاف:

کوہ قاف کی نسبت سورۃ ق میں پہلا حرف ق کی جانب کیا گیا ہے جس سے متعلق مصنف نے دو واقعہ نقل کیا ہے ایک ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے ایک اور عرائس المجالس نامی کتاب سے۔ مگر دونوں غیر معتبر اور غیر صحیح ہے، ابن عباس والی روایت ملاحظہ کریں:

''قاف ایک سرسبز وشاداب پہاڑ ہے جو تمام زمین کو گھیرے ہوئے ہے اور آسمان کی سبزی اسی کی وجہ سے ہے اور خدا نے اس کی قسم کھائی ہے''۔

یہ واقعہ بھی اسرائیلیات میں سے ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں، علامہ ابن کثیر رح فرماتے ہیں کہ:

''لوگوں نے کہا قاف ایک پہاڑ ہے، جو ساری دنیا کو گھیرے ہوئے ہے، واللہ اعلم، یہ اسرائیلی خرافات سے ہے، جسے بعض لوگوں نے لے لیا ہے، کیونکہ ایسی روایتوں کا لینا جائز تھا، جس کی تصدیق وتکذیب نہ کی جاسکے، یہ روایت بھی اسی طرح کی ہے، لیکن میرے نزدیک یہ روایت اور اسی طرح کی اور دوسری روایتیں زندیقوں نے اس نیت سے گھڑی ہیں، تاکہ مسلمانوں کو توہم پرستی میں مبتلا کر کے ان کے دلوں میں اسلامی روایات کی طرف سے شکوک وشبہات پیدا کر دیں، جیسا کہ حدیث وضع کرنے والوں نے اس امت کے ساتھ یہی حرکت کی ہے، جب کہ اس امت کے بڑے بڑے علماء اور محدثین رہے ہیں، لیکن ان کی موجودگی میں ان بدبختوں نے وضع حدیث کی جسارت کی، یہ بنی اسرائیل اپنی مذہبی روایات کو بھی صحیح طور پر نہیں بیان کرتے اور وہ صحیح طور پر بیان بھی نہیں کر سکتے ہیں کیوں کہ انہوں نے خود ترمیم وتحریف کر کے اللہ کی کتاب کو کچھ کا کچھ بنا دیا ہے، جگہ جگہ لفظوں کو بدل کر روایتوں کا مفہوم بدل دیا، ان کے علماء خود بددیانت اور تحریف کا دھندہ

کرنے والے تھے، یہ شراب خور قوم سچی بات کب کہہ سکتی ہے؟ اس لیے حضور صلی اللہ علم کا ارشاد: (حَدِّثُوا عَنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ وَلَا حَرَجَ) کا دائرہ بہت وسیع نہیں ہے، یہ روایت اسی وقت جائز ہوگی، جب عقل بھی اسے جائز تصور کرنے اور جن باتوں کو عقل محال سمجھے اور تسلیم نہ کرے، وہ روایتیں اس قبیل سے نہیں ہیں، ان کی روایت جائز نہیں''

(تفسیر ابن کثیر بحث تحت سورۃ ق آیت 1)

بالفرض روایات صحیح بھی ہو، تب بھی مصنف کو مفید نہیں، کیونکہ ان کا جو دعوی ہے وہ دلیل کے مطابق نہیں۔ مصنف کو ماخذ قرآن ثابت کرنا ہے، یعنی وہ واقعہ جو قرآن میں ہو اور یہودی کتاب میں بھی موجود ہو۔ مگر مصنف نے ان روایات کے ماخذ پر جو یہودی کتاب سے اقتباس پیش کیا ہے ذرا وہ بھی ملاحظہ کرے:

''اگر ہم یہ معلوم کرنا چاہیں کہ اس عجیب وغریب سلسلۂ کوہستان کے وجود کی کیا حقیقت ہے تو اس کا جواب یہودیوں کی تفسیر (Hagigah) باب ۹ فصل ۱ میں ملتا ہے۔ بائبل کی کتاب پیدائش ۲:۱ میں ایک بہت ہی قلیل الاستعمال عبرانی لفظ ''توہو'' (Tohu) آتا ہے۔ اس کی تفسیر یہ لکھی ہے کہ ''توہو'' ایک سبز خط ہے جو تمام دنیا کے گرد محیط ہے اور جس کے اندر سے تاریکی نکلتی ہے''۔ وہ عبرانی لفظ جس کے معنی ہم نے یہاں ''خط'' لکھے ہیں ''قاو'' ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے متبعین نے یہ عبرانی لفظ تو سن لیا مگر ان کو یہ معلوم نہ تھا کہ اس لفظ کے معنی ''خط'' کے ہیں۔ اس لئے انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ یقیناً جس چیز کو دنیا کے گرد محیط بتایا گیا ہے اور جس میں سے تاریکی نکلتی ہے، وہ ضرور ایک بڑا سلسلہ کوہستان ہے جس کا نام ''قاو'' یا ''قاف'' ہے۔''

قارئین کرام! غور کرے مصنف کے دعویٰ اور دلیل پر، دعویٰ ماخذ ہونے کا ہے مگر دلیل جو دے رہا ہے اس میں کچھ اور ہے، عنوان تو یہ دیا ہے کہ کوہ قاف یعنی قاف پہاڑ، اہل دانش اور منصفین فیصلہ کرے کہ کیا اس کو ماخذ کہا جا سکتا ہے؟

کیا قرآن میں ایسا واقعہ ہے جو اس یہودی روایت کی تصدیق کرے؟ ایسا کچھ نہیں ہے تو پھر اس کو ماخذ کیسے کہہ سکتے ہیں؟

اور دوسری بات علماء اسلام کا یہ متفق علیہ نظریہ ہے کہ یہ سورۃ ق کے شروع میں جو حرف ق آیا ہے یہ حروف مقطعات میں سے ہیں، اور حروف مقطعات کے بارے میں جمہور مفسرین کا نظریہ یہی ہے کہ ان کے معنی اللہ ہی کو معلوم ہے اس کے علاوہ کسی کو نہیں۔ جب یہ حروف مقطعات میں سے ہیں پھر کیسے اس کا تعین کیا جا سکتا ہے۔ کہ اس سے مراد یہ ہے یا کچھ اور ہے۔

اور پھر جو روایات قاف کے بارے میں ہیں وہ اور مذکورہ یہودی روایت جو مصنف نے پیش کیا ہے ان میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ دونوں کے الفاظ اور معنی مختلف ہے، تو ماخذ کا دعویٰ ہی باطل ہوا۔ اور مصنف کا دعویٰ ماخذ القرآن کا ہے جب کہ روایات وہ صحابہ کرام کا پیش کر رہے ہیں یا مفسرین کا، تو وہ قرآن تو نہیں ہے، دیگر صحابہ کے اقوال ہے، قرآن میں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال میں کیا ایسا کچھ ہے؟ بالکل نہیں جب نہیں ہے تو پھر دعویٰ ہی باطل ہوا۔ بالفرض اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی روایت میں بھی ایسا ہوتا تب بھی مصنف کا دعویٰ محض دعویٰ ہی ہوتا کیونکہ پھر بھی قرآن میں ایسا واقعہ کچھ نہیں ہے، اور مصنف کا دعویٰ قرآن کے متعلق ہے۔

جواب پر شبہ کا جواب:

ہمارے اس جواب پر کوئی یہ شبہ نہ کرے کہ ایک طرف تم کہتے ہو کہ مذکورہ یہودی روایت اور اسلامی روایات میں فرق ہے، پھر کہتے ہو کہ قاف سے متعلق جو روایت ہے وہ اسرائیلیات میں سے ہیں، بات تو وہی ہوئی مصنف اگر پیش بھی نہ کرے آپ نے خود تسلیم کیا کہ یہ بات اسرائیلیات میں سے ہیں پھر مصنف کے پیش کردہ اقتباس پر تنقید کیوں؟

یہ بات یاد رکھے اس جگہ پر یا اس کے علاوہ ماقبل یا اس کے بعد جہاں ہم کہیں گے کہ یہ

اسرائیلیات میں سے ہیں اور مصنف نے بھی کہی سے اس پر اقتباس پیش کیا ہے، ان کا مطلب یہ ہے کہ یہ واقعہ اسرائیلیات میں سے ہیں قرآن میں ایسا مذکور نہیں ہے۔ اور ہمارا یہ جواب مصنف کے دعوی پر ہے کہ دعوی کچھ اور ہے دلیل کچھ اور۔ اور پھر ہمارا یہ کہنا کہ یہ اسرائیلیات میں سے ہیں اس سے مراد دفاع قرآن ہے، یعنی مصنف کا پیش کردہ اقتباس یا واقعہ اور اسلامی واقعہ کے فرق پر تنقید کرنا وہ مصنف کے دعویٰ اور دلیل پر ہے۔ اور پھر اسلامی واقعہ جو مصنف نے بعض مفسرین یا دیگر اسلامی کتب سے پیش کیا ہے اس کو اسرائیلیات میں سے کہنا یہ دفاع قرآن ہے۔

آسمان وزمین کے سات طبقے:

یہاں مصنف نے سات آسمانوں کی تخلیق اور جہنم کے سات طبقوں پر مختصر کلام کیا ہے، جس میں کہا ہے کہ یہ دونوں بات یہودیوں سے لیا گیا ہے، اور ساتھ میں ہندوؤں کا بھی نظریہ اس سے متعلق پیش کیا ہے کہ وہ بھی زمین وآسمان کے سات طبقات مانتے ہیں۔

عرض ہے کہ اگر یہ ماخذ ہے یہودیوں سے، تو ہمیں بتایا جائے کہ مصنف نے جو ہندوؤں کا مذہب پیش کیا ہے وہ بھی زمین وآسمان کے سات طبقات مانتے ہیں تو یہ فیصلہ مصنف کے ہمنوا کرے کہ کیا ہندوؤں نے یہ بات یہودیوں سے لی ہے یا پھر یہودیوں نے ہندوؤں سے لی ہیں؟ ظاہر ہے جو مذہب قدیم ہوگا بعد والا مذہب مصنف کے اصول کے مطابق ماخذ قرار پائے گا۔ تو یہ معمہ مصنف کے متبعین حل کرے۔ اور اگر یہودی قدیم مذہب ہے تو بعد میں ہندو ہے تو کیا یہ بات ہندوؤں نے یہودیوں سے لی ہے؟ اگر جواب مثبت ہے تو دریافت طلب یہ امر ہے کہ صرف یہی ایک بات یہودیوں سے لی ہے یا اور بھی؟ اگر اور بھی ہے تو وہ پیش کرے اور دعویٰ کرے کہ ہندو مذہب یہودی مذہب کا ماخذ ہے، اور اگر یہی ایک بات لی ہے تو کیا ثبوت ہے، اور کیسے صرف ایک ہی بات لے سکتے ہیں کس بنیاد پر۔ اور اگر جواب منفی ہے تو مصنف کے

اصول سے کیا یہ ماخذ شمار نہیں ہوگا؟ اگر نہیں تو کیا ثبوت؟ اور اگر شمار ہوگا تو پھر وہی سوال کہ کیا یہی ایک بات لی ہے یا اور بھی۔ اور اگر ہندو قدیم مذہب ہیں تو بعد میں یہودی، اس پر بھی ہمارے وہی سوالات ہے جو یہودی کو قدیم ماننے پر ہے۔

اور رہی بات سات آسمانوں کی تو بائبل میں اس کا ذکر ہے اور قرآن نے اس کی تصدیق کی ہے تو یہ ماخذ نہیں بلکہ تصدیق کہلائے گی، جیسے خود قرآن نے اس کا اعلان کئی مقام پر کر دیا ہے کہ یہ کتاب ماقبل کتابوں کی تصدیق کرنے والی ہے۔ (ومصدقا لما بین یدیہ)

عرش:

آگے مصنف نے چند سطروں میں عرش کے بارے میں کہا ہے کہ جیسا قرآن میں ہے کہ اللہ کا عرش پانی پر تھا، اسی طرح یہودی روایت میں بھی ہے۔ اس کا جواب بھی ماقبل مذکورہ آیت (ومصدقا لما بین یدیہ) سے دیا گیا ہے۔

داروغہ جہنم:

داروغہ جہنم، قرآن میں جس کا نام "مالک" آیا ہے سورۃ زخرف آیت 77 میں جس کا تذکرہ ہے۔ اس نام سے متعلق مصنف یہودی روایت پیش کرنے سے قاصر رہا تو اپنے قیاس فاسد کو درمیان میں لا کر اپنی بے بسی ولاچارگی کا یوں سر عام تشہیر کرنے لگا:

> "اسی طرح یہودی روایات میں بھی "شہزادہ جہنم" کا نام آتا ہے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے "مالک" کا نام "مولک" (Molek orMolech) سے لیا ہے جو ایک دیوتا کا نام ہے جس کی نسبت بائبل میں بیان کیا گیا ہے کہ پہلے زمانہ میں اس کی پرستش اہل کنعان کیا کرتے تھے اور یہ لوگ اس بُت کے اعزاز میں زندہ آدمیوں کو جلاتے دیتے تھے۔ یہ لفظ عربی اور عبرانی دونوں میں ایک ہی معنی رکھتا ہے یعنی "مالک" یا "فرمانروا""۔

سبحان اللہ! افسوس اس کی جہالت اور حماقت پر جو ہر سطر میں اپنی جہالت کو اجاگر کر رہا ہے

۔" شہزادہ جہنم " کی بات یہاں کہاں سے آگئی؟ قرآن میں تو اس کا نام " مالک " آیا ہے، اور تمہیں اپنی جھوٹی اور غلط دعویٰ کے مطابق یہی نام پیش کرنا تھا یہودی روایات سے، اور جناب " شہزادہ جہنم " کا نام لے کر کہتا ہے یہ بات بھی یہودیوں سے لیا ہے، کتنی شرم کی بات ہے کہ دعوی تو کچھ اور دلیل کچھ اور۔ اور پھر یہاں بات ختم کرتا تو بھی اچھا تھا، مگر نہیں بے شرم کو شرم کہاں سے آتی ہے، جاہل جب تک اپنی جہالت کا خوب مظاہرہ نہ کرے اسے سکون نہیں آتا۔ یہی حال فاضل مصنف کا ہے۔ آگے کہتا ہے کہ مسلمانوں نے " مالک " کا نام " مولک " سے لیا ہے

جو ایک دیوتا کا نام ہے جس کی نسبت بائبل میں بیان کیا گیا ہے کہ پہلے زمانہ میں اس کی پرستش اہل کنعان کیا کرتے تھے۔ بائبل کی عبارت نقل کرنے سے پہلے عرض کروں کہ جب مسلمانوں نے یہ نام " مولک " سے لیا ہے تو ماقبل جو تم نے کہا کہ جہنم کے داروغہ کا نام " شہزادہ جہنم " ہے کہ یہ پیش کرنے کا پھر کیا مقصد؟ اس کا تعلق تو مالک سے بالکل نہیں ہے۔

بائبل میں جس مولک کا ذکر ہے پہلے بائبل کی عبارت ملاحظہ کرے:

" اپنے کسی بھی بچے کو مَلِک دیوتا کو قربانی کے طور پر پیش کر کے جلا دینا منع ہے، ایسی حرکت سے تو اپنے خدا کے نام کو داغ لگائے گا "

(مجموعہ کتاب مقدس، احبار 18 / 21 ص/ 172)

اسی طرح یرمیاہ میں بھی اسی سے متعلق ایک بات موجود ہے کہ:

" وادی بن ہنوم کی اونچی جگہوں پر انہوں نے بعل دیوتا کی قربان گاہیں تعمیر کیں تاکہ وہاں اپنے بیٹے بیٹیوں کو ملک دیوتا کے لئے قربان کریں۔ میں نے انہیں ایسی قابل گھن حرکتیں کرنے کا حکم نہیں دیا تھا، بلکہ مجھے اس کا خیال تک نہیں آیا۔ یوں انہوں نے یہوداہ کو گناہ کرنے پر اکسایا ہے۔ "

(یرمیاہ 32 / 35 ص/ 1082)

مصنف نے مولک کا لفظ ذکر کیا ہے، جب کہ ہمارے پاس جو مترجم بائبل ہے اس میں "

مَلِک" کا لفظ موجود ہے، بہر حال جو بھی ہو، اصل میں یہ ایک بادشاہ تھا جس کی پرستش کیا جاتا تھا ۔اب مصنف اس کو فٹ کر رہا تھا ''مالک'' پر کہ رسول اللہ نے یہ نام وہاں سے لیا ہے۔اس عقل کے اندھے کو بالکل فہم نہیں ہے، بائبل والی بات ایک بادشاہ کا نام ہے اور قرآن میں داروغہ جہنم کا جو نام ہے وہ مالک ہے، اگر محمد نے یہ بات بائبل سے لیا ہوتا تو پھر جہنم کے داروغہ کا نام کیوں بتاتا پھر وہی اس کو بادشاہ ظاہر کرتا؟ جہنم کے داروغہ کا اس اور اس بادشاہ کے نام کے درمیان کیا مناسبت ہے جو وہاں سے لے کر اس کو یہیں اور فٹ کیا۔

اعراف کے بارے میں ماخذ کا دعویٰ:

اعراف سے متعلق مصنف کا دعویٰ ہے کہ اس کو بھی یہودیوں سے لیا ہے گیا ہے، اعراف جنت وجہنم کے درمیان میں ایک آڑ ہے اسی کو اعراف سے مسمی کرتے ہیں۔

مگر یقین جانے مصنف خود اتنا بوکھلا گئے ہے، اسے اندازہ بھی نہیں میں اپنی باتوں کو اور دعویٰ کو خود اپنے پیروں سے روندر رہا ہوں، ملاحظہ کرے مصنف اس بارے میں کیا کہتا ہے:

''یہ خیال غالباً بائبل کی کتاب واعظ ۱۴:۷ سے آیا ہے اور مدراش (تفسیر) سے لیا گیا ہے جہاں اس سوال کا کہ ''جنت و دوزخ کے درمیان کیا ہے؟'' ربی یوحنا نے یہ جواب دیا کہ ''ایک دیوار ہے''۔ ربی اخاہ (Akhah) نے کہا کہ ''ایک وقفہ ہے'' اور ربّان (Rabban) کہتے ہیں کہ وہ دونوں ایک دوسرے سے اس قدر قریب ہیں کہ روشنی کی شعاعیں ادھر سے ادھر گزر جاتی ہیں۔''

قارئین کرام! مصنف کا یہ کہنا کہ ''یہ خیال غالبا بائبل سے آیا ہے'' کتنا کمزور اور لچر قسم کی بات ہے، جب آپ کو معلوم ہی نہیں آپ کو اپنے دعویٰ میں شک ہے تو کیوں اپنے خیالات فاسدہ کو قرآن پر چسپاں کر رہے ہو کہ یہ بات وہاں سے لیا گیا ہے۔جیسے آپ کہتے ہو کہ غالبا یہ بات بائبل سے لیا گیا ہے، ہم بھی کہتے ہے کہ غالبا وہاں سے نہ لیا گیا ہو، بلکہ وحی کے ذریعہ بتلایا

گیا ہو، یہ بات اور جواب بطور مقابلہ ہے، یعنی جواب کا جواب اسی انداز میں دینا، جیسے اللہ تعالیٰ نے منافقین کا جواب اپنے قول " اللہ یستھزئ " سے دیا حالانکہ اللہ تو مذاق سے پاک ہے۔ اسی طرح ہمارا مقصد یہ نہیں معاذ اللہ کہ ہمیں شک ہے کہ رسول اللہ نے واقعی یہ بات بائبل سے لی ہے یا وحی کے ذریعہ، بلکہ ہمیں اس میں شک نہیں کہ یہ بات رسول اللہ کو بطور وحی بتلایا گیا ہے۔ مگر مصنف نے جیسے شکیہ انداز میں اس کو ماخذ قرار دیا اسی طرح ہم بھی اسی شکیہ انداز میں اس کو جواب دیا۔

شیطان، جہنم کی آگ اور نار التنور:

شیطان کے بارے میں سورۃ الحجر کی آیت پیش کی ہے جس میں مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں کی حفاظت اللہ تعالیٰ نے ہر شیطان مردود سے کیا اور جو چپکے سے سننے کی کوشش کرے تو اس کا پیچھا ایک چمکتا ہوا شعلہ کرتا ہے، مگر یہاں مصنف نے اپنی خیانت اور جہالت کا بدترین ثبوت دیا ہے، جس میں انہوں نے آیت مبارکہ کے ذیل میں ملائکہ کو بھی ڈال دیا، چنانچہ آیت نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ:

> " جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیطان اور دیگر ملائکہ مردود چوری سے ان احکام کو سننے کی کوشش کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ آسمان پر فرشتوں کو دیتا ہے۔ "

یہاں انہوں نے ملائکہ کو بھی معاذ اللہ مردود شمار کیا جو دراصل ان کی خیانت یا پھر جہالت ہے، آیت میں " الشیطان الرجیم " کے الفاظ ہے جس کو مصنف نے الگ الگ نام پر محمول کیا ہے ان کا گمان یہ ہے کہ شیطان الگ نام ہے اور رجیم الگ۔ حالانکہ رجیم شیطان کا ہی صفت ہے۔ جس کا معنی مردود ہے۔

یہ واقعہ اور اس کے بعد جہنم کی آگ کا واقعہ جو قرآن میں ہے کہ اللہ تعالیٰ جہنم سے کہے گا کیا تم بھر گئ تو جہنم کہے گی کیا اور بھی ہے۔ اور اس کے بعد نار التنور کا واقعہ جو حضرت نوح علیہ

السلام کے زمانے میں پیش آیا کہ آگ کی بھٹی پڑی یا پھر ایک نان بائی کا تنور ابل پڑا، جو عذاب آنے کی طرف اشارہ تھا۔ان تینوں کا وہی جواب ہے جو ماقبل دیگر واقعات پر دیا گیا ہے کہ اگر ایسی بات یہودی کتب میں موجود ہے تو یہ ماخذ قرار نہیں پاتے بلکہ تصدیق قرار پاتے ہیں جو قرآن میں موجود ہے، کہ قرآن پچھلی کتابوں کی تصدیق کرنے والی ہے۔

قرآن میں غیر عربی الفاظ کے استعمال سے استدلال:

قرآن میں غیر عربی الفاظ کے استعمال پر مصنف نے اس سے یہ استدلال کیا ہے کہ یہ بھی ایک ثبوت ہے کہ قرآن کا ماخذ یہودی روایات یا اسلام پر یہودی روایات کا اثر ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن میں غیر عربی الفاظ کا آنا وہ بحیثیت نسبت الی العجم عجمی ہے، اور بحیثیت نسبت الی العرب عربی ہے، یعنی وہ الفاظ ایسے الفاظ ہے جو بیک وقت کئی زبانوں میں بولے جاتے ہیں جیسے عرب اگر استعمال کرے تو اسے عربی کہا جائے گا اور عجم استعمال کرے تو عجمی کہا جائے گا۔ جیسے ہم اردو بولتے ہیں تو اس میں عربی اور فارسی الفاظ کا استعمال زیادہ کرتے ہیں تو کیا کوئی کہتا ہے کہ یہ عربی یا فارسی بول رہا ہے، نہیں بلکہ ان تمام الفاظ کی نسبت اردو کی جانب کیا جاتا ہے۔

اور مصنف کا دعویٰ چونکہ ماخذ کا ہے کہ یہ الفاظ دیگر کتب یا مذہب سے لیا گیا ہیں تو عرض ہے کہ اس کو ماخذ ہرگز نہیں کہا جاتا، کیونکہ اگر رسول اللہ بقول تمہارے یہودیوں سے یہ باتیں لی ہے تو ایک لفظ کیسے لیا؟ جب کہ وہ الفاظ عبرانی یا سریانی یا دیگر زبانوں میں تھے، پورے جملے کو چھوڑ کر صرف ایک ہی لفظ کا انتخاب کیسے کیا؟ اور وہ بھی چند الفاظ، باقی کو کیوں چھوڑا؟ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ الفاظ عرب اور غیر عرب میں مستعمل تھے تو یہی الفاظ کا انتخاب کیا گیا۔

اور سب سے بڑی بات اگر غیر عربی الفاظ پر اعتراض ہے تو ہمیں اس سوال کو حل کر کے دو کہ پھر اللہ تعالیٰ عرب کے لئے ان الفاظ کے جگہ کیا استعمال کرتا جو اس سے پہلے گزرے تھے، جیسے

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ اور بنی اسرائیل کا اور دیگر اسماء ایسے تھے جو دیگر زبانوں کے نام ہیں تو ان کی جگہ عربی میں کیا لے آتا؟ اگر تم کہتے ہو کہ ان کا معنی کر کے اسی کے مطابق الفاظ لاتا تو پھر کفار کیسے یقین کرتے کہ یہ کس بندے کا واقعہ ہے اور التماس پیدا ہوتا۔ جیسے اسرائیل کا معنی ہے اللہ کا بندہ اس کے جگہ اگر عبداللہ عربی میں لائے تو کیا پتہ چلتا کہ کس کی بات ہورہی ہے اللہ کا بندہ تو ایک نہیں کئی ہے، اس کے علاوہ یہ فصاحت و بلاغت کے بھی خلاف ہے، اور قرآن تو فصیح و بلیغ کتاب ہے۔

اس کے علاوہ اس کی مثال آسانی سے لیجئے جیسے ہمارے دور میں امریکہ کے صدر کا نام ''ڈونلڈ ٹرمپ'' ہے اب عرب جب اس کو ادا کریں گے تو کیا نام تبدیل کریں گے یا اسی لفظ کو اس طرح ادا کریں گے" دونلد ترمب" کیونکہ عربی میں حرف ''ٹ'' اور ''چ'' نہیں ہے تو عرب اس کو تبدیل کرتے ہے باقی نام تو وہی ادا کرتے ہے جیسے تھا۔ تو عرض ہے کہ عرب جب اس کا نام لیں گے ظاہر ہے اصل نام ہی لیں گے نہ کہ اس کے جگہ کچھ اور بولیں گے، اس لئے کہ یہ عربی نہیں انگلش زبان کا لفظ ہے۔

اسی طرح اس دور میں بھی کچھ نام ایسے تھے جو عرب میں مشہور تھے اس کے ماسوا کچھ الفاظ کو اپنی اصل زبان کے الفاظ اور نام ہی میں لایا جاتا ہے۔ یہ فصاحت و بلاغت کے خلاف نہیں۔ بلکہ عین مطابق ہے۔ اور نہ اس سے ماخذ کا سوال پیدا ہوتا ہے۔

عبادات کے طریقہ پر ماخذ کا ناکام دعویٰ:

عبادات کے طریقہ پر بھی ماخذ کا ناتمام دعویٰ کیا ہے، مگر خود ہی اس کو رد بھی کیا ہے، چنانچہ لکھتے ہیں کہ:

''یہ فرض کرنا تو غلطی ہے کہ مسلمانوں نے سر ڈھک کر نماز پڑھنا، جماعت کے وقت عورتوں کو مردوں سے علیحدہ کر دینا یا نماز کے وقت جوتا اتار دینا یہودیوں سے سیکھا ہے، کیونکہ

غالباً عربوں اور تمام سماتیقی اقوام میں یہ رواج زمانۂ قدیم سے موجود تھا۔لیکن وضو وغیرہ میں مسلمانوں نے غالباً یہودیوں کی تقلید کی ہے۔گو پوری صحت کے ساتھ ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے۔‘‘

اول الذکر باتیں جو کی ہے وہ تو شریعت کے احکام میں سے ہیں، مگر آگے مصنف کہتا ہے کہ یہ مسلمانوں نے یہودیوں سے سیکھا ہیں۔ پھر آگے شکیہ انداز میں کہتا ہے کہ غالبا عربوں اور تمام سماتیقی اقوام میں یہ رواج زمانہ قدیم سے موجود تھا۔خود مصنف اپنے دعویٰ کو توڑ رہے ہیں، کیونکہ مصنف کا دعویٰ ہے کہ مسلمانوں نے یہ طریقے یہودیوں سے لیا ہیں، پھر کہتا کہ یہ طریقے سماتیقی اقوام میں بھی یہ رواج تھا، اب یا تو مصنف یہودیوں کو سماتیقی اقوام سے خارج مانتا ہے یا نہیں، اگر خارج مانتا ہے تو ہمارا سوال ہے کہ یہ طریقے تو بقول تمہارے دیگر اقوام میں بھی پایا جاتا ہیں تو آپ کا دعویٰ صرف یہودیوں سے ماخذ کا ہے کہ یہ طریقے مسلمانوں نے یہودیوں سے لیا ہیں، حالانکہ یہ سب سماتیقی اقوام میں موجود ہیں پھر کیسے کہتے ہو کہ یہودیوں سے لیا ہیں، اور پھر یہ بھی وضاحت کرے کہ سماتیقی اقوام میں سب سے پہلی قوم میں جو یہ طریقے پائے جاتے تھے تو اس کے بعد والی قومیں جتنے بھی آئی کیا وہ سب اسی طرح ماخذ میں شمار ہوں گے یا نہیں، اگر نہیں تو کس بنیاد پر، مسلمان تو شامل ہوں گے مگر دوسرے کیوں نہیں؟ وجہ بیان کرے۔

اور اگر یہودیوں کو سماتیقی اقوام میں شامل مانتا ہے تو کیوں یہ جھوٹ بولا کہ یہ طریقے مسلمانوں نے یہودیوں سے لی ہے حالانکہ یہ تو سب اقوام میں پائے جاتے تھے۔

پھر کہتا ہے کہ وضوء میں مُسلمانوں نے یہودیوں کی تقلید کی ہیں، ہمیں اس کا جواب دینے کی ضرورت نہیں خود آگے کہتا ہے کہ پوری صحت کے ساتھ ہم یہ نہیں کہہ سکتے البتہ ہوسکتا ہے کہ یہودیوں سے لیا ہو۔جب آپ کو یقین ہی نہیں اور نہ ثبوت ہے آپ کے پاس تو بلا وجہ قیل وقال

کرنے کی کیا ضرورت۔

آگے مصنف نے اس بات پر کلام کیا ہے کہ مسلمانوں کو حکم ہے جہاں نماز کا وقت ہو تو پنجگانہ نماز ادا کرے خواہ مسجد میں ہو یا گھر میں یا کہی بھی ہو، یعنی اگر مسجد تھا تو مسجد میں پڑھے نہیں تو گھر میں۔ اس کو بھی یہودیوں کا ماخذ قرار دے رہا ہے۔ حالانکہ اس جاہل کو معلوم ہونا چاہیے کہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ خصوصیت ہے کہ ان کے لئے تمام زمین کو پاک کر دیا گیا اور جہاں چاہے نماز پڑھ سکتے ہیں عبادت کر سکتے ہیں، جب کہ یہودی قوم کے لئے کوئی خاص جگہ متعین تھا۔ چنانچہ مجموعہ کتاب مقدس، استثناء میں ہے کہ:

''رب تمہارا خدا قبیلوں میں سے اپنے نام کی سکونت کے لئے ایک جگہ چن لے گا، عبادت کے لئے وہاں جایا کرو۔''

(استثناء 12 / 5 ص/ 261)

ان آیات کی تفسیر میں ولیم میکڈونلڈ لکھتے ہیں:

'' خدا ایک جگہ مخصوص کرے گا جہاں قربانیاں اور نذریں لائی جائیں''

(تفسیر الکتاب جلد 1 ص/ 307 اردو مترجم بشپ سموئیل ڈی چند)

معلوم ہوا کہ یہودیوں کے لئے خاص متعین جگہ ہوگا عبادت کے لئے ہر جگہ وہ عبادت نہیں کر سکتے تھے۔ تو پھر کیسے رسول اللہ نے یہ طریقہ ان سے لیا؟ اگر ان سے لیا ہوتا تو ایک مخصوص جگہ عبادت کو متعین کرتا۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔

تعدد ازواج:

اسلام میں ایک بندے کو چار بیویاں رکھنے کی اجازت ہیں، یعنی چار بیویوں سے نکاح کی اجازت ہیں، اس سے زیادہ نہیں، اور اگر ان میں کوئی انتقال کر جائے تو دوسرا نکاح کر سکتا ہے، یعنی بیک وقت چار بیویاں نکاح میں رکھ سکتا ہے اس سے زیادہ نہیں، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وسلم کے لئے یہ حکم نہیں تھا وہ جتنا رکھنا چاہتے رکھ سکتے تھے، اور آپ کے نکاح میں 11 گیارہ بیویاں تھیں۔

مصنف اس کو یہودی ماخذ قرار دیتا ہے، مگر آپ ملاحظہ کرے کہ کیا یہ ماخذ بن سکتا ہے یا نہیں:

''جب ہم اس کی تحقیق کرتے ہیں تو ہمیں یہی تعلیم یہودیوں کے یہاں بھی ملتی ہے۔ان کو ہدایت ہے کہ ایک مرد بہت سی بیویاں کر سکتا ہے، کیونکہ رب کہتا ہے کہ ایسا کرنا جائز ہے اگر تم ان کا خرچ برداشت کر سکو۔ بایں ہمہ عقل مندوں نے اس بارے میں یہ نیک مشورہ دیا ہے کہ ایک مرد کو چار بیویوں سے زیادہ شادی نہ کرنا چاہیئے۔''

قارئین کرام! آپ خود فیصلہ کرے کیا یہ ماخذ بن سکتا ہے؟ ہرگز نہیں، کیونکہ اسلام نے تو تعدد ازواج کی حد متعین کیا ہے، اور یہاں تو کوئی حد نہیں جتنا چاہے نکاح کر سکتا ہے، اس کو اب کیسے ماخذ کا نام دیں گے، میرے خیال میں اسے ماخذ کا نام دینا ایسا ہے جیسے کنویں کو سمندر کہنا ۔رہی بات عقلمندوں کی تو وہ عقلمندوں تک ہی محدود رکھو، ہمارا ان عقلمندوں سے کوئی لینا دینا نہیں، دلائل کی دنیا میں کبھی عقلمندوں کی بات کو انہیں کے جیب تک محدود کیا جاتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے امی ہونا، ایک تحقیقی جائزہ :

یہ بحث چونکہ نبوت کی معجزات اور صفات مدح میں سے ہیں، اس لئے یہاں اس پر تفصیلی کلام پیش کیا جاتا ہے۔ اور ساتھ ساتھ مصنف کے اعتراضات اور کلام کا جواب بھی پیش کیا جائے گا۔

اللہ تعالیٰ سورۃ الاعراف آیت نمبر 157 میں فرماتے ہیں:

''اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِیْلِ یَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَیُحِلُّ

لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ؕ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَ اتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ''

''ترجمہ: جواس رسول یعنی نبی امی کے پیچھے چلیں جس کا ذکر وہ اپنے پاس تورات اورانجیل میں لکھا ہوا پائیں گے جو انہیں اچھی باتوں کا حکم دے گا، برائیوں سے روکے گا، اوران کے لیے پاکیزہ چیزوں کوحلال اور گندی چیزوں کوحرام قرار دے گا، اوران پر سے وہ بوجھ اور گلے کے وہ طوق اتار دے گا جو ان پر لدے ہوئے تھے۔ چنانچہ جولوگ اس (نبی) پر ایمان لائیں گے اس کی تعظیم کریں گے اس کی مدد کریں گے، اوراس کے ساتھ جونور اتارا گیا ہے اس کے پیچھے چلیں گے تو وہی لوگ فلاح پانے والے ہوں گے۔''

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جو صفات بیان فرمائی ہیں، وہ رسول اور نبی ہونا، امی ہونا، ان کی صفات کا تذکرہ اپنی کتابوں میں پانا، اچھائی کا حکم برائی سے منع کرنا، پاکیزہ چیزوں کوحلال اور گندی چیزوں کوحرام کرنا، اوران سے وہ بوجھ اور گلے کا طوق اتارنا جوان کے گلے میں ہیں یہ کچھ صفات کا ذکر اس آیت میں مذکور ہیں، لیکن ہمیں ان صفات میں سے صرف امّی اور پچھلی کتابوں میں آپ کی جو صفت امی بیان ہوئی ہیں ان دو صفات سے بحث کرنا مقصود ہے۔

امی ایک ایسی صفت ہے جو دوسرے لوگوں کے حق میں صفت مدح نہیں مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں صفت مدح ہے۔ جیسے متکبر کی صفت دوسرے لوگوں کے حق میں صفت قبح وذم ہے مگر اللہ کے حق میں صفت مدح ہے۔ کیونکہ ایک شخص جو پڑھا لکھا نہ ہو تو ان سے ایسے معجز کلام کا صادر ہونا یقینا یہ اسے مدح کے صفت سے متصف کرتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو امی کہنے کی وجوہات علماء نے چار بتلائے ہیں مگر دو مشہور ہیں، اور ہمارا بحث بھی انہیں دو سے ہیں۔ پہلی وجہ آپ کو امی کہنے کی یہ ہے کہ آپ کسی سے پڑھے

لکھے نہیں تھے اور نہ آپ پڑھنا اور لکھنا جانتے تھے۔ اس لئے امی ایسے شخص کو کہا جاتا ہے جو پڑھنا لکھنا نہ جانتا ہو، جیسے قرآن میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:

''هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ '' (سورۃ الجمعه آیت 2)

''ترجمہ: وہی ہے جس نے امی لوگوں میں انہی میں سے ایک رسول کو بھیجا''

اس آیت میں عرب کو امی کہا گیا ہیں، کیونکہ عرب پڑھے لکھے نہیں تھے، وہ ہر چیز کو یاد کرتے تھے گویا ان کا حافظہ ہی پڑھنے لکھنے کے قائم مقام تھا۔ اسی طرح سورۃ آل عمران آیت 20 میں فرمایا کہ:

''وَ قُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَ الْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ ''

''اور اہل کتاب سے اور (عرب کے) ان پڑھ (مشرکین) سے کہہ دو کہ کیا تم بھی اسلام لاتے ہو؟

اس میں بھی عرب کو ان پڑھ کہا گیا ہے۔''

اور دوسری وجہ امی کہنے کی یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آپ کو جس قوم سے نبوت کے منصب پر سرفراز کیا گیا وہ قوم پڑھے لکھے نہیں تھی۔ جیسے کہ مذکورہ دونوں آیت سے واضح ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو امی اس لئے بنایا گیا تاکہ کفار پر اتمام حجت ہو اور وہ شکوک و شبہات میں نہ پڑے کہ آپ خود یہ باتیں پیش کررہے ہیں اور آپ کو کوئی سکھا رہا ہے یا آپ نے کہی سے پڑھا یا سیکھا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ:

'' وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ '' (سورۃ العنکبوت آیت 48)

''ترجمہ: اور تم اس سے پہلے کوئی کتاب نہیں پڑھتے تھے اور نہ اسے اپنے ہاتھ سے لکھ ہی سکتے تھے ایسا ہوتا تو اہل باطل ضرور شک کرتے۔''

اس لئے یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ تھا کہ آپ نہ پڑھنا جانتے تھے اور نہ لکھنا، پھر ایسے معجز کلام کا آپ سے صادر ہونا، یہ صرف نبوت کا خاصہ ہے۔

کیا وحی کے بعد بھی امی تھے؟:

مذکورہ آیت اور اس کے علاوہ کچھ واقعات اور روایات سے بعض حضرات نے یہ استدلال کیا ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم قبک وحی لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے ،وحی کے بعد آپ کو لکھنا پڑھنا آ گیا تھا۔

اس مسئلہ کو ذرا ہم تفصیل سے ذکر کریں گے، کیونکہ اس پر کافی بحث مباحثہ ہوا ہے، اور یہاں تک نوبت ایک دوسرے کو گمراہ کہنے تک جا پہنچی ۔صحیح بات اور نظریہ کو پیش کرنے کی کوشش کریں گے اللہ تعالیٰ مجھے حق کہنے کی توفیق عطاء فرمائیں۔

سب سے پہلے یہ بات سمجھنا چاہیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی سے نہ کچھ سیکھا ہے اور نہ کسی سے کچھ پڑھا ہے پیدائش سے لے کر وفات تک ، یہ ایک اتفاقی اور اجماعی مسئلہ ہے اس میں کسی کا اختلاف نہیں۔اور اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قبل وحی نہ لکھنا جانتے تھے اور نہ پڑھنا یہ بھی اتفاقی مسئلہ ہے۔

اس کے بعد اختلاف یہاں سے شروع ہوتا ہے کہ بعد وحی کیا آپ کو لکھنا پڑھنا وہبی طور پر یا معجزانہ طور پر آ گیا تھا یا نہیں۔اس مسئلہ میں راقم الحروف کثرت علماء کی طرف ہے اور مضبوط اور قوی دلائل کی بنیاد پر اسی کی تائید بھی کرتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وحی کے بعد بھی امی ہی تھے، نہ آپ کو پڑھنا آ گیا تھا اور نہ لکھنا۔اور بعض کے نزدیک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی کے بعد پڑھنا لکھنا وہبی طور پر آ گیا تھا۔یعنی کہی سے پڑھا یا لکھا نہیں بلکہ اللہ کی طرف سے بطور معجزہ۔اور رہی بات کسی کو گمراہ یا طعن وتشنیع کرنے کے تو راقم الحروف اس میں احتیاط کے دامن کو ہاتھ سے نہیں چھوڑتا اور سکوت کو بہتر سمجھتا ہوں اور حقیقت حال اللہ ہی کے سپرد کرتا ہوں

وحی کے بعد امی نہ ہونے کے دلائل کا جائزہ:

سب سے پہلے مؤخر الذکر نظریہ کے دلائل کا جائزہ لیتے ہیں اس کے بعد اپنے نظریہ کی وضاحت پیش کریں گے۔

پہلی دلیل:

مذکورہ سورۃ العنکبوت کی آیت ہے جس میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس سے پہلے نہ لکھنا جانتے تھے اور نہ پڑھنا۔ اور آیت میں مذکور ''مِنۡ قَبۡلِهٖ'' کی ضمیر کا مرجع قرآن مجید کی طرف ہے، یعنی قرآن مجید سے پہلے لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے، مگر بعد میں پھر وہبی اور معجزانہ آپ کو لکھنا پڑھنا آگیا تھا۔

جواب: پہلی بات اس آیت میں اللہ تعالی نے مشرکین کے اس قول کا رد کیا جو کہتے تھے کہ ہماری کتابوں میں تو لکھا ہے کہ آخر الزماں جو نبی آئے گا وہ تو امی ہوگا یعنی کسی سے پڑھا لکھا نہیں ہوگا، حالانکہ یہاں تو لوگ کہتے ہیں آپ نے یہ باتیں خود گھڑی ہے اور کسی سے سیکھا یا پڑھا ہے۔تو اللہ تعالی نے ان کے اس قول کی تردید بیان فرمائی کہ رسول اللہ تو قرآن سے پہلے نہ لکھنا جانتے تھے اور نہ پڑھنا۔تو جو صفات پچھلی کتابوں میں نبی آخر الزماں کے بارے میں مذکور ہیں وہی اصل میں یہی نبی ہیں، جو کسی سے پڑھا لکھا نہیں اور نہ پڑھنا لکھنا جانتے ہیں۔

تو اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مشرکین کے قول کا رد کیا جو وہ کہتے تھے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ قرآن مجید سے پہلے تو آپ لکھنا پڑھنا جانتے ہی نہیں تھے پھر کیسے یہ ہوسکتا ہے کہ آپ ایسے معجز کلام پیش کرے، کیا ایسا ہوسکتا ہے کہ جو پڑھا لکھا نہ ہو اور ایسی بلیغ اور معجز کلام پیش کرے۔ تو معلوم ہوا کہ اس کا تعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے امی ہونے کو بتلانا ہے، اور مشرکین کا

اعتراض بھی اسی بات پر تھا کہ آپ پڑھے لکھے ہیں، تو پھر کیسے آیت سے پڑھنے لکھنے کو ثابت کیا جائے؟ یہ تو ایک عام سی بات ہے ہر ایک اس کو سمجھ سکتا ہے، اور پھر احناف کے ہاں ویسے بھی مفہوم مخالف لینا جائز نہیں، یہاں تو مفہوم مخالف لیا جا رہا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم قبل وحی پڑھے لکھے نہیں تھے، تو اس کا مطلب وحی کے بعد پڑھے لکھے بن گئے۔ یہ قطعا درست نہیں۔

دوسری بات آگر آیت سے یہ ثابت کیا جائے کہ آپ کو وحی کے بعد پڑھنا لکھنا آ گیا تھا، تو پھر کفار کے شبہ تو درست ہوگا اس حیثیت سے کہ آپ پڑھنا لکھنا جانتے تھے، مگر یہ الگ بات ہے کہ مسلمان تو اسے وہبی اور معجزہ مانتے ہیں لیکن کفار کی نظر میں تو یہ درست ہوگا کہ آپ تو پرھنا لکھنا جانتے ہے، جب کہ ہماری کتابوں میں اس کے خلاف ہے۔ پھر اللہ تعالی کا کلام معاذ اللہ بے جا ہوگا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پڑھنا لکھنا جانتے تھے جب کہ اللہ فرماتے ہیں کہ نہیں جانتے تھے۔ اور اگر کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ وحی سے پہلی کی بات فرما رہے رہے ہے جو کہ حقیقت ہے اس سے کلام بے جا نہ ہوگا۔ تو عرض ہے کہ پھر امی ہونے کا کمال معنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر صادق نہیں آتا، کیونکہ پھر کفار کا اعتراض اور شبہ تو درست ہوتا کہ آپ تو پرھنا لکھنا جانتے ہے تو اس کا مطلب یہ باتیں آپ اپنی طرف سے بتا رہے ہیں۔ کیونکہ وحی کے نزول کے بعد ہی کفار نے یہ بات کہہ دی کہ یہ کتاب اور باتیں خود گھڑی ہے یا کہی سے سنا ہے، تو پھر وحی کے بعد امی ہونے کا کیا فائدہ؟ جب کہ امی والی آیات تو وحی کے بعد ہے۔

تیسری بات اگر مان لیا جائے کہ اس آیت کا یہی مطلب ہے جو فریق مخالف نے لیا ہے، تو ہمیں بتائے کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر پہلی وحی نازل ہوئی سورۃ العلق کی ابتدائی آیات، تو اس کا مطلب اسی کے ساتھ ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پڑھنا لکھنا آ گیا تھا، پھر کفار نے جب اعتراض کیا کہ یہ کلام خود سے بنایا ہے تو اللہ نے جواب میں فرمایا کہ آپ تو امی ہے، پھر کیسے خود کلام بنا سکتے ہیں؟ اللہ تعالیٰ کے اس جواب کا کیا فائدہ ہوگا؟ جب کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تو

اب تک پڑھنا لکھنا تو آ گیا تھا، پھر اللہ کیسے فرما رہے ہیں کہ آپ امی ہے۔

چوتھی بات اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ:

''وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الطُّوْرِ اِذْ نَادَيْنَا وَلٰكِنْ رَّحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اَتٰـهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ '' (سورۃ القصص آیت 46)

''ترجمہ: اور آپ طور کی جانب نہ تھے جب ہم نے آواز دی اور لیکن آپ کے رب کی طرف سے آپ پر رحمت ہوئی تا کہ آپ ان لوگوں کو ڈرائیں جن کے پاس آپ سے پہلے کوئی ڈرانے والا نہیں آیا تا کہ وہ نصیحت حاصل کریں۔''

اس آیت میں بتلایا گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کوہ طور کے پاس نہ تھے جب ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو آواز دی۔ اب کیا اس کا یہی مراد لیا جا سکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پہلے کوہ طور پر نہ تھے مگر بعد میں وہ کوہ طور پر تھے۔ ہرگز نہیں، تو یہی بات اللہ نے رسول اللہ کے بارے میں فرمائی کہ آپ پہلے پڑھنا لکھنا نہیں جانتے تھے، یہ ایک خبر تھا جو کفار کو دیا، اس سے مراد وحی کے بعد پڑھنے لکھنے کو بتلانا نہیں تھا، کیونکہ کفار کا سوال اس پر دلالت کرتا ہے کہ انہوں نے کہا آپ یہ باتیں اپنی طرف سے بنا رہے ہیں تو اللہ نے فرمایا اپنی طرف سے نہیں بلکہ وہ تو امی ہے کیسے اپنی طرف سے باتیں بنا سکتا ہے

پانچویں بات اسی طرح کفار کا ایک اور اعتراض بھی تھا جو سورۃ الفرقان آیت نمبر 5 میں موجود ہے۔

''وَقَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ''

ترجمہ: ''اور کہتے ہیں کہ یہ تو پچھلے لوگوں کی لکھی ہوئی کہانیاں ہیں جو اس شخص نے لکھوا لی ہیں، اور صبح وشام وہی اس کے سامنے پڑھ کر سنائی جاتی ہیں۔''

اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی کے بعد یا نبوت کے بعد لکھنا پڑھنا آ گیا تھا تو پھر کفار کیا اپنی بات میں سچ ثابت نہیں ہوں گے کیا؟ اگر تمہارے نزدیک بحیثیت مسلمان رسول اللہ لکھنا پڑھنا بطور معجزہ عطاء ہوا تھا، مگر کفار تو اس کو تسلیم نہیں کرتے۔ اور پھر پچھلی کتابوں میں جو امی ہونے کی صفت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں موجود ہے کیا وہ صفت کما حقہ رسول اللہ پر صادق آئے گا؟ نہیں آئے گا کیونکہ جب رسول اللہ کو وحی کے ساتھ یا نبوت کے ساتھ لکھنا پڑھنا آ گیا تو اس کے بعد جب دیگر اہل کتاب آئیں گے یہ دیکھنے کہ آپ واقعی نبی ہے یا نہیں اور ہم اپنی کتاب میں نبی آخر الزماں کی جو صفت امی دیکھا ہے کیا وہ آپ میں موجود ہے یا نہیں، تو ظاہر ہے اس وقت تو آپ کو لکھنا پڑھنا آ گیا تھا، اور پھر اہل کتاب کیسے یقین کرتے کہ آپ امی تھے، آپ کو تو لکھنا پڑھنا آ گیا تھا، تو اس صورت میں امی کی صفت سے کما حقہ آپ متصف نہیں ہو سکتے۔ صرف اس صورت میں آپ اس صفت سے کما حقہ متصف ہو سکتے ہیں جب آپ کو ابتداء تا انتہاء یعنی قبل وحی اور بعد وحی امی تسلیم کیا جائے، اس صورت میں نہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر کوئی شبہ ہو سکتا ہے نہ کتاب اللہ پر، اور نہ امی کے معنی پر بحث ہو سکتا ہے اور نہ اہل کتاب اس شک میں مبتلا ہوں گے کہ ہماری کتاب میں مطلق امی ہونا لکھا ہے جب کہ آپ کہتے ہو پہلے امی تھے اور اب امی ہونا ختم ہوا۔ تو ہم کیسے مان لے۔ اور اس کے علاوہ دیگر شبہات کا بھی سد باب ہوگا۔

اس آیت کی تفسیر میں علامہ ابن جریر طبری رحمہ اللہ نے جو روایات نقل کی ہے وہ ملاحظہ فرمائے:

"عن ابن عباس، قوله: ﴿وَمَا كُنتَ تَتْلُو مِنْ قَبْلِهِ مِنْ كِتَابٍ وَلا تَخُطُّهُ بِيَمِينِكَ إِذًا لارْتَابَ الْمُبْطِلُونَ﴾ قال: كان نبيّ الله ﷺ أمّيا؛ لا يقرأ شيئا ولا يكتب."

''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس آیت کی تفسیر میں منقول ہے کہ آپ نے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم امی تھے، نہ کچھ پڑھ پڑھ سکتے تھے اور نہ لکھ سکتے تھے۔''

'' عن قتادة، قوله: ﴿وَمَا كُنْتَ تَتْلُو مِنْ قَبْلِهِ مِنْ كِتَابٍ وَلا تَخُطُّهُ بِيَمِينِكَ﴾ قال: كان نبيّ الله لا يقرأ كتابا قبله، ولا يخطه بيمينه، قال: كان أُمّيا، والأمّي: الذي لا يكتب.''

''حضرت قتادہ سے مذکورہ آیت کی تفسیر منقول ہے کہ آپ نے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن سے پہلے نہ پڑھ سکتے تھے اور نہ اپنے ہاتھ سے لکھ سکتے تھے، فرمایا کہ رسول اللہ امی تھے اور امی لکھ نہیں سکتا۔''

قارئین کرام! مجھے اس سے انکار نہیں کہ کثرت خلق کیا کہتی ہیں اور قلت خلق کیا کہتی ہے، میں تو ان مفسرین کرام کی باتوں کو مانتا ہوں جن کے عقل اور فہم قرآن ہم سے زیادہ تھا، غور کرے اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی کے بعد پڑھنا لکھنا آ گیا تھا تو کیا ابن عباس اور حضرت قتادہ اس کو بیان کرنے سے گریز کیوں کرتے؟ کیا ان کے ذہن میں یہ بات نہیں آئی ہوگی، آج جب کئی صدیوں بعد ہمارا ذہن اس جانب جا سکتا ہے تو کیا ان کا ذہن اس جانب نہیں جا سکتا؟ اور اگر ایسا ہوتا تو وہ ضرور اس کو بیان کرتے۔ اس پر یہ کہنا کہ ابن عباس و دیگر مفسرین کا کسی قول کی تصریح نہ کرنا اس شئی کی عدم ونفی کو مستلزم نہیں۔ تو عرض ہے کہ بعض چیزیں ایسی ہے جن کو بیان کرنا ضروری نہیں، جن کو ہر ایک سمجھتا بھی ہے، اور تسلیم کرتا ہے، یا ان کا بیان دیگر جگہوں میں آیا ہے، اور بعض چیزیں وہ ہے جہاں مبہم اور مجمل ہوتا ہے اور مراد ظاہر نہیں ہوتا، تو ان کو مفسر بیان کرتا ہے، اب چونکہ رسول اللہ کا امی ہونا ایک امر واضح تھا ہر ایک سمجھتا تھا، سب نے دیکھا تھا، تو اس کو بیان کرنا بھی ضروری نہیں سمجھا۔ ورنہ اگر وحی کے بعد لکھنا پڑھنا آ گیا ہوتا تو ضرور اس بات کی وضاحت فرماتے۔

دوسری دلیل:

" عَنْ عَوْنِ بْنِ عَبْدِ اللّٰه بْنِ عُتْبَةَ، عَنْ أَبِيهِ قَالَ: مَا مَاتَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَتَّى قَرَأَ وَكَتَبَ." (مجمع الزوائد)

"[عون بن عبداللہ بن عتبہ، اپنے والد کا یہ بیان نقل کرتے ہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اس وقت تک وصال نہیں ہوا، جب تک آپ نے پڑھ نہیں لیا اور لکھ نہیں لیا۔"

جواب: اس روایت کو امام طبری نے نقل کیا ہے، اور مجمع الزوائد میں طبری کے حوالے سے موجود ہے کہ یہ روایت منکر ہے اور ابو عقیل ضعیف ہے، اور یہ روایت کتاب اللہ کی معارض ہے۔ اس کا ایک معنی یہ بیان کیا گیا ہے کہ یہ بات عون اپنے والد کے بارے میں کہہ رہا ہے کہ میرے والد عبداللہ بن عتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں لکھنا پڑھنا جان لیا۔ (مجمع الزوائد)

اور اس کے علاوہ ایسی روایات جس میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ نے فلاں صحیفہ پڑھا یا اس طرح کچھ پڑھنے کے الفاظ ہے، ان کو علماء کرام نے ضعیف قرار دیا ہے۔

تیسری دلیل:

ابتداء وحی سے جس وقت وحی کی ابتداء ہو رہی تھی، اور حضرت جبرائیل علیہ السلام آپ کے پاس تشریف لائے بخاری شریف میں روایت موجود ہے کہ آپ غار حراہی میں قیام پذیر تھے کہ اچانک حضرت جبریل علیہ السلام آپ کے پاس حاضر ہوئے اور کہنے لگے کہ اے محمد! پڑھو آپ فرماتے ہیں کہ میں نے کہا کہ میں پڑھنا نہیں جانتا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ فرشتے نے مجھے پکڑ کر اتنے زور سے بھینچا کہ میری طاقت جواب دے گئی، پھر مجھے چھوڑ کر کہا کہ پڑھو، میں نے پھر وہی جواب دیا کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ اس فرشتے نے مجھ کو نہایت ہی زور سے بھینچا کہ مجھ کو سخت تکلیف محسوس ہوئی، پھر اس نے کہا کہ پڑھ! میں نے کہا کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔

پھر تیسیری مرتبہ مجھے بھینچا اور چھوڑ دیا۔

فَقَالَ اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ خَلَقَ الإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ اقْرَأْ وَرَبُّكَ الأَكْرَمُ ''

(بخاری کتاب الوحی)

'' کہنے لگا کہ پڑھو اپنے رب کے نام کی مدد سے جس نے پیدا کیا اور انسان کو خون کی پھٹکی سے بنایا، پڑھو اور آپ کا رب بہت ہی مہربانیاں کرنے والا ہے۔''

اس واقعہ سے استدلال کرتے ہیں کہ جب پہلے دو مرتبہ بھینچا تو آپ نے کہا میں پڑھا ہوا نہیں ہوں اور تیسری مرتبہ بھینچا تو کہا پڑھو، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پڑھنا شروع کیا، معلوم ہوا اس سے پہلے پڑھنا نہیں جانتے تھے، پھر اس کے بعد پڑھنا آ گیا تھا ۔اور اس کے بعد ''علم بالقلم'' کے ذریعہ بوقت ضرورت آپ کو لکھنا آ گیا تھا۔

جواب: اولاً اس واقعہ سے ہرگز یہ ثابت نہیں ہوتا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بعد وحی پڑھنا لکھنا آ گیا تھا، اگر ان آیات سے یہ ثابت ہوتا ہے تو پھر صرف اس آیت سے استدلال کیوں، پوری قرآن سے استدلال کیا جائے، کیونکہ پوری قرآن آپ نے پڑھ کر سنایا ہے اور ہر آیت صحابہ کرام کو پڑھ کر سناتے، تو پھر یہ کہا جائے کہ آپ کو پڑھنا آ گیا تھا۔نہیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم محض اللہ کے حکم سے پڑھا فقط۔اس کے علاوہ دیگر علوم یا مکتوبات وغیرہ کا پڑھنا یہ ثابت نہیں۔

ثانیاً اِقْرَأْ کا مفہوم صرف پڑھنا نہیں آتا، بلکہ دوسروں کو پڑھ کے سنانے اور دعوت دینے کے معنی میں بھی آتا ہے، تو اس صورت میں بھی آپ کا پڑھنا لکھنا لازم نہیں آتا۔

ثالثاً اس سورة کے ابتدائی پانچ آیت سے نزول شروع ہوتا ہے، سب سے پہلی وحی یہی پانچ آیت سے ہوئی، اگر اس کے بعد آپ کو پڑھنا آ گیا تھا تو اس کے بعد کفار نے جو اعتراض کیا کہ

آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ کلام خود بناتا اور لکھتا ہے، تو اللہ تعالیٰ نے اس کا رد سورۃ العنکبوت کی آیت نمبر 48 میں فرمایا کہ '' وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ '' کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تو قرآن سے پہلے نہ پڑھنا جانتے تھے اور نہ لکھنا، کہ کفار شک میں پڑتے، پھر کیسے یہ بات درست ہوگی کہ وہ خود لکھا ہے یا کہی سے پڑھا ہے۔غور کرے اللہ تعالیٰ نے کفار کے اس شبہ کا رد کیا کہ آپ پڑھنا لکھنا نہیں جانتے تھے، اگر ابتداء وحی کے بعد آپ کو پڑھنا لکھنا آ گیا تھا تو کفار کا شبہ تو درست ہوگا کہ آپ کو تو پڑھنا آ رہا ہے اور ہماری کتاب میں لکھا ہے کہ آخری نبی کی صفت امی ہوگی، حالانکہ یہاں معاملہ برعکس ہے، اور کفار کا شبہ بھی اسی حال سے تھا جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کی نزول ہو رہا تھا، پھر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان کہ اگر آپ کو پڑھنا لکھنا آتا تو کفار تو شک میں پڑھتے، یہ تو درست ہوتا کہ کفار تو شک میں پڑھے ہے کیونکہ آپ کو تو پڑھنا آ رہا ہے تو اس آیت کا پھر کیا مطلب۔ تو اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پڑھنا اور لکھنا آ گیا تھا تو اللہ تعالی وحی سے قبل کی نفی کے فورا بعد فرماتے کہ اب ہم نے ان کو پڑھنا اور لکھنا سکھا دیا، یا کسی بھی طریقہ سے اس کو بیان فرماتا، حالانکہ پوری قرآن میں ایسا نہیں فرمایا۔

یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پڑھنا لکھنا نہیں آنے کا مطلب یہ نہیں نعوذ باللہ منہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جاھل تھے، کچھ نہیں آتا تھا، حاشا وکلا ہرگز نہیں آپ کو تمام جہاں کی علوم عطاء کیا گیا تھا آپ دنیا میں سب سے زیادہ جانتے تھے سب سے زیادہ علم رکھنے والے تھے۔اللہ نے آپ کو تمام علوم کا سرچشمہ بنا دیا تھا، مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم صرف وحی کے ذریعہ علوم کے اطلاع دیتے، اور ممکن ہے کہ آپ صلی اللہ علیہِ وآلہ وسلم کو پڑھنا لکھنا سب کچھ آتا تھا، مگر آپ نے ظاہر نہیں کیا باذن خدا تاکہ لوگ شکوک وشبہات میں نہ پڑھے۔ اس لئے اس کا مطلب یہ نہیں کہ آپ کو کچھ نہیں آتا، بلکہ سب کچھ آتا مگر حکمت الٰہی کے تحت بعض

چیزوں کو ظاہر کیا اور بعض کو پوشیدہ رکھا۔

چوتھی دلیل:

صلح حدیبیہ کے موقع پر جب صلح ہو رہا تھا تو صلح کے بعد جب شرائط کو لکھنے کی باری آئی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے اس پر لکھا گیا کہ "ھذا ما قاضانا علیہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم" تو مکہ کے لوگوں نے اعتراض کر دیا کہ ہم جب آپ کو اللہ کا رسول نہیں مانتے تو اس تحریر پر آپ کی رسالت کا ذکر کیوں ہے جب کہ آپ کو ہم محمد بن عبداللہ جانتے ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس معاہدہ میں یہی تحریر کریں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علیؓ کو کہا کہ آپ محمد رسول اللہ میں سے "رسول اللہ" کے لفظ کو ہٹا دیں اور اس کی جگہ محمد بن عبداللہ تحریر کر دیں تو علیؓ نے اس کو ہٹانے سے گریز کیا تو

"فاخذ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ال کتاب فلیس یحسن یکتب فکتب ھذا ما قاضی محمد بن عبداللہ لا یدخل مکۃ السلام الا السیف فی القراب (آخر تک) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے ہاتھ سے کاغذ لے لیا اگرچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خوبصورت لکھنا نہیں آتا تھا لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے ہاتھ سے اس پر لکھنا شروع کیا کہ یہ وہ صلاح نامہ ہے۔ اس پر محمد عبداللہ کے بیٹے نے فیصلہ کیا کہ آپ مکہ میں ہتھیار نہیں لائیں گے صرف تلواریں لا سکتے ہیں لیکن وہ بھی غلاف میں بند ہوں گے (اس طرح آخر تک) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کو لکھ دیا۔ (صحیح بخاری پارہ ۱۷ باب عمرۃ القضا)

اس سے معلوم ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم لکھنا جانتے تھے، جیسے یہاں بذات خود لکھ دیا۔

جواب: اولاً یہ روایت محمول ہے اس روایت پر جس میں موجود ہے کہ آپ صلی اللہ نے خود نہیں لکھا بلکہ حکم دیا لکھنے کا:

"فقال النبي صلى الله عليه وسلم: اكتب باسمك اللهم ثم قال: هذا ما قاضى عليه محمد رسول الله فقال سهيل: والله لو كنا نعلم انك

رسول الله ما صددناك عن البيت ولا قاتلناك ولكن اكتب محمد بن عبد الله. فقال النبي صلى الله عليه وسلم: والله إني لرسول الله وإن كذبتموني اكتب محمد بن عبد الله''

(بخاری شریف شرائط کے مسائل کا بیان)

''آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ باسمک اللہم ہی لکھنے دو۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لکھوایا یہ محمد رسول اللہ کی طرف سے صلح نامہ کی دستاویز ہے۔ سہیل نے کہا اگر ہمیں یہ معلوم ہوتا کہ آپ رسول اللہ ہیں تو نہ ہم آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کعبہ سے روکتے اور نہ آپ سے جنگ کرتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو صرف اتنا لکھئے کہ "محمد بن عبداللہ" اس پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اللہ گواہ ہے کہ میں اس کا سچا رسول ہوں خواہ تم میری تکذیب ہی کرتے رہو لکھو محمد بن عبداللہ''

اسی طرح ابو اسحاق فرماتے ہیں میں نے براء بن عازب سے سنا وہ فرماتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حدیبیہ کی صلح کی تو اس کی دستاویز حضرت علی رضی اللہ عنہ نے لکھی تھی۔ انہوں نے اس میں لکھا محمد اللہ کے رسول کی طرف سے۔ مشرکین نے اس پر اعتراض کیا کہ لفظ محمد کے ساتھ رسول اللہ نہ لکھو، اگر آپ رسول اللہ ہوتے تو ہم آپ سے لڑتے ہی کیوں؟

''فَقَالَ لِعَلِيٍّ: امْحُهُ، فَقَالَ عَلِيٌّ: مَا أَنَا بِالَّذِي أَمْحَاهُ، فَمَحَاهُ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِيَدِهِ، وَصَالَحَهُمْ عَلَى أَنْ يَدْخُلَ هُوَ وَأَصْحَابُهُ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ، وَلَا يَدْخُلُوهَا إِلَّا بِجُلُبَّانِ السِّلَاحِ، فَسَأَلُوهُ مَا جُلُبَّانُ السِّلَاحِ، فَقَالَ: الْقِرَابُ بِمَا فِيهِ''

(بخاری شریف صلح کے مسائل)

''آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ رسول اللہ کا لفظ مٹادو، علی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں نے کہا کہ میں تو اسے نہیں مٹا سکتا، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود اپنے

ہاتھ سے وہ لفظ مٹا دیا اور مشرکین کے ساتھ اس شرط پر صلح کی کہ آپ اپنے اصحاب کے ساتھ (آئندہ سال) تین دن کے لیے مکہ آئیں اور ہتھیار میان میں رکھ کر داخل ہوں، شاگردوں نے پوچھا کہ جلبان السلاح (جس کا یہاں ذکر ہے) کیا چیز ہوتی ہے؟ تو انہوں نے بتایا کہ میان اور جو چیز اس کے اندر ہوتی ہے (اس کا نام جلبان ہے)۔''

علامہ بدر الدین عینی رحمہ اللہ (855ھ) اس حدیث کی شرح میں بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

''اگر کوئی کہے کہ اللہ تعالیٰ نے تو فرمایا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم امی ہے اور امی تو لکھ نہیں سکتا، پھر کیسے لکھا؟ میں کہتا ہوں اس کے کئی جوابات ہیں، پہلا جواب یہ ہے کہ امی وہ ہے جو نہ لکھنا جانتا ہے اور نہ لکھ سکتا ہے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ یہاں کتابت کی نسبت مجازا ہے، اس لئے رسول اللہ نے خود لکھنے کا حکم دیا، اور سہیلی فرماتے ہیں کہ صحیح بات یہ ہے کہ رسول اللہ نے حضرت علی کو حکم دیا لکھنے کا۔۔۔۔ تیسرا جواب یہ ہے کہ رسول اللہ نے خود خرق عادت بطور معجزہ لکھ دیا۔''

(عمدۃ القاری شرح بخاری جلد 17 ص/ 351 دار الکتب بیروت)

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ:

'' وَعَنْ قِصَّةِ الْحُدَيْبِيَةِ بِأَنَّ الْقِصَّةَ وَاحِدَةٌ وَالْكَاتِبُ فِيهَا عَلِيٌّ، وَقَدْ صَرَّحَ فِي حَدِيثِ الْمِسْوَرِ بِأَنَّ عَلِيًّا هُوَ الَّذِي كَتَبَ. فمعنى (كتب) أي: (أَمَرَ بِالْكِتَابَةِ)، وَاللَّهُ أَعْلَمُ.''

(فتح الباری شرح بخاری جلد 7 ص/ 503-504)

''اور قصہ حدیبیہ سے (رسول اللہ کی کتابت پر) جو استدلال پیش کیا جاتا ہے، وہ فقط ایک ہی قصہ ہے اور اس میں بھی کاتب حضرت علی ہے، اور اس کی تصریح مسور کی حدیث میں موجود ہے کہ وہ حضرت علی نے لکھا، پس (کتب) کا معنی یہ ہے کہ (آپ صلی اللہ علیہ وسلم

نے لکھنے کا حکم دیا) واللہ اعلم۔‘‘

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ:

’’وَمَنْ زَعَمَ مِنْ مُتَأَخِّرِي الْفُقَهَاءِ كَالْقَاضِي أَبِي الْوَلِيدِ الْبَاجِيّ وَمَنْ تَابَعَهُ أَنَّهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ كَتَبَ يَوْمَ الْحُدَيْبِيَةِ: "هَذَا مَا قَاضَى عَلَيْهِ مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِ اللَّهِ" فَإِنَّمَا حَمَلَهُ عَلَى ذَلِكَ رِوَايَةٌ فِي صَحِيحِ الْبُخَارِيّ: (ثُمَّ أَخَذَ فَكَتَبَ): وَهَذِهِ مَحْمُولَةٌ عَلَى الرِّوَايَةِ الْأُخْرَى: (ثُمَّ أَمَرَ فَكَتَبَ)‘‘

(تفسیر ابن کثیر جلد/ 6ص/ 285-286)

’’اور متاخرین میں سے جن لوگوں نے یہ گمان کیا ہیں جیسے قاضی ابوالولید باجی اور اس کے متبعین نے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حدیبیہ کے دن خود لکھا " ہَذَا مَا قَاضَی عَلَیۡہِ مُحَمَّدُ بۡنُ عَبۡدِ اللّٰہِ " پس اس پر وہ روایت محمول کیا ہے جو بخاری شریف میں ہے (ثم اخذ فکتب) اور یہ روایت دوسری روایت پر محمول ہے اور وہ یہ ہے (ثم امر فکتب)۔‘‘

ثانیاً: علامہ بدرالدین عینی رحمہ اللہ نے جیسے فرمایا کہ مجازی طور پر لکھنے کی نسبت رسول اللہ کی جانب کیا گیا ہے، تو یہ حق ہے عموماً ہم کتابوں میں بھی پڑھتے ہے اور روزمرہ زندگی میں اس کا مشاہدہ بھی کرتے ہیں جب بھی کسی بادشاہ نے کوئی مکتوب کہی بھیجا ہے تو وہاں نسبت اس بادشاہ کی جانب کیا جاتا ہے، کہ یہ خط فلاں بادشاہ نے لکھ کر آپ کے لئے بھیجا ہے، حالانکہ وہ خود نہیں لکھا بلکہ کاتبین سے لکھوایا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ:

’’وَقَالَ فِرْعَوْنُ يٰهَامٰنُ ابْنِ لِيْ صَرْحًا لَّعَلِّيْٓ اَبْلُغُ الْاَسْبَابَ ۙ‘‘(سورۃ الغافر آیت /36)

ترجمہ:’’اور فرعون نے (اپنے وزیر سے) کہا کہ اے ہامان! میرے لیے ایک اونچی عمارت بنادو تاکہ میں ان راستوں تک پہنچوں۔‘‘

یہاں بھی فرعون نے اپنے وزیر سے جب کہا کہ میرے لئے اونچی عمارت بناؤ، تو کیا یہاں یہ کہا جائے گا کہ عمارت فرعون نے بنائی یا ہامان نے؟ نہیں بلکہ بنایا تو مزدوروں نے مگر نسبت فرعون یا ہامان کی جانب ہوا۔

اس طرح وہاں بھی حکم رسول اللہ نے دیا نسبت رسول اللہ کی جانب کیا گیا۔ عموما ایسا ہوتا ہے کہ خط آپ لکھے یا کسی سے لکھوا کر کہی بھیج دے تو نسبت آپ کی جانب ہوتا ہے کہ آپ نے لکھا ہے۔ حالانکہ ہمیشہ تو میں نہیں لکھا کاتب نے بھی لکھا ہے۔

ثالثاً بالفرض اگر تسلیم کرلیا جائے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود لکھا ہے تو پھر رسول اللہ نے سلاطین کو جو مکاتیب بھیجے وہ تو کاتبین نے لکھے، تو سوال یہ ہے کہ یہ مکاتیب رسول اللہ نے خود کیوں نہیں لکھے؟ حالانکہ لکھنا چاہیے تھا ۔ اہل انصاف اور خردمند ذرا غور کرے تو آپ کو سمجھ آجائے گا وحی کے بعد تا حیات رسول اللہ نے کچھ نہیں لکھا، اتنے مکاتیب اور قرآن کا نزول اس کے علاوہ دیگر معاملات میں کچھ نہیں لکھا صرف ایک روایت ہے وہ بھی صاف اور شفاف ہے جس کا معنی وہ نہیں جو فریق مخالف سمجھتا ہے، بلکہ وہ بھی مجازا کہا ہے، جیسے دوسری روایات سے اس کی تائید ہوتی ہے، تو کیا ضرورت تھی یہاں صرف چند الفاظ لکھنے کے؟ اگر لکھنا آ گیا تھا تو مکاتیب وغیرہ بھی لکھتے۔ بات صاف اور شفاف ہے کوئی ایسی روایت موجود نہیں اور نہ قرآن سے اس کی تائید ہوتی ہے اور نہ قرون اولی کے اکابرین امت سے، فقط ایک روایت ہے اور وہ بھی ایسی روایت جو یہاں کچھ اور الفاظ کے ساتھ ہے دوسرے جگہ میں کچھ اور الفاظ کے ساتھ تو فقط اپنے عقل کی بنیاد پر کچھ کہہ کر اپنے دعویٰ کو قائم کرنا یقیناً افسوس کی بات ہے۔

رابعاً اس کا جواب خود سورۃ العنکبوت کی مبحوث فیہ آیت میں مذکور ہے اگر اس پر غور کیا جائے تو صلح حدیبیہ والا اور آیت خود بخود اظہر من الشمس ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ '' وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ '' اس

آیت میں دو بات قابل ذکر ہے، پہلی بات فرمایا کہ" ولاتخطہ " کہ آپ لکھ نہیں سکتے تھے، دوسری بات" بیمینک " فرمایا، جب پہلی بات سے یہ حاصل ہوگیا کہ آپ لکھنا نہیں جانتے تھے، اور یہ ظاہر ہے لکھنا ہاتھوں سے ہوتا ہے، پھر آگے دوسری بات فرمانے کی کیا ضرورت تھی ،تو وہ پہلی بات کو مزید پختہ کرنے کے لئے لایا کہ ممکن ہے کوئی کہتا کہ یہاں کتابت سے مراد مجازی ہے کہ لکھتے تو خود تھے مگر نسبت آپ کی جانب نہیں کیا گیا، دوسری لفظ لاکر بتادیا کہ معنی مجازی مراد نہیں بلکہ آپ اپنے ہاتھ ہی سے نہیں لکھ سکتے تھے، اگر وحی کے بعد آپ کو لکھنا آ گیا ہوتا تو دوسری لفظ" بیمینک " کی تصریح نہ کرتا۔

پانچویں دلیل:

حضرت یزید بن عبداللہ بیان کرتے ہیں کہ ہم (بصرہ کے محلہ) مربد میں تھے کہ ایک شخص آیا۔اس کے سر کے بال بکھرے ہوئے تھے اور وہ ہاتھ میں سرخ چمڑے کا ایک ٹکڑا لیے ہوئے تھا۔ہم نے کہا: تم گویا دیہات کے رہنے والے ہو؟ اس نے کہا: ہاں ۔ہم نے کہا: یہ تیرے ہاتھ میں چمڑے کا ٹکڑا کیسا ہے، ذرا ہمیں دکھاؤ؟ وہ اس نے ہمیں دے دیا۔ہم نے اسے پڑھا تو اس میں تحریر تھا:'' محمد رسول اللہ ﷺ کی طرف سے بنی زہیر بن اقیش کے لیے۔تم لوگ اگر لا إلہ إلا اللہ محمد رسول اللہ کی شہادت دو' نماز قائم کرو' زکوۃ ادا کرو' غنیمت میں سے پانچواں حصہ (خمس) اور نبی ﷺ کا حصہ خاص صفی ادا کرو' تو اللہ اور اس کے رسول کی امان سے امن میں ہو۔'' ہم نے پوچھا: یہ تحریر تمہارے لئے کس نے لکھا، کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے۔

(ابوداؤد)

بعض لوگوں نے الفاظ کی یہ زیادتی بھی کی ہے کہ جب اس سے کہا گیا جی ہاں رسول اللہ نے یہ تحریر لکھوا کر دی ہوگی ،تو اس نے کہا نہیں یہ تو رسول اللہ کے اپنے دست مبارک سے لکھی گئی تھی ۔

جواب: اولاً راقم الحروف کی نظر میں جو روایت ہے اس میں یہ الفاظ نہیں کہ یہ تحریر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دست مبارک سے لکھی ہے، بلکہ اس میں صرف یہ موجود ہے کہ ”یہ تحریر تمہارے لئے کس نے لکھی، تو اس نے کہا رسول اللہ نے“ آگے ایسے الفاظ موجود نہیں ہے ۔

ثانیاً اس جیسے جتنی روایات یا واقعات ہے ان کا مطلب یہی ہے کہ رسول اللہ نے لکھوائی ہے خود نہیں لکھا، جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مکتوبات کے بارے میں سیرت کی کتابوں میں موجود ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہرقل یا مقوقس یا دیگر سلاطین کو دعوتی مکتوبات لکھ کر بھیجا، تو جیسے یہاں یہ ثابت نہیں کہ یہ مکتوبات رسول اللہ نے خود نہیں لکھی بلکہ لکھوائی ، ایسا ہی دیگر روایات بھی اسی پر محمول ہیں۔

ثالثاً مذکورہ روایت میں جس مکتوب کا ذکر ہے، راقم الحروف کو کتابوں میں ایسے مکتوب کا ذکر نہیں ملا، ممکن ہے موجود ہو مگر یاد رہے خیر القرون کے بعد بعض تحاریر لوگوں نے گھڑ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب منسوب کیا، جس پر اس دور کے علماء نے اسے پہچان کر رد کیا۔

ممکن ہے دیگر مکتوبات کی طرح یہ مکتوب بھی اس قبیلہ کی جانب بھیجا ہو، تو بات واضح ہے دیگر مکاتیب کی طرح یہ بھی لکھوا کر بھیجا ہوگا، اور آخر میں جو بات پیش کیا جاتا ہے کہ یہ تحریر رسول اللہ نے خود اپنے دست مبارک سے لکھا تھا، تو وہ شخص جس کیسے پتہ چلا کہ رسول اللہ نے اپنے دست مبارک سے لکھی ہے؟ کیا وہ رسول اللہ کو خود دیکھا تھا یا کسی سے سنا تھا، اور جس کے پاس وہ مکتوب ہے اس کی تفصیلات موجود نہیں کہ وہ کون تھا، خط اس کو کہا سے ملا تھا، اس کی تفصیلات بھی موجود نہیں۔

چھٹی دلیل:

”ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجاعہ بن مرارہ کو ایک خط لکھ کر دیا جسے اس

کے پوتے ہلال نے خلفیہ عمر بن العزیز کو دکھایا تو فاخذہ عمر ف قبلہ ووضع علی عینیہ ومسح بہ وجھہ وجاء ان یصیب وجھہ موضع ید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انہوں نے اسے پکڑ کر چوما اور سر آنکھوں پر لگایا کہ میں قربان جاؤں یہ میرے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاتھوں کا لکھا ہوا ہے۔"

(الاسماء والکنی ص ۱۱۱ ج ۲)

جواب: اس میں تو" ید رسول اللہ" کے الفاظ ہے نہ کہ" کتب رسول اللہ" اس سے تو صاف ظاہر ہے کہ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ کا مکتوب ہے، مگر خود انہوں نے لکھا، اس پر تو تصریح نہیں ہے۔ اور اگر ہو بھی جاتا تب بھی ہمیں مضر نہیں، کیونکہ اس جواب ماقبل دیا جا چکا ہے۔

ساتویں دلیل:

واقعہ قرطاس سے استدلال کیا گیا ہے، کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مرض میں اضافہ ہوا تو آپ نے فرمایا کہ سامان کتابت لاؤ میں میں تمہارے لئے ایک مکتوب لکھوں گا جس کے بعد تم گمراہ نہ ہوسکو گے۔ (بخاری کتاب العلم) اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لکھنا جانتے تھے تبھی کہا کہ سامان کتابت لاؤ میں تمہارے لئے لکھوں گا۔

جواب: ماقبل دلائل کے جوابات سے اس کا جواب خود بخود ظاہر ہوتا ہے، کہ یہاں بھی مطلب یہ نہیں میں لکھوں گا بلکہ لکھواؤں گا، باقی تفصیلات ماقبل دلائل کے جوابات سے اس کا جواب بھی حل ہو چکا ہے۔

قائلین امی کے دلائل:

مدعی وہ ہوتا ہے جو نئی چیز کا دعویٰ کرے اور اگر وہ دعوی چھوڑ دے تو مقدمہ ختم ہو، چونکہ اس مسئلہ میں مدعی فریق مخالف ہے جنہوں نے نئی چیز کا دعویٰ کیا ہے، اور اگر وہ اپنے دعویٰ چھوڑ دے تو مسئلہ ہی ختم ہوگا، تو اس سلسلہ میں ان کے دلائل کا جائزہ لیا گیا، اب آتے ہیں اپنے مدعیٰ کی جانب کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ امی ہی رہے، وحی سے پہلے بھی اور وحی کے بعد بھی۔

راقم الحروف اس مسئلہ میں کسی کو طعن و تشنیع اور گمراہ وغیرہ کہنے کی جرأت نہیں کرتا، کیونکہ یہ مسئلہ نہ ایمانیات سے ہے اور نہ قطعیات سے جس کی بناء پر تکفیر و تضلیل کا حکم صادر کیا جائے، مضبوط اور ظاہری دلائل کی بنیاد پر فریق اول کو محض خطاء پر جانتا ہوں۔

نزاع اور اختلاف چونکہ امی ہونے کے بعد کا ہے، یعنی وحی نازل ہونے تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم امی ہی رہے اس میں کسی کا اختلاف نہیں، یہ ایک مسلمہ مسئلہ ہے اور اس پر قرآن و حدیث دال ہے، وحی کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم امی رہے یا نہیں اختلاف و نزاع اسی میں ہے، اس پر فریق ثانی نے قرآن و حدیث کے ظاہری الفاظ سے استدلال کیا ہے، وہ بھی قرآن کی ایک آیت اور حدیبیہ کا واقعہ اہم سمجھا جاتا ہے، باقی قرآن کی ایک آیت بھی اس پر دلالت نہیں کرتا اور نہ ہوتی زخیرہ احادیث میں کوئی ایک ایسا حدیث موجود ہے جس میں صراحت ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ لکھا ہے یا پڑھا ہے، جن روایات کو بنیاد بنا کر اس نظریہ کی عمارت کھڑی کر دی گئی ان میں سوائے حدیبیہ کے سب ضعیف ہے غیر صحیح ہے۔ کاش حدیبیہ کے واقعہ میں بھی الفاظ کے تبدیلی نہیں ہوتی تب بھی بات بن سکتی تھی۔ مگر وہاں بھی دوسری روایات میں موجود ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ نے حکم دیا لکھوانے کا، صرف ایک روایات میں موجود ہے کہ رسول اللہ نے ایسے الفاظ لکھا، تو اس کو بھی دیگر روایات پر محمول کیا جس میں دوسرے کو لکھوانے کا حکم ہے۔ بالفرض خود بھی اگر لکھا ہے تب بھی بطور معجزہ لکھا ہوگا، اور ایسے کچھ الفاظ لکھنے سے امی ہونے پر فرق نہیں پڑتا، اور نہ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ کو لکھنا آیا تھا۔

اس کے علاوہ اور کوئی ایسی آیت اور صحیح رویات موجود نہیں جس سے یہ بات ثابت ہو جائے

۔

جب یہ بات ثابت نہیں تو رسول اللہ کا امی ہونا جو ایک امر مسلم تھا جس کی صراحت قرآن و

حدیث میں موجود ہے، جو مسلم بین الفریقین ہے، وہ خود بخود ثابت ہو گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تا حیات امی رہے، اور دلائل نقل کرنے کی ضرورت نہیں وہ تو قرآن وحدیث میں موجود ہے، جو فریق مخالف کو بھی مسلم ہے۔

ان دلائل پر اگر یہ کہا جائے کہ بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امی ہونے کی تصریح موجود ہے مگر وہ قبل وحی پر محمول ہوں گے، اور رسول اللہ کو قبل وحی امی کہا گیا تھا اس کے بعد نہیں ۔تو عرض ہے کہ اگر قرآن وحدیث میں اس کی تصریح ہوتی تو کون اس کو تسلیم کرنے سے انکار کرتا ۔ جب موجود نہیں ہے اور نہ رسول اللہ کے اقوال وافعال سے اس کا ثبوت ملتا ہے تو کیوں ایک امر مسلم اور ظاہر مسئلہ کو ہم کسی اور طرف پھیر دے ۔ جو عقل ونقل دونوں کے خلاف ہے۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قبل وحی اور بعد وحی امی ہونا ضروری ہے، بصورت دیگر بہت خرابیاں لازمی آئیں گے۔

اس صورت میں امی کا مفہوم کما حقہ آپ پر صادق نہیں آتا، کیونکہ جیسے پچھلی کتابوں میں امی کی وصف بیان ہوا ہے وہ مطلق امی ہونا مذکور ہے، اگر ہم وحی کے بعد رسول اللہ کو امی تسلیم کرے تو جو یہودی رسول اللہ کو دیکھتے وہ ضرور یہ کہتے کہ ہم نے تو اپنی کتب میں نبی آخر الزماں کی صفت امی ہونا دیکھا ہے جب کہ آپ تو امی نہیں ہے، آپ کو تو پڑھنا لکھنا آتا ہے، اگر چہ رسول اللہ کو بطور معجزہ ہی پڑھنا لکھنا آتا ہو، ہم مسلمان لاکھ دفعہ تسلیم کرے کہ آپ امی تھے اور پڑھنا لکھنا بعد میں آپ کو بطور معجزہ آیا، مگر کیا کفار اس بات کو تسلیم کریں گے؟ ہر گز نہیں کیونکہ انہوں نے جو وصف پایا ہے اپنی کتب میں وہ تو موجود ہی نہیں ۔ اور حکمت بھی اسی میں تھا کہ آپ کو قبل وحی اور بعد وحی پڑھنا لکھنا نہ آئے، تا کہ کفار پر مکمل اتمام حجت ہو، کہ آپ امی ہی تھے جیسے تم لوگ اپنی کتب میں یہ صفت پاتے ہو۔

اگر آپ کو وحی کے بعد پڑھنا لکھنا آتا تو ضرور آپ لکھتے بھی پڑھتے بھی، مگر ہم دیکھتے ہیں

رسول اللہ کی سیرت اور قرآن وحدیث میں کہی بھی اس کی تصریح نہیں ملتی کہ رسول اللہ نے کچھ لکھا ہے یا کچھ پڑھا ہے، حدیبیہ پر اپنا نام لکھنے سے تو یہ بھی لازم نہیں آتا کہ آپ کو پڑھنا لکھنا آیا تھا، اور ویسے بھی جو بالکل بھی پڑھا لکھا نہ ہو وہ بھی کم از کم اپنا نام تو لکھ سکتا ہے، اگرچہ حدیبیہ کے موقع پر علماء نے اسے خرق عادت قرار دیا ہے مگر ممکن ہے وہ خرق عادت نہ ہو اور رسول اللہ نے لکھا ہو، مگر اس سے کہا لازم آتا ہے کہ آپ نے لکھنا سیکھ لیا تھا، مکتوبات لکھتے یا اس کے علاوہ دیگر کچھ تحاریر لکھتے تب یہ بات ہوسکتی تھی کہ رسول اللہ کو لکھنا آیا تھا، فقط نام لکھنے سے یا چار پانچ الفاظ سے نہ امی ہونے پر اثر پڑتا ہے اور نہ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ پڑھے لکھے تھے۔

اور پھر اگر پڑھنا لکھنا آپ کو بطور معجزہ آیا تھا، تو علماء کرام ضرور اس کو معجزات میں شمار کر کے اس کا تذکرہ کرتے، مگر اسے معجزات میں بھی شمار نہیں کیا ہے۔ (باقی اس شبہ میں نہ پڑنا چاہیے کہ علماء نے تو حدیبیہ کے لکھنے کو معجزہ شمار کیا ہے، وہ ممکنہ جوابات میں سے ہے، یقینی نہیں)

اس بحث کا تعلق رسول اللہ کی صفت اول امی ہونے سے ہے، جو مسلمانوں کے ہاں مسلم ہے اور قرآن میں مذکور ہے، اب آتے ہیں صفت ثانیہ کی طرف۔

آیت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی دوسری صفت جو بیان ہوئی ہے وہ یہ کہ آپ کی صفات پچھلی کتابوں میں موجود ہے، جی ہاں یہ بھی نبوت کے دلائل میں سے ایک اہم دلیل ہے کہ آپ کا ذکر پچھلی کتابوں میں موجود ہے، ہمارے زمانے تک اب تک پچھلی کتابوں میں بہت تحریفیں ہوئی ہیں اور یہ ایک حقیقت ہے جسے بالکل بھی نہیں جھٹلایا جا سکتا، مگر پھر بھی انہیں تحریف شدہ کتابوں میں اب بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات واشارات وبشارات واضح الفاظ میں موجود ہے، ماننے والے تو پہلے بھی تسلیم کئے ہیں اور اب بھی تسلیم کریں گے، نہ ماننے والوں کے لئے ہمارے پاس کچھ بھی نہیں، اسے صرف بغض وعناد پر محمول کیا جا سکتا ہے۔ ورنہ ہر یہودی و عیسائی کو کھلے عام دعوت ہے کہ وہ تعصب کے چشمے اتار کر قرآن کا مطالعہ کرے اسلامی نظریات

واحکام کا مطالعہ کرے اور رسول اللہ کی سیرت کا مطالعہ کرے، پھر اپنی کتابوں کا مطالعہ کرے صرف اور صرف حق کو تلاش کرنے کی نیت سے تو ان شاء اللہ اسے حق صاف شفاف نظر آئے گا کہ حق کس طرف ہے، ورنہ متعصب شخص کے لئے اگر پوری انجیل وتورات سے ایک نہیں ہزاروں بشارات واشارات پیش کرے بھی وہ اس میں تاویل کرے گا اور ماننے سے انکار کرے گا۔لہذا تسلیم کرنے والے اور متلاشیان حق کے لئے ہم ذرا پچھلی کتابوں کی جانب رخ کرتے ہیں کہ کیا واقعی رسول اللہ کی صفت امی پچھلی کتابوں میں موجود ہے یا نہیں۔

رسول اللہ کی صفت امی پچھلی کتابوں میں:

مجموعہ کتاب مقدس، یسعیاہ کتاب میں موجود ہے کہ:

''اس لئے جو بھی کلام نازل ہوا ہے وہ تمہارے لئے سر بہ مہر کتاب ہی ہے۔ اگر اُسے کسی پڑھے لکھے آدمی کو دیا جائے تا کہ پڑھے تو وہ جواب دے گا،'' یہ پڑھا نہیں جا سکتا، کیونکہ اس پر مہر ہے۔ اور اگر اُسے کسی ان پڑھ آدمی کو دیا جائے تو وہ کہے گا، میں ان پڑھ ہوں۔''

(یسعیاہ29:11/ 12)

اس میں قرآن کے ساتھ ساتھ رسول اللہ کی امی ہونے کی صفت بھی موجود ہے،

مصنف کا امی ہونے پر بحث اور اس کا جائزہ:

مصنف نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے امی ہونے کا انکار کیا ہے، چنانچہ انہوں سرے سے امی کو غلط ثابت کرنے کی سعی نا تمام کیا ہے، مگر ان کے کچھ دلائل کے جواب جو اپنے مدعیٰ پر پیش کیا ما قبل بحث میں دیا گیا ہے، اس کے علاوہ کچھ باتیں اضافی ہے ان کے جوابات بھی ملاحظہ کرے۔

ہم کہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم امی تھے، رسول اللہ نہ لکھ سکتے تھے اور پڑھ سکتے

تھے۔اوراس کا ذکرسورۃ الاعراف میں مذکور ہے، جو ماقبل ذکر ہوا ہے۔اس پر مصنف نے اپنے قلم کو یوں حرکت دی ہے کہ:

''پہلی دلیل کی تائید میں مسلمانوں کی طرف سے سورۂ الاعراف کی وہ آیت پیش کی جاتی ہے جس میں محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو''نبی الاُمّی'' کہا گیا ہے۔مسلمان لفظ''اُمّی''کے معنی''ناخواندہ'' بتاتے ہیں۔مگر ربی ابراہیم گیگر(Geiger AbrahamRabbi) نے صاف ظاہر کر دیا ہے کہ جس لفظ کے معنی اس آیت میں''ناخواندہ'' بتائے جاتے ہیں وہ درحقیقت ''غیر یہودی''(Gentile) کے معنی رکھتا ہے۔ربی مذکور کے اس قول کی تصدیق سورۂ آل عمران کی اس آیت سے بھی ہوتی ہے جس میں نبی کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ''اُمیئین اور اہل کتاب سے بات کریں''۔'' وَقُل لِّلَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ وَالْأُمِّيِّينَ أَأَسْلَمْتُمْ ''۔اس آیت میں صاف ظاہر ہے کہ عربوں کو عام طور سے '' وَالْأُمِّيِّينَ '' یعنی غیر یہودی''Gentile'' کہا گیا ہے۔علاوہ ازیں سورۂ عنکبوت آیت ۲۷ اور سورۂ حم آیت ١٦ میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ منصب نبوت اسحٰق و یعقوب کی اولاد کو عطا کیا گیا۔ اسمٰعیل کی اولاد کا ذکر نہیں ہے،اس لئے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود کو دیگر انبیا سے الگ کرنے کے لئے اُمّی یعنی''غیر یہودی''(Gentile) بیان کیا ہے، کیونکہ دیگر انبیا اسحٰق کی اولاد میں مبعوث ہوئے تھے۔''

سورۃ الاعراف کی آیت میں جو امی کا ذکر ہے کہ رسول اللہ امی تھے، اس پر مصنف نے دو بات پیش کی ہے، پہلی بات یہ کہ رسول اللہ کے لئے امی کا ہونا غیر یہودی کے معنی میں ہے، یعنی رسول اللہ پڑھے لکھے تھے مگر یہودی نہیں تھے، اس لئے اس کا معنی غیر یہودی ہے۔اور دوسری بات نبوت کا منصب حضرت اسحاق و یعقوب علیہما السلام کی اولاد کو عطاء کیا گیا، حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد کا ذکر نہیں، اس لئے رسول اللہ نے خود کو دیگر انبیاء سے الگ کرنے کے لئے امی یعنی غیر یہودی بیان کیا ہے۔

پہلی بات کی دلیل میں ربی ابراہیم گیگر کا قول پیش کیا ہے، کہ امی ہونے سے مراد غیر یہودی ہے، اور دلیل میں سورۃ آل عمران آیت نمبر 20 پیش کیا ہے۔ جس میں فرمایا گیا کہ ''وَقُل لِّلَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ وَالْأُمِّيِّينَ أَأَسْلَمْتُمْ ''اس میں امی سے مراد غیر یہودی ہے۔ مگر اس سے صرف غیر یہودی مراد نہیں بلکہ ہر وہ شخص جوان پڑھ ہو، پڑھا لکھا نہ ہو وہ مراد ہے، اور وہ ہے مشرکین، پہلا فرمایا کہ اہل کتاب یعنی جن کو کتاب دیا گیا، اور وہ یہودی وعیسائی ہیں، اس کے علاوہ دیگر کو امی کہا، اس لئے وہ پڑھے لکھے نہیں تھے، اور اسی لئے رسول اللہ کو بھی امی کہا کہ وہ بھی پڑھا لکھا نہیں تھا۔ بات تو صاف ہے کہ یہاں بھی امی سے مراد وہ جو پڑھا لکھا نہ ہو، اور دیگر جہاں قرآن میں آیا ہے وہاں بھی یہی مراد ہے، جیسے سورۃ الجمعہ میں فرمایا کہ " هو الذی بعث فی الامیین رسولا منهم "یعنی اللہ تعالیٰ نے امیین (ان پڑھ لوگوں) میں سے رسول بنا کر بھیجا۔ یہاں تو یہاں مراد وہ مشرکین ہیں جو اہل کتاب یعنی یہودی وعیسائی نہیں تھے، صرف غیر یہودی کا قید نہیں بلکہ امی سے مراد اہل کتاب کے علاوہ مشرکین ہے، یا وہ لوگ جن کا مذہب و کتاب نہیں۔

دوسری بات کہ منصب نبوت فقط اسحاق و یعقوب علیہما السلام کی اولاد کو عطاء کیا گیا حضرت اسماعیل کا ذکر نہیں۔ اس لئے رسول اللہ نے دیگر انبیاء سے الگ کرنے کے لئے اپنے کو امی ظاہر کیا۔ تو عرض ہے کہ منصب نبوت فقط اولاد اسحٰق و یعقوب میں منحصر نہیں۔ مصنف نے سورۃ العنکبوت کی جس آیت کا حوالہ دیا، اس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر ہے کہ" ہم نے اُن کو اسحٰق اور یعقوب بخشے اور اُن کی اولاد میں پیغمبری اور کتاب (مقرر) کر دی اور ان کو دنیا میں بھی اُن کا صلہ عنایت کیا اور وہ آخرت میں بھی نیک لوگوں میں ہوں گے" یہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ شروع ہے اس لئے فرمایا کہ ان کی اولاد میں ہیغمبری اور کتاب مقرر کر دی، یہ نہیں فرمایا کہ ہیغمبری اور کتاب انہیں کی اولاد کے ساتھ خاص اور منحصر ہے، اس کے علاوہ

دوسرے اولاد میں پیغمبری نہیں دی۔ منصب نبوت کو فقط اولاد اسحٰق و یعقوب میں منحصر کرنا یہ مصنف کا تعصب پن اور اختراع ہوسکتا ہے حقیقت میں ایسا کچھ نہیں۔

مجموعہ کتاب مقدس، کتاب پیدائش میں موجود ہے کہ:

''رب کے فرشتے نے اس (ہاجرہ) سے کہا اپنے مالکن (سارئی یا سارہ) کے پاس واپس چلی جا اور اس کی تابع رہ۔ میں تیری اولاد اتنی بڑھا دوں گا کہ اسے گنا نہیں جاسکے گا۔ رب کے فرشتے نے مزید کہا، تو (ہاجرہ) امید سے ہے ایک بیٹا ہوگا، اس کا نام اسماعیل یعنی (اللہ سنتا ہے) رکھ۔''

(پیدائش 9:16 / 11 صفحہ 28)

اسی طرح باب 17 آیت 20 میں بھی موجود ہے کہ:

''میں اسماعیل کے سلسلے میں بھی تیری درخواست پوری کروں گا، میں اسے بھی برکت دے کر پھلنے پھولنے دوں گا اور اس کی اولاد بہت ہی زیادہ بڑھا دوں گا وہ بارہ رئیسوں کا باپ ہوگا اور میں اس کی معرفت ایک بڑی قوم بنا دوں گا۔''

عیسائی مفسر ولیم میکڈونلڈ باب 16 کی آیات کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ:

'' اس (فرشتے) نے اسے مشورہ دیا کہ وہ واپس جا کر اپنے آپ کو ساری ہے قبضے میں کردے، اور اس سے وعدہ کیا کہ اس کا بیٹا ایک بہت بڑی قوم کا سربراہ ہوگا۔ یہ وعدہ عرب قوم میں پورا ہو چکا ہے۔''

(تفسیر الکتاب جلد/ 1 صفحہ/ 61 مطبوعہ لاہور)

لیجئے جو کہتے ہیں کہ منصب نبوت حضرت اسحٰق و یعقوب علیہما السلام کی اولاد میں منحصر ہے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد سے نبی نہیں ہوا یا نہیں ہوگا۔ ان کی منہ پر ولیم میکڈونلڈ کا زوردار تمانچہ ہماری طرف سے قبول کیجئے۔

اس کے بعد مصنف نے صلح حدیبیہ اور واقعہ قرطاس کی جانب اشارۃً کہا ہے کہ ان واقعات

سے آپ کا لکھنا پڑھنا ثابت ہوتا ہے۔مگران کے جوابات اور بحث ماقبل گزر چکا ہے۔اوراس کے بعدایک تسلیمی جواب دیتا ہے، چنانچہ لکھتے ہے کہ:

''لیکن اگر ہم یہ بھی مان لیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نوشت وخواند (لکھنا پڑھنا) سے واقف نہیں تھےتو بھی اس کا امکان باقی رہتا ہے کہ انہوں نے بہت سی باتیں یہودی اور دیگر ذرائع سے حاصل کی ہوں گی اور قرآن کی آیات اور یہودی تحریروں کا جو ہم نے مقابلہ کیا ہے ان سے یہ بات پوری طرح ثابت ہوتی ہے۔لیکن اسی کے ساتھ ایک بات اور بھی ہے، وہ یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ معلومات زبانی حاصل ہوئی تھیں اور غالباً ایسے لوگوں سے حاصل ہوئی تھیں جن کو کتابی علم بہت کم حاصل تھا۔یقیناً محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے یہ بات متعدد وجوہ کی بنا پر ناممکن تھی کہ وہ ارامی،عبرانی، فارسی یا یونانی کتب کا مطالعہ کرتے،لیکن یہ بات کسی صورت سے بھی ناممکن نہ تھی کہ وہ اپنے یہودی، ایرانی اور نصرانی صحابہ اور شاگردوں سے ان کی روایات سن لیتے۔''

مصنف کا یہ کہنا کہ بالفرض مان لیا جائے کہ آپ پڑھے لکھے نہیں تھے،مگر ممکن ہے کہ آپ کو یہ سب زبانی یاد ہو یا زبانی کہی سے سنا ہو۔

یہ بھی مصنف کا اپنا خام خیال ہے، حقیقت سے اس کا کچھ تعلق نہیں، جب ثابت ہو چکا ہے کہ آپ امی تھے، اوراس کا مشاہدہ آپ کے زمانے میں لوگوں نے کیا بھی،تو اب یہ کہنا کہ ممکن ہے کہی سے سنا ہو یا پڑھا ہو غیر معقول بات ہے، کیونکہ جب امی تھے پڑھے لکھے نہیں تھے تو کہی سے سننا یا پڑھنا بھی تو اسی میں داخل ہوا یعنی نہ آپ لکھ سکتے تھے اور نہ پڑھ سکتے تھے، پھر یہ کہنا کہ کہی سے سنا ہوگا غیر معقول اور خلط مبحث ہے، امی ہونا جب تسلیم کرلیا اس کے بعد یہ باتیں لغو ہوں گے، ان سب کا تعلق امی سے ہے، امی ہونا ثابت ہوا تو یہ بات ہوسکتی ہے کہ کہی سے سنا ہو یا لکھا ہو یا پڑھا، جب امی ہونا ثابت ہی نہیں تو یہ باتیں خلط مبحث اور خارج از موضوع ہے۔

اس کے بعد وہی اعتراضات پر تبصرہ کیا ہے جو رسول اللہ کے زمانے میں کفار اور مشرکین

نے کیا تھا، کہ یہ قرآن معاذ اللہ رسول اللہ نے خود لکھا ہے، یا کہی سے سنا ہے، یا کہی سے پڑھ کر سناتا ہے، یا کوئی اس کو سکھا رہا ہے، اس جیسے تمام اعتراضات کے جوابات قرآن میں موجود ہیں، جو آج تک ایسا ہی لاجواب ہے، اس دور کے کفار و مشرکین نے بھی ان جوابات سے عاجز آ گئے اور ان کو جرأت نہیں ہوئی جواب دینے اور آج بھی ان شاء اللہ کوئی جرأت نہیں کر سکتا اور نہ قیامت تک کوئی ان جوابات کو رد کر سکتا ہے اور نہ جواب دے سکتا ہے۔ قرآن کے ایک جواب پر موصوف نے تبصرہ کیا ہے، ذرا وہ ملاحظہ کرے:

> ''سورۂ النحل میں جب یہ الزام لگایا گیا کہ ''انمّا یعلّمه بشر'' تو اس کا جواب یہ دیا گیا کہ جن کی نسبت یہ لوگ اشارہ کرتے ہیں، ان کی زبان عربی نہیں ہے اور قرآن خالص عربی زبان میں ہے۔ لیکن اصلی الزام کا کوئی جواب نہیں دیا گیا جو یہ تھا کہ قرآن کی زبان نہیں بلکہ قرآن میں جو قصص درج ہیں وہ محمد ﷺ کو بتائے گئے ہیں۔ تفسیر عباسی میں لکھا کہ جس ''بشر'' کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، وہ ایک نصرانی مسمی قیس تھا۔ تفسیر جلالین میں جبر اور یسار لکھا ہے۔ بعض کہتے ہیں سلمان فارسی مشہور صحابی کی طرف اشارہ ہے۔ بعض صحیب بتاتے ہیں اور بعض اس کا نام رڈاس لیتے ہیں۔''

مصنف کو اعتراض یہ ہے کہ اصل مضمون کا جواب نہیں دیا گیا، اصل مضمون یہ ہے کہ کفار کو یہ اعتراض تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی شخص یہ سکھاتا ہے پھر وہ آ کر ہمارے سامنے بیان کرتا ہے۔ اس کا جواب اللہ تعالیٰ نے یہ دیا کہ جن کی طرف یہ لوگ نسبت کرتے ہیں سکھانے کا، وہ تو ایک عجمی ہے جبکہ یہ کلام تو فصیح عربی ہے، پھر کیسے ایک عجمی اس طرح کلام پیش کر سکتا ہے۔ وہ عجمی کون تھا اس بارے میں مفسرین کرام مختلف نام بیان کرتے ہیں، بہر کیف جو بھی ہو مگر تھا وہ عجمی۔

تو مصنف کو اعتراض اس بات پر ہے کہ اصل مضمون کا جواب نہیں دیا گیا، اصل مضمون یہ تھا کہ جو قصص قرآن میں درج ہے وہ رسول اللہ کو کوئی اور سکھاتا ہے۔ سبحان اللہ! سچ ہے کہ

متعصب کو ہر چیز الٹا نظر آتا ہے، متعصب صحیح بات کا حلیہ بگاڑ دیتا ہے، مگر اس کو شعور نہیں ہوتا اصل میں وہ اپنی جہالت اور حماقت کا مظاہرہ کر رہا ہوتا ہے۔

جب کفار نے یہ کہا کہ اس کو کوئی اور سکھاتا ہے تو اللہ نے اسی کا جواب دیا کہ وہ تو عجمی ہے یہ عربی ہے، اور کفار نے پھر کس پر اعتراض کیا قرآن پر، اور قرآن میں کیا ہے؟ یہی قصص اور احکامات ہیں تو کفار نے تو مطلق قرآن پر اعتراض کیا جس میں قصص اور دیگر سب آجاتے ہیں، ان سب کا جواب اللہ نے یہی دیا کہ وہ تو عجمی ہے۔

بالفرض ہم مصنف کے احمقانہ جملہ کو لیتے ہیں، کہ اصل بات کا جواب نہیں دیا جو یہ تھا کہ قرآن میں جو قصص ہے وہ اس کو سکھاتا ہے، اچھا تو پھر وہ بندہ ہے عجمی، اور قصص سناتا ہے عجمی زبان میں تو رسول اللہ تو عربی ہے جو عربی جانتا ہے، اور دوسری زبان اس کو نہیں آتی، خود مصنف کہتا کہ ''یقیناً محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے یہ بات متعدد وجوہ کی بنا پر ناممکن تھی کہ وہ ارامی، عبرانی، فارسی یا یونانی کتب کا مطالعہ کرتے'' ظاہر ہے رسول اللہ کو وہ زبان نہیں آتی، تو پھر کیسے رسول اللہ اس کے پاس جا کر اس سے سیکھتا؟

بات یہ ہے کہ میں پہلے بھی کہا ہوں کہ جاہل تو ہم نے بہت دیکھے مگر اس جیسا جاہل بلکہ جاہل مرکب بہت کم بلکہ پہلی مرتبہ دیکھ رہا ہوں۔ جس کو جملوں کا معنی سمجھ نہیں آتا خواہ مخواہ بس اپنے اپنی جہالت کا مظاہرہ کر ہی دیتا ہے۔

غور کرے کفار کا اعتراض فقط قصص پر نہیں تھا، اور نہ کسی خاص جملے پر یا کسی خاص واقعے پر ،ان کا اعتراض مطلق قرآن پر تھا کہ یہ جو کلام سناتا ہے وہ اس کو کوئی سکھاتا ہے، اس میں تو سب آگئے قصص، اور دیگر کلام مکمل۔ تو اللہ نے جواب دیا کہ وہ تو عجمی ہے یہ عربی ہے۔ اس پر تو مصنف کو ہمت نہیں ہوئی جواب دینے کی، الٹا اپنی حماقت پر مہر لگا دیا۔

ورقہ بن نوفل و دیگر سے کلام لینے کا الزام:

آگے مصنف نے حضرت خدیجہ کبریٰ رضی اللہ عنہا کی عم زاد بھائی ورقہ بن نوفل اور عثمان بن حویرث کا اشارۃً تذکرہ کیا ہے کہ رسول اللہ نے ان سے بھی کلام لیا ہے، اور اپنے اصحاب میں سے بھی جو پہلے یہودی یا عیسائی یا دیگر مذاہب سے تعلق رکھتے تھے۔ اگرچہ مصنف نے ان پر شواہد و دلائل نہیں دیئے ہیں صرف اشارۃً تذکرہ کیا ہے اور یہ اعتراض دیگر معترضین کی جانب سے بھی کیا جاتا ہے، اس لئے ہم یہاں اس کا جواب دیں گے، مزید کہی اور اس کا بحث آجائے تو یہی جواب وہاں بھی سمجھا جائے۔

بحیرہ راہب:

شام کے سفر میں ابوطالب کی ملاقات بحیرہ راہب سے ہوئی، اس وقت رسول اللہ کی عمر 12 سال سے زیادہ نہیں تھی، یعنی 11 یا 12 سال کی عمر میں ابوطالب نے آپ کو شام کی سفر میں اپنے ساتھ لے گیا۔ اور پھر وہاں بحیرہ راہب سے ملاقات ہوئی، انہوں نے رسول اللہ کو پہچان لیا کہ یہ نبی ہونے والا ہے، کیونکہ وہ یہودی مذہب کے راہب تھے تورات سے واقف تھے، اور تورات میں رسول اللہ کی علامات موجود تھے۔ تو انہوں نے یہ پیشنگوئی کی یہ اللہ کا رسول ہے۔

اس واقعہ پر مخالفین نے یہ اعتراض کیا ہیں کہ ممکن ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بحیرہ سے علوم حاصل کیا ہو۔

یہ ایک غیر معقول اور تعصب پر مبنی اعتراض ہے، جو عقلیات سے نابلد اور علم سے یتیم شخص ہی کر سکتا ہے۔ اصولاً اگر اس کا جواب دیا جائے تو ہم کہیں گے معترضین نے یہ واقعہ کہاں سے دیکھ کر اعتراض کر لیا؟ کیا اسلامی کتب سے یا غیروں کی کتابوں سے یہودی یا عیسائی سے؟ اول ماخذ کیا ہے اس کا، ظاہر ہے یہ واقعہ رسول اللہ کی سیرت سے متعلق ہے، اور سیرت نگاروں

نے اس واقعہ کو قلم بند کیا ہیں، تو اصولا جو اعتراض ہوتا ہے اس کا سیدھا سادہ جواب یہ ہے کہ جو تم کہتے ہو رسول اللہ نے ممکن ہے بحیرہ سے علوم سیکھے ہو، اس کا ثبوت پیش کرو کسی بھی کتاب سے۔ بصورت دیگر یہ تمہارے اپنے فاسد خیالات ہے، اور ہر فاسد خیالات کے حامل شخص کے جواب ہمارا ذمہ نہیں۔ اور نہ دلائل کی دنیا میں اس کو اہمیت حاصل ہے۔

اس کے علاوہ بحیرہ راہب نے تو کہا تھا کہ یہ اللہ کا رسول ہے۔ بحیرہ کے اس بات سے تو رسول اللہ کی نبوت ثابت ہوا، اگر مخالفین اس کا انکار کرتے ہے تو کس بنیاد پر؟ اگر اس بنیاد پر کہ یہ من گھڑت اور ثابت نہیں تو تمہارا اعتراض باطل ہے جو تم کرتے ہو کہ ممکن ہے وہاں سے علوم سیکھے ہو، کیونکہ جب واقعہ من گھڑت ہے تو اس سے استدلال کیسے درست ہوگا۔ اور اگر اس بنیاد پر کہ بحیرہ سے ملاقات ثابت نہیں یا دیگر کسی بھی وجہ سے اس کا انکار کریں گے تو تمام صورتوں میں اعتراض باطل ہوگا کیونکہ جب واقعہ کی صحت تسلیم نہیں پھر اعتراض کہا سے درست ہوگا۔

ورقہ بن نوفل:

ورقہ بن نوفل بن اسد کے متعلق مخالفین نے کافی زور لگایا ہے کہ کسی طرح ثابت کرے کہ رسول اللہ نے انہیں سے بہت کچھ لیا ہے، حتی کہ ورقہ کے تمام علمی ذخائر کو قرآن کا نام دیا، مزید پہلی وحی کے بعد جب تین سال فترۃ کا زمانہ تھا وہاں یہ الزام ٹوک دیا کہ اس دوران رسول اللہ نے ورقہ کے کچھ تحاریر تھے تورات وانجیل سے متعلق جو وہ لکھا کرتے تھے، ان کو ترتیب دیا اور بعد میں وحی کا دعویٰ کیا، اور یہاں تک رسول اللہ ورقہ کی موجودگی میں دعویٰ نبوت نہیں کیا کیونکہ وہ جانتا تھا، اگر ابھی دعوی کیا تو سب سمجھ جائیں گے، ورقہ کے جانے کے بعد انہوں نے دعوی نبوت کیا۔

میں ان تمام خرافات و بکواسات کا جواب صرف دو جملوں میں دوں گا، کیونکہ ماننا ویسے انہوں نے نہیں دلائل کی دنیا میں ان کے پاس محض خیالات فاسدہ و وہمی قیاسات ہیں، باقی

دلائل کچھ بھی نہیں محض اپنی سوچ ہے، ایسی سوچ کو اس میدان میں ہم اقبال کے قول ع

اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں

پر عمل کر کے جوتے کے نوک پر رکھتے ہیں۔

پہلی بات اگر رسول اللہ نے ورقہ بن نوفل سے کچھ سیکھا یا پڑھا یا پھر ان کی تحاریر جمع کر کے قرآن کا نام دیا تو پہلی وحی جو نازل ہوئی، وہ ورقہ سے ملاقات سے پہلے تھا اور اس کے بعد ہی حضرت خدیجہ نے آپ کو ورقہ کے پاس لے گئی، تو پہلی وحی وہ کہاں سے لیا؟ جب کہ اس سے پہلے تو ورقہ سے ملاقات ہی نہیں ہوئی تھی۔ اور پھر یہ الزام تب درست ہو سکتی تھی جب پورا قرآن بیک وقت نازل ہوتا، تو کوئی کہہ سکتا کہ رسول اللہ نے یہ کہی سے مرتب کیا ہے ادھر ادھر سے جمع کر کے، مگر ورقہ سے ملنے کے بعد ورقہ 3 یا 4 سال بعد انتقال کر گئے اور قرآن کا نزول 23 برس تک جاری رہا، تو بتائے جس وقت اہل کتاب یا مشرکین سوال کرتے یا اعتراض کرتے تو اس کا جواب اللہ تعالیٰ دیتے، یہ کس وقت کا تھا؟ کیا یہ بھی نوفل سے لیا تھا؟ نوفل تو اس وقت دنیا میں تھے ہی نہیں، یا پھر مخالفین کے نزدیک نوفل عالم الغیب تھا جنہوں نے آنے والے دور کی باتوں کو بھی لکھ دیا اور رسول اللہ نے ایسا ہی کر دیا، کیونکہ جب جاہل اپنی جہالت کا مظاہرہ کرتا ہے تو ایسی باتیں کرنا اس کے لئے مشکل نہیں۔ اور اگر رسولا اللہ نے نوفل سے کچھ لیا ہے تو جب نوفل کو یہ سب معلوم تھا پھر وہ خود نبوت کا دعویٰ کیوں نہیں کیا؟

دوسری بات: مصنف آگے باب چہارم میں لکھتے ہیں کہ:

”اس امر کا کوئی قابل اطمینان ثبوت نہیں ہے کہ محمد ﷺ کے زمانہ میں عہد نامۂ جدید کا کوئی عربی ترجمہ موجود تھا۔“

جب رسول اللہ کے زمانے میں عہد نامہ جدید یعنی انجیل کا ترجمہ موجود نہیں تھا تو یہ باتیں رسول اللہ نے کہاں سے لی؟

بالفرض والمحال اگر رسول اللہ نے یہ سب ورقہ سے لیا، تو معجزات پھر کہا سے لیا؟ کیونکہ رسول اللہ سے معجزات بھی بہت صادر ہوئے خود کفار ومشرکین نے بھی دیکھ لیا بڑے بڑے معجزات صادر ہوئے، کیا وہ بھی ورقہ سے لیا تھا؟ اگر نہیں ہرگز نہیں تو پھر بتاؤ کیا غیر نبی سے ایسی باتوں کا صدور ہوسکتا ہے؟ جو نبوت کا دعویٰ کرے اور ایسا فعل ان سے صادر ہو جو خلاف عادت ہو۔ ہرگز نہیں، یہ محض رسول ہی کا خاصہ ہوتا ہے۔ جب یہ ثابت ہوا تو قرآن کا کلام اللہ ہونا خود بخود ثابت ہوگا۔ مزید میں مخالفین کی تابوت میں آخری کیل ٹھونک کر یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ، دلائل اور شواہد سے ثابت کرو کہ رسول اللہ نے نوفل سے کچھ سیکھا یا پڑھا تھا۔ یا مسلسل ان کا ملنا جلنا ثابت ہو۔ اپنے دعاوی کو دلائل وشواہد سے ثابت کرو، ورنہ تمہاری سوچ کو ہم جوتے کے نوک پر بھی نہیں رکھتے، کیونکہ ممکن جو تمہاری سوچ ہے وہ غلط ہو، اور جو تم سوچ رہے ایسا نہ ہو، ضروری نہیں جو تم نے کہا وہی صحیح ہے، اس لئے اپنی سوچ اور قیاس اپنے پاس رکھو تاریخی حوالے سے جو شواہد ہیں وہ پیش کرو۔

اس کے بعد مصنف نے اشارۃً یہ بات کردی ہے کہ رسول اللہ نے اپنے اصحاب سے کچھ معلومات حاصل کی ہے، مگر ان پر کلام نہیں کیا ہے، صرف وعدہ کرکے آگے بحث شروع کیا ہے کہ ہم آگے چل کر یہ سب ثابت کریں گے۔ جہاں ثابت کرے گا وہاں ان شاء اللہ جواب ملے گا۔

فصل پنجم: باب چہارم کا تعاقب

اسلام پر نصرانیت اور عیسائیوں کی مشکوک کتب کا اثر:

اس عنوان کے بعد مصنف اس باب میں یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ رسول اللہ نے قرآن عیسائیوں سے لیا ہے، اور قرآن کا ماخذ عیسائی کتب یا عیسائی مذہب سے تعلق رکھنے والے افراد ہیں۔ اور اس کے بعد بطور تمہید عیسائیت کا پس منظر پیش کیا ہے، کہ رسول اللہ کے زمانے میں عیسائیوں کی حالت کیسی تھی، اور تاریخی حوالے سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ کے دور میں عیسائی مذہب گویا عرب میں اپنی آخری سانسیں لے رہی تھی، اصل مذہب کا حلیہ بگاڑ دیا گیا تھا، مسیحی عقائد ورسوم کو چھوڑ دیا گیا تھا، اور غلط قسم کے نظریات ان میں حلول کئے تھے، جس کی وجہ سے رسول اللہ ان عقائد ورسوم سے متنفر ہوئے، اور رسول اللہ کا واسطہ کبھی اصل انجیل سے نہیں پڑا، وہ صرف فی الوقت رائج واقعات کو سنتا اور اسی لئے ان سے بیزار ہوا اور نیا دین پیدا کرنے کا خیال ان کے دل میں آیا، اور چونکہ رسول اللہ چاہتے تھے کہ یہود ونصاری اسلام قبول کرے، اور نصاری بہت کم تھے، مگر چونکہ نصرانیت بازنطینی سلطنت کی سرکاری مذہب تھا اس لئے وہ چاہتا کہ یہ لوگ اسلام قبول کرے، اگر اسلام قبول نہیں کریں گے تو ممکن ہے پیچیدگیاں پیدا ہو جائیں، اسی لئے رسول اللہ نے اپنے نبی ہونے کے لئے انجیل سے کام لیا اور یہ کہہ دیا کہ مسیح نے ان کی بعثت کی پیشنگوئی کی ہے، اور اس کے لئے قرآن کی آیتوں کی نسبت ان کی طرف کئے ہیں ۔

اول الذکر باتیں چونکہ غیر یقینی اور مستشرقین کے اپنے قیاسات ہیں، جو انہوں نے اپنے غلط دعاوی کو ثابت کرنے کے لئے بطور تمہید پیش کئے ہیں۔ مؤخر الذکر باتوں کا ہم جائزہ لیتے ہیں۔
کہ رسول اللہ نے انجیل سے اپنے نبی ہونے کے لئے کام لیا۔

کیا محمد نے اپنے نبی ہونے پر انجیل سے کام لیا؟

اس سلسلہ میں سب سے پہلے مصنف کا قضیہ آپ کے سامنے رکھتے ہیں، چنانچہ لکھتے ہیں کہ:

''اگر عرب کے نصاریٰ اسلام نہ لائے تو ممکن ہے کہ سیاسی پیچیدگیاں پیدا ہو جائیں۔ اس خیال سے انہوں نے اپنے مامور من اللہ ہونے کے ثبوت میں انجیل سے بھی کام لیا اور یہاں تک کہہ دیا کہ مسیح نے ان کی بعثت کی نسبت پیش گوئی کی ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عیسیٰ کی نسبت الفاظ ''کلمته منّه اسمه المسیح عیسیٰ ابن مریم'' اور ''إِنَّمَا الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُولُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهُ'' استعمال کئے ہیں۔ مگر وہ یسوع کی الوہیت اور مصلوبیت کے منکر ہیں اور تعلیمات انجیل سے اپنی پوری لاعلمی ظاہر کرتے ہی۔ تاہم وہ انجیل کی نسبت عزت واحترام کے الفاظ استعمال کرتے ہیں اور بہت سی آیات میں انجیل کو آسمانی کتاب بیان کیا ہے جو ''عیسیٰ پر آسمان سے نازل ہوئی'' اور یہ بھی لکھا ہے کہ قرآن بھی انجیل کی تصدیق اور اس کی حفاظت کرنے کے لئے نازل ہوا ہے۔''

یا خدا! کیا عالم ہے تضادات کا، ایک طرف کہتے ہیں کہ رسول اللہ کے زمانے میں انجیل کا عربی ترجمہ موجود نہیں تھا، اور خود عیسائی بھی انجیل کو زیادہ نہیں دیکھتے بس اس دور کے راہبوں سے ہی واقعات سن کر عمل کرتے۔

پھر دوسری جانب یہ دعوی کہ رسول اللہ اپنے مامور من اللہ ہونے کے لئے انجیل سے کام لیا اور کہا کہ میری پیشنگوئی انجیل میں بھی موجود ہے۔

سب سے پہلی بات پیشنگوئی کے بارے میں سمجھ لے کہ پیشنگوئی کسے کہتے ہیں۔ مستقبل میں کسی چیز کے بارے میں خبر دینے کو پیشنگوئی کہتے ہیں، پیشنگوئی پہلے ہوتا ہے اور وقوع اس کا بعد میں ہوتا ہے، وقوع ہونا یا نہ ہونا یہ تو اس پیش گوئی کرنے والے پر منحصر ہے کہ وہ جھوٹی

پیشگوئی کرے یا سچی یا وہ خبر بعد میں وقوع ہو یا نہ ہو ۔ جب رسول اللہ کے بارے میں انجیل میں پیشگوئی موجود ہے تو یہ پیشگوئی ظاہر ہے حضرت عیسی علیہ السلام نے کیا ہے، بعد میں کسی نے تو تحریف نہیں کی بقول عیسائی، جب یہ انجیل صحیح تحریف شدہ نہیں اور پیشگوئی بھی صحیح ہے، اور رسول اللہ نے انجیل پڑھا بھی نہیں ہے، تو کیسے وہ ان پیشگوئیاں اپنے لئے مختص کر سکتا ہے؟

یہ اعتراض تب واقع ہوتا جب رسول اللہ انجیل پڑھتا اور اس کے بعد جو پیشگوئیاں تھی ان کے مطابق وہ باتیں یا عمل کرتا اور دعویٰ کرتا دیکھو جیسے انجیل میں پیشگوئی ہے وہ مجھ پر صادق آتی ہے، مگر رسول اللہ ایک طرف سے امی تھے پھر انجیل کو پڑھا بھی نہیں تھا پھر کیسے یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے لئے راہ ہموار کرنا چاہتا ہے۔

اگر کوئی کہے کہ انجیل کو اگرچہ نہیں پڑھا تھا، مگر ممکن ہے اس دور کے راہبوں سے یا انجیل کے جاننے والوں سے سنا ہوگا، وہ یہ پیشگوئیاں بیان کرتے ہوں گے اور رسول اللہ سن کر اپنے لئے راہ ہموار کیا۔ تو عرض ہے کہ کیا صرف رسول اللہ نے وہ سنا اور کوئی وہاں موجود نہیں تھا کیا؟ سب نصرانیوں کے درمیان صرف رسول اللہ وہ سننے تھے اور دوسرے عرب کہا تھے؟ عقلا یہ درست ہے ہرگز نہیں بلکہ بالفرض راہبوں اور انجیل کے جاننے والوں نے اگر بیان کیا ہوگا تو وہاں رسول اللہ کے ساتھ سب ہوں گے سب نے یہ سنے ہوں گے، صرف رسول اللہ کا سماع غیر معقول ہے ۔ جب سب نے سنا ہوگا تو پھر اور لوگوں نے کیوں نبوت کا دعویٰ نہیں کیا؟ (جس نے کیا بھی اس پر یہ پیشگوئیاں صادق نہیں آئے، جب کہ ہمارا دعوی اور مدعا اس بات پر ہیں کہ رسول اللہ سے پہلے کیا کوئی ایسا مدعی نبوت تھا جس نے یہ پیشگوئیاں اپنے اوپر لازم قرار دیتا اور وہ اس پر صادق آتے؟ ورنہ ایسے تو ہر دور میں مدعی نبوت گزرے ہیں رسول اللہ سے پہلے بھی اور بعد میں بھی) اور یہ پیشگوئیاں اپنے نبوت کے لئے استعمال نہیں کیا؟ اگر ایسا ہوتا تو رسول اللہ کے مدمقابل اور لوگ بھی کھڑے ہوتے اور نبوت کے دعوی کے ساتھ یہ پیشگوئیاں اپنے پر فٹ کرتے ۔ اور

نبوت کی علامات ان میں موجود ہوتا۔ مگر ایسا ہرگز نہیں بالفرض کسی نے اگر رسول اللہ کے مد مقابل نبوت کا دعوی بھی کیا تو وہ جھوٹا دعویٰ تھا، اس لئے نبوت کی علامات و پیشگوئیاں اس میں ہرگز موجود نہیں تھے۔ اگر علامات اور پیشگوئیاں کسی پر صادق آتے ہیں تو وہ صرف اور صرف ایک ہی ذات تھی، اور وہ عبداللہ کے بیٹے محمد تھے۔

انجیل یوحنا میں موجود ہے کہ:

''جب وہ مددگار آئے گا جسے میں باپ کی طرف سے تمہارے پاس بھیجوں گا تو میرے بارے میں گواہی دے گا، وہ سچائی کا روح ہے جو باپ میں سے نکلتا ہے۔ تم کو بھی میرے بارے میں گواہی دینا ہے، کیونکہ تم ابتداء سے میرے ساتھ رہے ہو۔''

(یوحنا15:26/27)

دیکھیے یہ پیشگوئی رسول اللہ ہی کے لئے ہے، فل حال ہمارا اس میں بحث نہیں کہ کیسے رسول اللہ کے لئے ہے، کیا ثبوت ہے وغیرہ۔ ہم اسے رسول اللہ کے لئے پیشگوئی مانتے ہے، مصنف نے دعویٰ کیا ہے کہ رسول اللہ نے انجیل سے اپنے لئے راہ ہموار کرنا چاہا۔

جب رسول اللہ انجیل سے ناواقف تھے، انجیل پڑھا نہیں تھا، تو بتائے یہ بات انہیں کیسے پتہ چلا پھر انہوں نے راہ ہموار کیا؟ اپنے نبوت کے لئے راہ ہموار تو تب کرتا جب انجیل پڑھتا اور پھر اسی کے مطابق عمل کرتا پھر دعوی کرتا دیکھو یہ میری پیشگوئی ہے، جب پڑھا ہی نہیں تو کیسے یہ بات ممکن ہوسکتی ہے۔

اس کے علاوہ اس کی بہترین مثال تورات، استثناء کی وہ آیت ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر صادق آتا ہے، جس میں دس ہزار رفقاء اور فاران کے پہاڑ کا ذکر ہے۔ وہ تو من وعن رسول اللہ پر صادق آتا ہے۔ مگر چونکہ ہمارا بحث نصرانیت و انجیل سے متعلق ہے اس لئے اس پر یہاں گفتگو کرنا نہیں چاہتے۔

حضرت مسیح علیہ السلام کے بارے میں قرآن کا بیان کردہ حقائق اور مصنف کی جہالت:

حضرت مسیح علیہ السلام اور حضرت مریم علیہا السلام کے بارے میں قرآن نے جو حقائق بیان کئے ہیں مصنف کو ان سے اختلاف ہے کہ اصل میں یہ سب سنی سنائی غیر مستند روایات ہے جسے محمد نے سن کر قرآن میں لکھ دیا، چنانچہ لکھتے ہیں کہ:

''محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ بھی کہا کہ عیسیٰ کنواری عورت کے پیٹ سے پیدا ہوئے تھے۔اور قرآن میں مسیح کے بہت سے معجزات بھی بیان کئے گئے ہیں ،مگر یہ سب کچھ روایتی زبان میں ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یسوع مسیح اور اس کے حوارین کی نسبت معلوم ہوا وہ سب غیر مستند سنی سنائی باتوں پر مبنی تھا۔ہم آگے چل کر دکھائیں گے کہ جو کچھ قرآن میں لکھا ہے وہ ان بیانات سے بہت کچھ مطابق ہے جو اناجیل مشکوک الصحتہ اور کتب ضالّین میں درج ہے۔اب ہم قرآن کے بعض وہ قصص لیتے ہیں جو نصرانیت سے تعلق رکھتے ہیں اور یہ دکھائیں گے کہ وہ کن ذرائع سے ماخوذ معلوم ہوتے ہیں۔''

مصنف کو ہر حال میں اپنی جہالت آشکارہ کرنی ہے،تو شوق سے کرے ہمیں تو بہر صورت حقائق اہل انصاف اور حقیقت پسند کے عدالت میں لانا ہے۔

قرآن میں جو واقعات و معجزات حضرت مسیح علیہ السلام کے بارے میں نازل ہوئے ہیں، وہ تو حق اور سچ ہے اس میں کسی قسم کا شک وشبہ نہیں۔ بالفرض اگر وہ اناجیل اربعہ یا پھر اناجیل مشکوک الصحتہ (ہمارے نزدیک تو تمام اناجیل مشکوک الصحتہ ہے یہ علی قول المصنف کہہ رہا ہوں) میں نہ بھی ہوتب بھی قرآن کی صحت پر فرق نہیں پڑتا، کیونکہ جس کتاب کی پیشگوئی صحت مشکوک ہو اس کی بنیاد پر ایسی کتاب کو غلط نہیں کہا جا سکتا جس کی صحت میں شک نہ ہو۔

آیئے دیکھتے ہیں قرآن نے جن تفصیلات کا ذکر کیا ہیں کیا وہ بقول عیسائی و مستشرقین معتبر

اناجیل اربعہ میں ہے کہ کہیں۔

سب سے پہلی بات جس کا ذکر مصنف نے کیا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کنواری عورت کے بطن سے پیدا ہوئے تھے۔قرآن مجید میں اس کا ذکر یوں ہے:

'' قَالَتْ أَنَّىٰ يَكُونُ لِي غُلَامٌ وَلَمْ يَمْسَسْنِي بَشَرٌ وَلَمْ أَكُ بَغِيًّا'' (سورۃ مریم آیت 20)

''مریم بولی: میرے ہاں بیٹا کیسے ہوگا، جب مجھے کسی بشر نے چھوا بھی نہیں اور نہ میں بدکار ہوں؟''

دوسرے مقام پر یوں فرمایا کہ:

'' قَالَتْ رَبِّ أَنَّىٰ يَكُونُ لِي وَلَدٌ وَلَمْ يَمْسَسْنِي بَشَرٌ ۖ قَالَ كَذَٰلِكِ اللَّهُ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ'' (سورۃ آل عمران آیت 47)

''مریم نے کہا: اے میرے رب! میرے ہاں بچہ کیسے ہوگا جب مجھے کسی مرد نے ہاتھ تک نہیں لگایا؟ فرمایا: اللہ جو چاہتا ہے پیدا کر دیتا ہے۔''

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیح علیہ السلام کے پیدائش بغیر باپ کے ہونے کا ذکر فرمارہے ہیں۔ انجیل میں حضرت عیسی علیہ السلام کے پیدائش کے بارے میں جو واقعہ ہے وہ بھی ملاحظہ فرمائیں:

'' عیسی مسیح کی پیدائش یوں ہوئی اس وقت اس کی ماں مریم کی منگنی یوسف کے ساتھ ہو چکی تھی کہ وہ روح القدس سے حاملہ پائی گئی۔ابھی اُن کی شادی نہیں ہوئی تھی۔اُس کا منگیتر یوسف راست باز تھا، وہ علانیہ مریم کو بدنام نہیں کرنا چاہتا تھا۔اِس لئے اُس نے خاموشی سے یہ رشتہ توڑنے کا ارادہ کرلیا۔وہ اس بات پر ابھی غور وفکر کر ہی رہا تھا کہ رب کا فرشتہ خواب میں اُس پر ظاہوا اور فرمایا، یوسف بن داؤد، مریم سے شادی کر کے اُسے اپنے گھر لے آنے سے مت ڈر، کیونکہ پیدا ہونے والا بچہ روح القدس سے ہے۔اُس کے بیٹا ہوگا

اور اُس کا نام عیسیٰ رکھنا، کیونکہ وہ اپنی قوم کو اُس کے گناہوں سے رہائی دے گا۔" یہ سب کچھ اس لئے ہوا تا کہ رب کی وہ بات پوری ہو جائے جو اُس نے اپنے نبی کی معرفت فرمائی تھی، دیکھو ایک کنواری حاملہ ہو گی۔ اُس سے بیٹا پیدا ہو گا اور وہ اُس کا نام عمانوایل رکھیں گے۔" (عمانوایل کا مطلب خدا ہمارے ساتھ ہے۔) جب یوسف جاگ اُٹھا تو اُس نے رب کے فرشتے کے فرمان کے مطابق مریم سے شادی کر لی اور اُسے اپنے گھر لے گیا۔ لیکن جب تک اُس کے بیٹا پیدا نہ ہوا وہ مریم سے ہم بستر نہ ہوا۔ اور یوسف نے بچے کا نام عیسیٰ رکھا۔"

(مجموعہ کتاب مقدس، انجیل متی 1:18/ 25 صفحہ 1310)

اور اسی طرح ایسا ہی واقعہ (انجیل لوقا 1: 26/ 35) میں موجود ہے۔ تو جیسے قرآن میں مذکور ہے اس کی تائید بائبل سے ہو رہا ہے، یا پھر مصنف کے نزدیک یہ بھی اناجیل مشکوک الصحہ میں سے ہیں۔

اس کے علاوہ بہت سارے معجزات جو قرآن میں مذکور ہیں۔ وہی انجیل میں بھی مذکور ہیں جیسے: اندھوں کو بینائی دینا، کوڑھی کو شفا دینا، مردوں کو زندہ کرنا وغیرہ، اور جو قرآن میں مذکور نہیں ہے اس سے قرآن پر فرق نہیں پڑتا، اس لئے جس کی صحت مشکوک ہو وہ غلط ہو سکتا ہے مگر جس کی صحت درست اور سچا ہو وہ غلط نہیں ہو سکتا۔

قصہ اصحاب الکھف:

اس واقعہ کے متعلق موصوف کا دعویٰ ہے کہ نصرانیت سے لیا گیا ہے۔ اور رسول اللہ نے جو واقعہ بیان کیا ہے وہ کہی سے سنا تھا، ایسا ہی بیان کر دیا۔

اصحاب الکھف کا واقعہ قرآن مجید میں تفصیل سے موجود ہے، خوف طوالت سے ہم مکمل واقعہ تفصیلاً ذکر کرنے سے قاصر ہے، شیخ الاسلام فی زماننا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب حفظہ اللہ تعالی

نے اپنے ''آسان ترجمہ قرآن'' میں اس کا مختصر واقعہ نقل کیا ہے، وہاں سے ہم پیش کریں گے تا کہ قارئین کے ذہن میں واقعہ مستحضر ہو، تفصیل کے لئے تفاسیر کی طرف مراجعت کرے:

''ان حضرات کے واقعے کا خلاصہ قرآنِ کریم کے بیان کے مطابق یہ ہے کہ یہ کچھ نوجوان تھے جو ایک مشرک بادشاہ کے عہد حکومت میں توحید کے قائل تھے۔ بادشاہ نے ان کو توحید پر ایمان رکھنے کی بنا پر پریشان کیا تو یہ حضرات ش سے نکل کر ایک غار میں چھپ گئے تھے۔ وہاں اللہ تعالیٰ نے ان پر گی نیند طاری فرمادی، اور یہ تین سونو (309) سال تک اُسی غار میں پڑے سوتے رہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس نیند کے دوران اپنی قدرت کاملہ سے ان کی زندگی کو بھی سلامت رکھا، اور اُن کے جسم بھی گلنے سڑنے سے محفوظ رہے۔ تین سونو سال بعد اُن کی آنکھ کھلی تو انہیں اندازہ نہیں تھا کہ وہ اتنی لمبی مدت تک سوتے رہے ہیں۔ لہٰذا ان کو بھوک محسوس ہوئی تو اپنے میں سے ایک صاحب کو کچھ کھانا خرید کرلانے کے لئے ش بھیجا، اور یہ ہدایت کی کہ احتیاط کے ساتھ ش میں جائیں، تا کہ ظالم بادشاہ کو پتہ نہ چل سکے۔ اللہ تعالیٰ کا کرنا ایسا ہوا کہ اس تین سو سال کے عرصے میں وہ ظالم بادشاہ مرکھپ گیا تھا، اور ایک نیک اور صحیح العقیدہ شخص بادشاہ بن چکا تھا۔ یہ صاحب جب ش میں پہنچے تو کھانا خریدنے کے لئے وہی پُرانا سکہ پیش کیا جو تین سو سال پہلے اس ملک میں چلا کرتا تھا، دُکان دار نے وہ پرانا سکہ دیکھا تو اس طرح یہ بات سامنے آئی کہ یہ حضرات صدیوں تک سوتے رہے تھے۔ بادشاہ کو پتہ چلا تو اُس نے ان لوگوں کو بڑی عزّت اور اکرام کے ساتھ اپنے پاس بلایا، اور بالآخر جب اُن حضرات کی وفات ہوئی تو اُن کی یادگار میں ایک مسجد تعمیر کی۔ عیسائیوں کے یہاں یہ واقعہ ''سات سونے والوں'' (Seven Sleepers) کے نام سے مشہور ہے۔ معروف مؤرخ ایڈورڈ گبن نے اپنی مشہور کتاب ''زوال وسقوطِ سلطنتِ رُوم'' میں بیان کیا ہے کہ وہ ظالم بادشاہ ڈوسیس تھا جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیروؤں پر ظلم ڈھانے میں بہت مشہور ہے۔ اور یہ واقعہ ترکی کے ش افسس میں پیش آیا تھا۔ جس

بادشاہ کے زمانے میں یہ حضرت بیدار ہوئے، گبن کے بیان کے مطابق وہ تھیوڈوسیس تھا۔ مسلمان مؤرخین اور مفسرین نے بھی اس سے ملتی جلتی تفصیلات بیان فرمائی ہیں، اور ظالم بادشاہ کا نام دقیانوس ذکر کیا ہے۔ ہمارے دور کے بعض محققین کا کہنا ہے کہ یہ واقعہ اُردُن کے شہر عمان کے قریب پیش آیا تھا جہاں ایک غار میں کچھ لاشیں اب تک موجود ہیں۔ یہ تحقیق میں نے تفصیل کے ساتھ اپنی کتاب ''جہانِ دیدہ'' میں بیان کر دی ہے۔ لیکن ان میں سے کوئی بات بھی اتنی مستند نہیں ہے کہ اس پر بھروسہ کیا جا سکے۔ قرآنِ کریم کا اُسلوب یہ ہے کہ وہ کسی واقعے کی اُتنی ہی تفصیل بیان فرماتا ہے جو فائدہ مند ہو۔ اس سے زیادہ تفصیلات میں پڑنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ان حضرات کو ''اصحاب الکہف'' (غار والے) کہنے کی وجہ تو ظاہر ہے کہ اُنہوں نے غار میں پناہ لی تھی۔ لیکن ان کو ''رقیم'' والے کیوں کہتے ہیں؟ اس کے بارے میں مفسرین کی رائیں مختلف ہیں۔ بعض حضرات کا کہنا یہ ہے کہ ''رقیم'' اُس غار کے نیچے والی وادی کا نام ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ ''رقیم'' تختی پر لکھے ہوئے کتبے کو کہتے ہیں، اور ان حضرات کے انتقال کے بعد اُن کے نام ایک تختی پر کتبے کی صورت میں لکھوا دیئے گئے تھے، اس لئے ان کو ''اصحاب الرقیم'' بھی کہا جاتا ہے۔ تیسرے بعض حضرات کا خیال ہے کہ یہ اُس پہاڑ کا نام ہے جس پر وہ غار واقع تھا۔ واللہ سبحانہ اعلم۔ 4: جن لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ان نوجوانوں کے بارے میں سوال کیا تھا، اُنہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ اُن کا واقعہ بڑا عجیب ہے۔ اس آیت میں اُنہی کے حوالے سے یہ فرمایا جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کے پیشِ نظر یہ واقعہ کوئی بہت عجیب نہیں ہے، کیونکہ اُس کی قدرت کے کرشمے تو بیشمار ہیں۔''

(آسان ترجمہ قرآن تفسیر سورۃ الکہف آیت 9)

اصحاب کہف کا مکمل واقعہ نقل کرنے کے بعد مصنف نے اس پر جو تبصرہ کیا ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ یہ واقعہ عرب میں پہلے سے موجود تھا۔۔۔ اور اس کے اصل تعداد میں جھگڑا تھا کہ وہ

کتنے تھے۔۔۔ جب کفار نے ان کے متعلق سوال کیا تو رسول اللہ نے کہا کہ کل اس کا جواب دیں گے، یعنی کہ اپنے کسی ساتھی یا کسی سے پوچھ لوں گا، مگر پھر بھی صحیح معلومات انہیں حاصل نہیں ہوئے۔۔۔اور تعداد کو یوں ہی چھوڑ دیا بیان نہیں کیا۔۔۔ایک بات بیان کردی کہ غار کے اندر انہیں 309 برس ہوگیا۔۔۔مگر یہ بھی صحیح نہیں ہے۔۔۔ان کی تعداد سات تھے یورپ میں ہفت خفتگان (seven sleepers) کے نام سے مشہور ہیں۔

پہلی بات یہ یاد رکھنا چاہیے کہ قرآن کوئی تاریخ کی کتاب نہیں کہ وہ تاریخی واقعات پیش کرے اور پھر اس کے اجزاء سے بحث کرے، بقدر ضرورت جن سے انسانوں کی رہنمائی ہوتی ہے وہی ذکر کرتا ہے، اس کے علاوہ غیر ضروری باتوں کو ذکر نہیں کرتا، یہاں بھی قرآن نے یہی اسلوب اختیار کیا ہے، اصحاب الکہف کا واقعہ نقل کیا ہے بقدر ضرورت، باقی اس سے بحث کرنا کہ وہ کون تھے؟ کتنے تھے؟ کن زمانے کے تھے؟ ان کے نام کیا تھا؟ ان کے کتے کا نام کیا تھا؟ کیا رنگ تھا اس کا؟ ان کو بیان نہیں کیا، اور اسی لئے آخر میں فرمایا کہ:

’’ سَيَقُوْلُوْنَ ثَلٰثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ ۚ وَ يَقُوْلُوْنَ خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ كَلْبُهُمْ رَجْمًۢا بِالْغَيْبِ ۚ وَ يَقُوْلُوْنَ سَبْعَةٌ وَّ ثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ ؕ قُلْ رَّبِّيْۤ اَعْلَمُ بِعِدَّتِهِمْ مَّا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا قَلِيْلٌ ۬ فَلَا تُمَارِ فِيْهِمْ اِلَّا مِرَآءً ظَاهِرًا ۪ وَّ لَا تَسْتَفْتِ فِيْهِمْ مِّنْهُمْ اَحَدًا ‘‘ (الکہف آیت 22)

’’ کچھ لوگ کہیں گے کہ وہ تین آدمی تھے، اور چوتھا ان کا کتا تھا، اور کچھ کہیں گے کہ وہ پانچ تھے، اور چھٹا ان کا کتا تھا۔ یہ سب اٹکل کے تیر چلانے کی باتیں ہیں۔ اور کچھ کہیں گے کہ وہ سات تھے، اور آٹھواں ان کا کتا تھا، کہہ دو کہ: میرا رب ہی ان کی صحیح تعداد کو جانتا ہے۔ تھوڑے سے لوگوں کے سوا کسی کو ان کا پورا علم نہیں۔ لہذا ان کے بارے میں سرسری گفتگو سے آگے بڑھ کر کوئی بحث نہ کرو، اور نہ ان کے بارے میں کسی سے پوچھ گچھ کرو۔‘‘

صحیح تعداد اللہ ہی کو بہتر معلوم ہے، اس لئے جتنی ضرورت تھی اس قدر بیان کر دیا، مزید اللہ کی بہتر جانتا تھا۔

دوسری بات یہ واقعہ اگر چہ عرب میں یا اہل کتاب میں مشہور تھا، مگر صحیح واقعہ کسی کے علم میں نہیں تھا سوائے چند کے جیسے قرآن مجید کی مذکورہ آیت سے معلوم ہوتا ہے، مگر اصل واقعہ کے بارے میں اہل کتاب میں اختلاف پایا جاتا تھا، اس لئے قرآن نے اصل واقعہ بیان کر دیا ،اس کے علاوہ جو لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ رسول اللہ نے یہ واقعہ اہل کتاب یا کہی سے لیا یا سنا ہے تو ان پر فرض ہے اس کے مقابلہ میں یہی واقعہ ایسا ہی کسی کتاب سے ثابت کرے جو قرآن سے پہلے تھا۔ ظاہر ہے اگر رسول اللہ نے کسی سے سنا تھا تو اس سے کوئی اور بھی سنا ہوگا وہ کہی اور بھی بیان کیا ہوگا اور اگر کسی کتاب میں دیکھا ہوگا تو وہ کتاب آج بھی موجود ہوگا تو ہمت کر کے مخالفین یہی واقعہ کہی سے ثابت کرے۔

تیسری بات یہ کہنا کہ رسول اللہ نے وعدہ کیا کہ کل بتادوں گا اور اس دوران وہ اپنے ساتھیوں سے معلومات چاہتا تھا، مگر صحیح معلومات پھر بھی نہیں مل سکے۔ اس جھوٹ پر ہم لعنت بھیج کر آگے بڑھتے ہوئے یہ کہتے ہے کہ مخالفین میں اتنی ہمت ہے تو ثابت کرے کہ رسول اللہ اپنے ساتھیوں سے اس سے متعلق معلومات جمع کر رہا تھا، یا ان سے معلومات حاصل کیا تھا۔ مجھے تو حیرت ہوتی ہے ان کے احمقانہ اور غیر معقول باتوں پر، جو لوگ آج اپنی عقل کی بنیاد پر رسول اللہ کو نبی تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں اگر چہ ان کے پاس سوائے اپنے خیالات فاسدہ و قیاس سفسطہ کے اور کچھ نہیں، محض کتابوں کے مطالعہ اور اپنی عقل کی بنیاد پر یہ کرتے ہیں، مگر دوسری جانب ان کی عقل کا یہ عالم ہے کہ رسول اللہ کے بارے میں کہتے ہیں انہوں نے اپنے ساتھیوں سے کچھ معلومات لیا ہوگا۔ عقل کے اندھوں جب تم اس دور کے پڑھے لکھے جاہل ہو کر آج سے 14 سو سال پہلے کے نبی کو تسلیم نہیں کرتے محض کتابوں کی بنیاد پر، تو پھر اس دور میں جو

رسول اللہ کے ساتھی تھے، جو جانتے تھے، ان میں عقل مند پڑھے لکھے، ہر قسم کے لوگ تھے، پھر کیا وہ لوگ رسول اللہ کو ویسے ہی نبی تسلیم کرلیا؟ اور وہ جانتے بھی تھے رسول اللہ ہم سے معلومات جمع کر کے کفار کو یقین دہانی کراتا ہے کہ مجھ پر وحی ہوتی ہے حالانکہ وہ معلومات ہم نے دیا ہوتا ہے، تو پھر معاذ اللہ یہ تو جھوٹی نبی ہے۔ہم کیسے اس کو مان لے۔

فاروق اعظم جیسے دلیر اور اپنے مذہب کے پکے شخص اگر یہ دیکھ لیتا تو کیا وہ مسلمان ہوتا؟ صدیق اکبر کیا مسلمان ہوتا؟ کیسی بات کرتے ہو، آج تم 14 سو سال بعد اپنے وہم کے مطابق دلائل وشواہد سے رسول اللہ کی نبوت کو تسلیم نہیں کرتے تو وہ قریب ہو کر بالمشاہدہ دیکھ کر کیسے تسلیم کرتے؟

چوتھی بات قرآن میں 309 سال غار میں رہنے کا ذکر ہے جب کہ مصنف نے گریگوری کا واقعہ نقل کیا ہے جس میں 196 برس کا ذکر ہے۔مگر اس سے قرآن کی صحت پر فرق نہیں پڑتا، ماقبل میں کہا گیا ہے کہ رسول اللہ سے پہلے کسی بھی کتاب یا کسی ذریعہ سے ثابت کیا جائے کہ یہ واقعہ کسی کو ایسا ہی معلوم تھا جیسے قرآن میں مذکور ہے، کسی کتاب میں اگر بیان ہوا ہے تو پیش کرے۔گریگوری کا اقتباس مصنف نے جو پیش کیا ہے وہ بھی قرآن کے واقعہ کے مطابق نہیں اگر چہ کچھ اجزاء ملتے جلتے ہیں، لیکن اگر مصنف ودیگران کے ہم خیالات کا یہ دعویٰ ہیں کہ رسول اللہ نے یہاں سے اس واقعہ کو لیا ہے یا کہی سے بھی تو اس واقعہ میں باقی جو زوائد باتیں ہیں وہ رسول اللہ نے کہا سے لیا؟ اگر وہی سے لیا تو زوائد کا اضافہ کیا اپنی طرف سے کیا؟ وہ تو بقول تمہارے رسول اللہ کو اس بارے میں معلومات ہی نہیں تھا۔تو پھر کہا سے حاصل کرسکتا۔لہذا یہ واقعہ اگر چہ عرب میں موجود تھا مگر صحیح واقعہ کسی کو معلوم نہیں تھا، پھر قرآن نے اصل واقعہ بیان کر دیا۔

حضرت عیسی و مریم علیہما السلام کا قصہ:

حضرت عیسی و مریم علیہا السلام کے بارے میں مصنف نے کافی لمبی بحث کی ہے، جو کئی صفحات پر مشتمل ہے، لیکن ہم یہاں ان کے معروضات کا ماحصل پیش کرنا چاہتے ہیں:

''قرآن واحادیث میں مریم کی جو تاریخ بیان کی گئی ہے، وہ تقریباً سب کے سب عیسائیوں کی مشکوک الصحت اناجیل اور اسی قسم کی دوسری کتابوں سے لی گئی ہے۔۔۔۔قرآن کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے مسیح کی ماں وہی مریم تھی جو موسی و ہارون کی بہن تھی۔۔۔۔اور حضرت مریم کا باپ عمران بتلایا گیا ہے جو موسی و ہارون اور مریم کے باپ کا نام ہیں۔۔۔۔سورۃ مریم میں حضرت مسیح کے پیدائش کا ذکر سراسر عیسائیوں کے مشکوک الصحہ اناجیل سے لیا گیا ہیں۔۔۔۔قرآن میں حضرت مسیح کا گہوارہ میں باتیں کرنے کی روایت بھی اناجیل مشکوک الصحہ میں ''انجیل الطفولیت''، جو قبطی زبان میں ہے سے لیا گیا ہے۔۔۔۔اور یہ واقعہ محمد نے ماریہ قبطیہ جسے والی مصر نے رسول اللہ کی خدمت میں بطور تحفہ بھیجا تھا اس سے لیا ہوگا، جو اگر چہ انجیل سے ناواقف تھے مگر ممکن ہے یہ واقعہ ان کو یاد ہو۔۔۔۔اور بدھ مت کے قدیم قصوں میں بھی بدھ کے متعلق گہوارہ میں بات کرنے کا قصہ پایا جاتا ہے۔۔۔۔اور حضرت عیسی کا معجزہ جو پرندے جیسی شکل بناتا اور اس میں پھونک مارنے سے وہ پرندہ بن کر اڑ جاتا یہ بھی اناجیل مشکوک الصحہ سے لیا ہے مگر وہاں 12 پرندوں کا ذکر ہیں، قرآن میں ایک پرندے کا جو محمد نے اپنی یادداشت سے بتایا ہے۔''

جواب عرض کرنے سے قبل یہ بات یاد رکھنا چاہیے جس کی تصریح ماقبل بھی مختصر ہو چکی ہے کہ قرآن مجید تاریخ کی کتاب نہیں کہ یہاں واقعہ اول تا آخر اور جزء مع کیفیت بیان کرے، بلکہ قرآن کا یہی اسلوب ہے کہ جہاں جتنی ضرورت ہو وہی بیان کرتا ہے، ان واقعات کو بیان کرنے کا مقصد یہی ہے کہ ایک تو رسول اللہ کی نبوت کی دلیل، اور اس بات کی تصریح کہ اس سے پہلے اس سے متعلق جو واقعات وروایات بیان ہورہے ہیں، ان میں کتنی صداقت ہے اور

کتنی تکذیب۔

اس کے بعد آتے ہیں مصنف کے مفروضات پر، ان سب مفروضوں کا اجمالی جواب تو یہی ہے کہ قرآن کریم میں واقعات بیان کرنے کا منجملہ مقاصد ایک مقصد ہی یہی ہے کہ صحیح اور غلط واقعات کی تمیز کی جائے، حضرت مسیح علیہ السلام یا حضرت مریم علیہا السلام یا دیگر قصص ہو، سب کو بیان کرنے کا مقصد نبوت کی دلیل کے بعد یہی ہے کہ اصل واقعہ کی پہچان ہو۔ اب اگر اس سے پہلے واقعات و روایات مختلف تھے تو قرآن نے اصل واقعہ بیان کر دیا، اس کے بعد نا صرف مشکوک الصحت اناجیل بلکہ پورا بائبل جو کہ مشکوک الصحت ہے کوئی واقعہ الگ بیان کرتا ہے تو وہ غلط تصور کیا جائے گا، کیونکہ جب پیغمبر کی رسالت و نبوت ثابت ہے اور آپ کا امی ہونا بھی قطعی تواتر سے ثابت ہے، تو اس کے مقابلہ میں مشکوک باتوں کو ترجیح دینا غیر معقول اور باطل ہے۔ اس لئے مخالفین کو سب سے پہلے گفتگو اس بات پر کرنا چاہیے کہ رسول اللہ نبی ہے یا نہیں؟ اگر ان کا نبی ہونا ثابت ہوا تو ان باتوں کی تکذیب خود بخود لازم آئے گا، کیونکہ پیغمبر جو بات کہتی ہے وہی راجح اور سچ ہے۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ حضرت مریم بنت حنہ اور حضرت مسیح بن مریم علیہما السلام کا واقعہ قرآن میں بعض جگہ مذکور ہے، تفصیل سورۃ آل عمران اور سورۃ مریم میں موجود ہے۔ باقی تفصیلات میں جانا باعث تطویل ہوگی، اس لئے ہم اصل مقصود کا ذکر کریں گے، وہ یہ کہ قرآن کی رو سے حضرت مسیح بن مریم بغیر باپ کے خدا تعالیٰ کی قدرت کاملہ سے پیدا ہوئے، باقی تفصیلات قرآن میں مذکور ہے۔ مصنف ان تفصیلات کا تقابل دیگر کتب، جو بقول موصوف اناجیل مشکوک الصحت ہے، سے کرتا ہے، اور نتیجہ یہی اخذ کرتا ہے کہ یہ واقعات ان کتب سے اخذ کیا گیا ہے۔

اس سے پہلے بھی عرض کیا جا چکا ہے کہ مصنف نے جتنے واقعات کا تقابل اب تک کیا ہیں

سب من وعن ایک جیسے نہیں، یعنی ایسا نہیں ہیں جیسے قرآن میں مذکور ہے ویسے ہی دیگر یہودی و عیسائی کتب میں بھی مذکور ہو۔ بلکہ اختلاف کے ساتھ موجود ہے جسے مشارکت یا مشابہت یا متبادل کہا جاسکتا ہے نہ کہ ماخذ، ہم پوچھنا چاہتے ہیں کہ اگر رسول اللہ نے ان واقعات کو بقول تمہارے کسی کتب سے لیا ہے، تو اولا اس کا کوئی ثبوت نہیں محض شک وممکنات اور واقعہ میں مماثلت کی بنیاد پر دعویٰ قائم کیا گیا ہے جو کہ باطل ہے۔ ثانیا واقعات میں اختلاف کیوں ہے، قرآن میں مختلف ہے جب کہ دوسری کتب میں مختلف۔ اگر رسول اللہ وہاں سے لیا ہے تو کمی زیادتی کس نے کی ہے؟ اگر رسول اللہ نے کی ہے تو وہ تو امی تھے، اور پھر کیسے ممکن ہے کتاب دیکھئے بغیر اپنی طرف سے واقعہ بنائے جب کہ اصل واقعہ کچھ اور ہو۔ اور اگر کہا جائے کہ ممکن ہے سنا ہوگا یہودیوں سے یا عیسائیوں سے، تو عرض ہے کہ اگر سنا ہوتا تو اس وقت کفار و دیگر اہل کتاب ضرور اس بات پر نکیر کرتے کہ یہ واقعہ تو اصل میں فلاں کتاب میں یوں ہے ، محمد اس کو غلط بیان کررہا ہے یا محمد کو اس کا اصل واقعہ معلوم نہیں۔ مگر ہم دیکھتے ہیں اہل کتاب میں سے کسی نے تو ان واقعات پر اعتراض و نکیر نہیں کیا اور نہ ماخذ کا سوال کیا کہ یہ واقعہ تو آپ نے اناجیل مشکوک الصحت سے لیا ہے اور فلاں واقعہ تو فلاں کتاب میں مذکور ہے وہاں سے آپ نے لیا ہے۔ کفار نے رسول اللہ پر یہ الزام تو لگایا کہ آپ اپنی طرف سے یہ گھڑتے ہیں یا کوئی آپ کو سکھاتا ہے، مگر یہ الزام کسی نے نہیں لگایا کہ یہ واقعہ فلاں کتاب میں ہے محمد وہاں سے دیکھ کر بیان کررہے ہیں۔ یہ فلاں کتاب محمد کے ہاتھوں لگی ہے وہاں سے دیکھ کر بیان کررہے ہیں۔ لہذا جب ایسا کچھ نہیں اس لئے یہ کہنا کہ یہ واقعات رسول اللہ نے فلاں کتب سے لیا ہے باطل ہے۔ اور غیر مقبول اور بلا دلیل ہے۔

مصنف کو یہ غلط فہمی بھی ہوئی ہے کہ حضرت مریم کو حضرت ہارون وموسی علیہما السلام کی بہن قرار دے رہا ہے، حالانکہ حضرت ہارون وموسی حضرت مریم سے کئی برس پہلے گزرے ہیں،

موصوف کو معلوم ہونا چاہیے کہ جس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف تم قلم کو حرکت دے رہے ہو اسی پیغمبر نے اس کا جواب تمہارے پیدا ہونے سے پہلے دیا ہے، جب حضرت مغیرہ بن شعبہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اہل نجران کے پاس بھیجا تو انہوں نے سوال کیا کہ تمہارے قرآن میں حضرت مریم کو اخت ہارون کہا گیا ہے حالانکہ ہارونؑ ان سے بہت قرنوں پہلے گزر چکے ہیں حضرت مغیرہ کو اس کا جواب معلوم نہ تھا جب واپس آئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس کا ذکر کیا آپ نے فرمایا کہ تم نے ان سے یہ کیوں نہ کہہ دیا کہ اہل ایمان کی عادت یہ ہے کہ تبرکا انبیاء علیہم السلام کے ناموں پر اپنے نام رکھتے ہیں اور ان کی طرف نسبت کیا کرتے ہیں (رواہ احمد و مسلم والترمذی والنسائی)

اس لئے حضرت مریم کے بھائی کا نام ہارون تھا، وہ ہارون نہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بھائی وساتھی تھے بلکہ حضرت مریم کے اپنی بھائی۔ اور ممکن ہے ہارون کی نسبت حضرت ہارون علیہ السلام کی جانب ہو کہ حضرت مریم انہیں کی اولاد میں سے ہے۔ اور تاریخ میں دو عمران گزرے ہیں ایک حضرت مریم کے والد کا نام عمران تھا دوسرا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے۔ اس لئے یہ دونوں الگ الگ ہے، ان کو ایک نہیں سمجھنا چاہیے جیسے مصنف نے سمجھا ہے۔

اور حضرت مسیح علیہ السلام کا گہوارہ میں بات کرنے کو بھی انجیل مشکوک الصحت میں سے ''انجیل الطفولیت'' سے ماخذ قرار دے رہا ہے، اور اس پر دلیل یہ دے رہا ہے کہ ممکن ہے ماریہ قبطیہ جسے والی مصر نے بطور تحفہ رسول اللہ کی خدمت میں بھیجا تھا، ان سے یہ روایت لی ہو، کیونکہ ''انجیل الطفولیت'' بھی قبطی زبان میں ہے ممکن ہے ماریہ اگرچہ اس کو پڑھی نہ ہو مگر روایت یاد ہوگی۔ اس کا جواب ہم کیا دے خود مصنف کہتا ہے ''انجیل الطفولیت'' کا ترجمہ عربی میں اس وقت موجود نہیں تھا وہ قبطی زبان میں تھی، جب ترجمہ ہی نہیں تھا پھر قبطی میں کون پڑھ سکتا ہے۔ اور مصنف کو خود اس دلیل میں شک ہے محض شک اور ممکن کی بنیاد پر کہتا ہے کہ غالبا، ممکن ہے،

شاید ایسا ہو۔مگر دلائل وحقائق کی دنیا میں تمہارے ممکنات نہیں چلتے۔اس لئے یہاں ٹھوس دلائل سے ہی اپنے دعویٰ کو ثابت کرنا پڑتا ہے۔اور رہی بات بدھ مت کا کہ جس کی کتب میں بھی ایسا واقعہ مذکور ہے تو یہ معمہ مصنف اوراس کے متبعین ہی حل کرے کہ اب یہ واقعہ کس نے کس سے لیا ہیں،عیسائیوں نے بدھ مت سے یا بدھ مت نے عیسائیوں سے۔

اورحضرت عیسی علیہ السلام کے معجزہ جو قرآن میں مذکور ہے، کہ پرندے جیسی شکل بناتا پھر اس میں روح پھونک دیتا اور وہ اڑتا۔ اس کو بھی اناجیل مشکوک الصحت سے ماخذ بتایا،مگر جب دیکھا اناجیل میں تو 12 پرندوں کا ذکر ہے، جب کہ قرآن میں مطلق مذکور ہے،تو مصنف یہاں پھر اپنی بے بسی کا اظہار کرکے کہتا ہے کہ ممکن ہے 12 کا ذکر نہ کرنا یہ محمد کو کسی تحریر میں نہیں ملی بلکہ اپنی یادداشت سے ایک کا ذکر کیا ہے۔یہ عجیب منطق ہے کبھی کہتے ہیں محمد نے فلاں کتاب سے یہ بات لی، پھر کہتے ہیں اس کتاب کی عربی ترجمہ محمد کے زمانے میں موجود نہیں تھی، پھر کہتے ہیں ممکن ہے یہ بات فلاں کتاب سے نہ لی ہو بلکہ سنا ہو، پھر کہتے ہیں نہیں سنا ممکن نہیں بلکہ اپنی یادداشت سے لکھا ہو، پھر کہتے ہیں نہیں اصل واقعہ ایسا نہیں ہے بلکہ محمد نے نہیں سمجھا اور اپنے ذہن کے مطابق قرآن میں اس کو بیان کردیا۔قارئین کرام کیا اہل انصاف کے ہاں ایسے متضاد دعاوی کی اہمیت ہوگی؟ ہرگز نہیں بلکہ ایسے دعاوی کو دنیا کے کسی بھی عدالت میں سرے سے مسترد کرتے ہیں۔

ماخذ کارد خود رسول اللہ کے فعل سے:

جب میں مصنف کے مفروضات کے جواب میں مصروف عمل تھا تو ''مشکوٰۃ المصابیح'' کے درس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث آئی ،جس سے یہ بات اظہر من الشّمس ہوجاتا ہے کہ رسول اللہ نہ یہود سے کچھ لیا ہے اور نہ نصاری سے بلکہ وہ محض وحی الٰہی سے احکام شریعت بیان فرماتے، ملاحظہ ہو حدیث مبارکہ:

'' عَن أنس إِنَّ الْيَهُودَ كَانُوا إِذَا حَاضَتِ الْمَرْأَةُ فِيهِمْ لَمْ يُؤَاكِلُوهَا وَلَمْ يُجَامِعُوهُنَّ فِي الْبُيُوتِ فَسَأَلَ أَصْحَاب النَّبِي صلى الله عَلَيْهِ وَسلم النَّبِيّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَأَنْزَلَ اللَّهُ تَعَالَى (ويسألونك عَن الْمَحِيض قُلْ هُوَ أَذًى فَاعْتَزِلُوا النِّسَاءَ فِي الْمَحِيضِ)الْآيَة. فَبَلَغَ ذَلِكَ الْيَهُودَ فَقَالُوا مَا يُرِيدُ هَذَا الرَّجُلُ أَنْ يَدَعَ مِنْ أَمْرِنَا شَيْئًا إِلَّا خَالَفَنَا فِيهِ فَجَاءَ أُسَيْدُ بْنُ حضَيْرٍ وَعَبَّادُ بْنُ بِشْرٍ فَقَالَا يَا رَسُولَ اللّٰه إِنَّ الْيَهُودَ تَقُولُ كَذَا وَكَذَا أَفَلَا نُجَامِعُهُنَّ فَتَغَيَّرَ وَجْهُ رَسُولِ اللّٰه صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَتَّى ظَنَنَّا أَنْ قَدْ وَجَدَ عَلَيْهِمَا فَخَرَجَا فَاسْتَقْبَلَتْهُمَا هَدِيَّةٌ مِنْ لَبَنٍ إِلَى النَّبِيّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَأَرْسَلَ فِي آثَارِهِمَا فَسَقَاهُمَا فعرفا أَن لم يجد عَلَيْهِمَا. رَوَاهُ مُسلم ''

(مشکوٰۃ باب الحیض صفحہ 56 مطبوعہ دہلی)

ترجمہ:'' حضرت انس بن مالک ؓ بیان کرتے ہیں، یہودیوں کا یہ طرزِ عمل تھا کہ جب ان میں کسی عورت کو حیض آجاتا تو وہ اس کے ساتھ کھاتے نہ انہیں گھر میں ساتھ رکھتے، پس نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ نے آپ سے مسئلہ دریافت کیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:'' وہ آپ سے حیض کے بارے میں مسئلہ دریافت کرتے ہیں۔'' تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا :'' جماع کے علاوہ سب کچھ کرو۔'' چنانچہ یہودیوں کو اس کا علم ہوا تو انہوں نے کہا یہ آدمی (نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کیا چاہتا ہے یہ تمام معاملات میں ہماری مخالفت ہی کرتا ہے۔ چنانچہ اُسید بن حُضیر اور عبادہ بن بشیر ؓ حاضر خدمت ہوئے تو انہوں نے عرض کیا، اللہ کے رسول! یہودی یہ یہ کہتے ہیں، کیا ہم ان سے (حالت حیض میں) جماع نہ کریں؟ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چہرے کا رنگ بدل گیا، حتیٰ کہ ان دونوں نے خیال کیا کہ آپ ان دوں پر ناراض ہو گئے ہیں، پس وہ وہاں سے چل دیے، انہیں دودھ کا ہدیہ ملا جو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں بھیجا گیا

تھا، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کسی شخص کو ان کے پیچھے بھیجا اور انہیں دودھ پلایا جس سے انہوں نے پہچان لیا کہ آپ ان پر ناراض نہیں۔ رواہ مسلم"

اسلام میں عورت کے ساتھ حالت حیض میں سب کچھ جائز ہے سوائے جماع کے، یعنی اس کے ساتھ رہنا، اس کے ہاتھ کی چیزیں کھانا، اس کو چھونا وغیرہ، اور حالت حیض میں عورت مخصوص عبادات نہیں کرسکتی، یعنی نماز نہیں پڑھ سکتی اور روزہ نہیں رکھ سکتی، البتہ نمازوں کا تو قضاء نہیں روزہ کا قضاء ہے۔

یہودی مذہب میں حالت حیض میں عورت کے جو احکام تورات میں ذکر ہیں ملاحظہ فرمائیں:

"ماہواری کے وقت عورت سات دن تک ناپاک ہے۔ جو بھی اُسے چھوئے وہ شام تک ناپاک رہے گا۔ اس دوران جس چیز پر بھی وہ لیٹتی یا بیٹھتی ہے وہ ناپاک ہے۔ جو بھی اُس کے لیٹنے کی جگہ کو چھولے یا اُس کے بیٹھنے کی جگہ پر بیٹھ جائے وہ اپنے کپڑے دھوکر نہالے۔ وہ شام تک ناپاک رہے گا۔ اگر مرد عورت سے ہم بستر ہو اور اُسی وقت ماہواری کے دن شروع ہوجائیں تو مرد خون لگنے کے باعث سات دن تک ناپاک رہے گا۔ جس چیز پر بھی وہ لیٹتا ہے وہ ناپاک ہوجائے گی۔"

(مجموعہ کتاب مقدس، احبار 15:19 / 24 صفحہ 168)

قارئین کرام! دونوں مذہب کا تقابل کیجئے، یہودی مذہب میں حالت حیض میں عورت کو کیا سمجھی جاتی اور اس کے لئے کیا کیا احکامات ہے، جب کہ مذہب اسلام میں ایسا کچھ نہیں۔ مذکورہ حدیث ان لوگوں کے منہ پر طمانچہ ہیں جو کہتے ہیں رسول اللہ یہود کو خوش کرنے کے لئے احکام انہیں کے مطابق بتلاتے تا کہ یہود خوش رہے۔ اگر رسول اللہ یہود کو خوش کرنے کے لئے ان کے مذہب کے احکام بتاتے یا پھر یہودیوں سے باتیں لیتے تو رسول اللہ حیض کے احکام بھی تورات کے متعلق بتلاتے۔

ازروئے بائبل حضرت مسیح کا بن باپ پیدا ہونا:

مسلمان اور عیسائیوں کے درمیان حضرت عیسی علیہ السلام کی ولادت میں اختلاف اس بات پر ہے کہ مسلمان کہتے ہیں حضرت مسیح علیہ السلام بغیر باپ کے محض قدرت الٰہیہ سے پیدا ہوئے، یعنی ان کی والدہ نے کسی سے شادی نہیں کی تھی، عیسائی کہتے ہیں حضرت مسیح بن باپ تو پیدا ہوئے مگر ان کی منگنی یوسف نجار سے ہوئی تھی۔ بات وہی ہے جو مسلمان کہتے ہیں مگر عیسائی معمولی فرق کے ساتھ یوسف نجار سے منگنی کا ذکر کر کے کہتے ہیں کہ اگر چہ حضرت مریم کی منگنی یوسف سے ہوئی تھی، مگر یوسف نے اب تک ان کو چھوا بھی نہیں تھا، اور نہ ان سے ہم بستر ہوا تھا، جب یہ سب نہیں ہوا تو نہ باپ ثابت ہوسکتا ہے اور نہ اس کی نسبت یوسف کی جانب کیا جا سکتا ہے۔ مگر عیسائیوں کے جیسے اناجیل مبہم ہے ویسے ہی ان کا یہ نظریہ بھی مبہم ہے۔ سب سے پہلے ہم حضرت مسیح کی ولادت کا ذکر انجیل سے بیان کریں گے، انجیل متی باب 1 آیت 18 / 25 میں تذکرہ ولادت مسیح یوں مذکور ہے کہ:

> ”عیسی مسیح کی پیدائش یوں ہوئی اس وقت اس کی ماں مریم کی منگنی یوسف کے ساتھ ہوچکی تھی کہ وہ روح القدس سے حاملہ پائی گئی۔ ابھی اُن کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ اُس کا منگیتر یوسف راست باز تھا، وہ علانیہ مریم کو بدنام نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اِس لئے اُس نے خاموشی سے یہ رشتہ توڑنے کا ارادہ کرلیا۔ وہ اس بات پر ابھی غور وفکر کر ہی رہا تھا کہ رب کا فرشتہ خواب میں اُس پر ظاہر ہوا اور فرمایا، یوسف بن داؤد، مریم سے شادی کر کے اُسے اپنے گھر لے آنے سے مت ڈر، کیونکہ پیدا ہونے والا بچہ روح القدس سے ہے۔ اُس کے بیٹا ہوگا اور اُس کا نام عیسیٰ رکھنا، کیونکہ وہ اپنی قوم کو اُس کے گناہوں سے رہائی دے گا۔“ یہ سب کچھ اس لئے ہوا تا کہ رب کی وہ بات پوری ہوجائے جو اُس نے اپنے نبی کی معرفت فرمائی تھی، دیکھو ایک کنواری حاملہ ہوگی۔ اُس سے بیٹا پیدا ہوگا اور وہ اُس کا نام عمانوایل رکھیں گے۔“

(عمانوایل کا مطلب خدا ہمارے ساتھ ہے۔) جب یوسف جاگ اُٹھا تو اُس نے رب کے فرشتے کے فرمان کے مطابق مریم سے شادی کر لی اور اُسے اپنے گھر لے گیا۔لیکن جب تک اُس کے بیٹا پیدا نہ ہوا وہ مریم سے ہم بستر نہ ہوا۔اور یوسف نے بچے کا نام عیسیٰ رکھا۔''

اور اسی طرح لوقا میں بھی موجود ہے کہ:

'' جب اللہ نے جبرائیل فرشتے کو ایک کنواری کے پاس بھیجا جو ناصرت میں رہتی تھی۔ ناصرت گلیل کا ایک شہر ہے اور کنواری کا نام مریم تھا۔اُس کی منگنی ایک مرد کے ساتھ ہو چکی تھی جو داؤد بادشاہ کی نسل سے تھا اور جس کا نام یوسف تھا۔فرشتے نے اُس کے پاس آ کر کہا،" اے خاتون جس پر رب کا خاص فضل ہوا ہے، سلام! رب تیرے ساتھ ہے۔" مریم یہ سن کر گھبرا گئی اور سوچا،" یہ کس طرح کا سلام ہے؟"،لیکن فرشتے نے اپنی بات جاری رکھی اور کہا،" اے مریم، مت ڈر، کیونکہ تجھ پر اللہ کا فضل ہوا ہے۔تو اُمید سے ہو کر ایک بیٹے کو جنم دے گی۔ تجھے اُس کا نام عیسیٰ (نجات دینے والا) رکھنا ہے۔وہ عظیم ہو گا اور اللہ تعالیٰ کا فرزند کہلائے گا۔رب ہمارا خدا اُسے اُس کے باپ داؤد کے تخت پر بٹھائے گا اور وہ ہمیشہ تک اسرائیل پر حکومت کرے گا۔اُس کی سلطنت کبھی ختم نہ ہو گی۔" مریم نے فرشتے سے کہا،" یہ کیوں کر ہو سکتا ہے؟ ابھی تو میں کنواری ہوں۔" فرشتے نے جواب دیا،" روح القدس تجھ پر نازل ہو گا، اللہ تعالیٰ کی قدرت کا سایہ تجھ پر چھا جائے گا۔اس لئے یہ بچہ قدوس ہو گا اور اللہ کا فرزند کہلائے گا۔''

(مجموعہ کتاب مقدس، لوقا 1:27 / 35 صفحہ 1402)

بائبل کی ان دو اقتباس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت مسیح کی ولادت محض قدرت الٰہیہ بغیر باپ کے ہوا۔اور ان دو عبارات میں کچھ باتیں تفصیل طلب ہے، ان کی وضاحت ملاحظہ فرمائے ۔

تورات کی رو سے منگنی گویا نکاح کے حکم میں تھا ،اس کے بعد صرف رخصتی اور ملنا باقی ہوتی ،مگر منگیتر شادی شدہ شمار ہوتی ،مگر جہاں تک صحیح بات ہے بائبل کی عبارات بھی اس طرف اشارہ کرتے ہیں کہ حضرت مریم کی منگنی بھی نہیں ہوئی تھی ۔ ورنہ بائبل کی عبارات اور عیسائیوں کے عقیدہ تثلیث کو جو کہ باطل ہے،ان عبارات سے مزید اس کا ابطال ہوگا۔

انجیل متی کی عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مریم کی منگنی یوسف سے ہوئی تھی ،ابھی تک ان کی شادی نہیں ہوئی تھی کہ وہ قدرت خداوندی سے حاملہ ہوگئی ،اور چونکہ یوسف اس سے ملا نہیں تھا اس لئے وہ پریشان ہوکر ان کو چھوڑنے کا ارادہ کیا۔مگر اللہ کے حکم سے اسے شادی کا حکم ملا۔

مگر یہ غیر معقول بات ہے، کہ ایک طرف سے شادی کا حکم دیا جارہا ہے،اور دوسری طرف سے حضرت مسیح کو بغیر باپ پیدا ہونا ثابت کیا جارہا ہے،اگر حضرت مریم کی منگنی یوسف سے مان لیا جائے تو پھر ممکن ہے یوسف ہی حضرت مریم سے ملا ہو،اور اس صورت میں تو حضرت مسیحؑ کی نسبت یوسف کی جانب ہوسکتا ہے،اگر چہ حقیقتاً نہیں مگر مجازاً تو ہوسکتا ہے، کیونکہ حضرت مریم بائبل کی رو سے اب ان کے لئے حلال ہوئی تھی ،مگر چونکہ منگنی ہی نہیں ہوئی تھی ،اس لئے تو انجیل میں کہا کہ روح القدس سے حاملہ پائی ،اور بغیر باپ اور روح القدس سے حاملہ ہونا تب ثابت ہوتا ہے جب منگنی ہی نہیں مانا جائے ،ورنہ منگنی کے ہوتے ہوئے روح القدس سے حاملہ قرار پانا چہ معنی دارد۔

اور حضرت مریم علیہا السلام نے بھی فرشتے کو یہی جواب دیا کہ میں تو ابھی تک کنواری ہوں مجھے بچہ کیسے ہوگی ؟ اور اس کے ساتھ قوم کی ملامت سے بھی ثابت ہوتی ہے کہ مریم کی نہ منگنی ہوئی تھی نہ شادی، ورنہ وہ ملامت کیوں کرتی ۔ اور سب سے بڑھ کر انجیل متی کی یہ عبارت اس پر دال ہے کہ حضرت مریم محض قدرت الہیہ سے حاملہ ہوئی نہ اس کی کہی منگنی ہوئی اور نہ شادی:

''یہ سب کچھ اس لئے ہوا تا کہ رب کی وہ بات پوری ہو جائے جو اُس نے اپنے نبی کی معرفت فرمائی تھی، دیکھوایک کنواری حاملہ ہوگی۔ اُس سے بیٹا پیدا ہوگا اور وہ اُس کا نام عمانوایل رکھیں گے۔'' (عمانوایل کا مطلب خدا ہمارے ساتھ ہے۔)

یہاں بھی صاف ہے کہ ایک کنواری حاملہ ہوگی، اور بالفرض اگر مان لیا جائے کہ حضرت مریم کی منگنی یوسف سے ہوئی تھی ہورہی تھی، تو اس کا معنی یہ ہوگا کہ حضرت مریم کے گھر والوں نے یہ ارادہ کیا تھا کہ اس کی منگنی یوسف سے کریں گے، محض ارادہ کیا تھا نہ کہ منگنی۔

نزول مائدہ (دسترخوان) کا قصہ:

نزول مائدہ یعنی دسترخوان، طباق جو حضرت عیسی علیہ السلام کے حواریوں کے فرمائش پر نازل ہوا، اور اس میں کیا کیا تھے، بعض کہتے ہیں روٹی اور کھانا بعض کے نزدیک مچھلی اور روٹی، بہرحال جو بھی ہو مگر دسترخوان نازل ہوا۔

اس پر مصنف کا تبصرہ ملاحظہ کیجئے:

'' اس قصّہ کے متعلق اگر ملک حبش کی کوئی روایت ہو تو دوسری بات ہے، کیونکہ جو لوگ سب سے پہلے اسلام لائے تھے وہ مخالفین کے ظلم وستم کے باعث ملک حبش کو ہجرت کر گئے تھے۔ اور وہاں سے ممکن ہے وہ کوئی روایت اپنے ساتھ لائے ہوں، ورنہ یہ بات عہد نامۂ جدید کی عبارت صحیح نہ سمجھنے سے پیدا ہوئی۔ انجیل لوقا ۳۰:۲۰ میں لکھا ہے مسیح نے اپنے شاگردوں سے کہا'' تا کہ تم میری سلطنت میں میرے دسترخوان پر کھا پی سکو''۔ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بے شبہ معلوم تھا کہ نصاریٰ بموجب انجیل متی ۲۰: ۲۶-۲۹، انجیل مرقس باب ۱۴ آیات ۱۷-۲۵، انجیل لوقا باب ۲۲ آیات ۱۴-۳۰ اور انجیل یوحنا باب ۱۳ آیات ۱-۳۰ عشائے ربانی کی تقریب مناتے ہیں۔ مگر جس چیز کی وجہ سے ان کو یہ خیال پیدا ہوا کہ خوان نعمت آسمان سے نازل ہوا تھا، وہ یقیناً کتاب اعمال باب ۱۰ آیات ۹-۱۶ کا بیان تھا جس میں رویائے پطرس کو اسی طرح بیان کیا گیا ہے: '' دوسرے دن جب وہ راہ

میں تھے اورش کے نزدیک پہنچے تو پطرس دوپ کے قریب کوٹھے پر دعا کرنے کو چڑھا۔اور اسے بھوک لگی اور کچھ کھانا چاہتا تھا لیکن جب لوگ تیار کر رہے تھے تو اس پر بیخودی چھا گئی۔اوراس نے دیکھا کہ آسمان کھل گیااورایک چیز بڑی چادر کی مانند چاروں کونوں سے لٹکتی ہوئی زمین کی طرف اتر رہی ہے۔جس میں زمین کے سب چوپائے اور کیڑے مکوڑے اور ہوا کے پرندے ہیں۔اوراسے ایک آواز آئی کہ اے پطرس اُٹھ! ذبح کر اور کھا۔مگر پطرس نے کہااے خداوند! گزنہیں کیونکہ میں نے کبھی کوئی حرام یاناپاک چیزنہیں کھائی۔پھر دوسری بار اسے آواز آئی کہ جن کو خدانے پاک ٹھایا ہے تو انہیں حرام نہ کہہ۔تین بارایساہی ہوااور فی الفوروہ چیز آسمان پراٹھالی گئی''۔

سبحان اللہ! جو زبان پر آ گئی لکھ دیا، اگرچہ سرتا پا کچھ بھی معلوم نہ ہو، ملک حبشہ کی طرف جن مسلمانوں نے ہجرت کئے تھے ان کی تعداد نوے (90) سے زیادہ نہ تھے، اور یہ ہجرت ابتداء اسلام میں ہوا۔اگر یہ روایت جو قرآن میں مذکور ہے ملک حبشہ سے لی گئی ہے تو ملک حبشہ میں کہا سے آئی؟ وہاں یہ روایت کیسے پھیلی تھی؟ کیا کسی کتاب میں مذکور تھا؟ اگر مذکور ہے تو اس کا ذکر کیا جائے جس کتاب میں یہ بات موجود ہے، اور اگر نہیں تو یہ روایت کہا سے آ گئی؟

بالفرض اگر کسی کتاب میں موجود بھی ہو تو بھی ملک حبشہ کے مہاجرین سے یہ ثابت نہیں، خود مصنف اس کو بطور امکان پیش کر رہا ہے، اس لئے اس کا کوئی ثبوت نہیں۔

پھر موصوف کہتے ہیں کہ یہ بات محمد کو واقعہ نہ سمجھنے سے پیدا ہوا، یعنی بائبل میں صرف اس سے متعلق ایک آیت تھی مگر محمد نے اس کو نہیں سمجھا اور پھر کتاب اعمال کے باب دس سے آیات پیش کی ہے۔مگر وہ بھی قرآن کے واقعہ سے مختلف ہے۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بائبل سے لیا ہے تو پھر واقعہ مختلف کیوں ہے۔اس لئے اس سے تو ثابت ہوتا ہے کہ اصل واقعہ نزول مائدہ کا وہ قرآن میں مذکور ہے، اور یہی وجہ ہے قرآن کبھی کبھار واقعات پیش کرتا، تاکہ لوگوں کو معلوم ہو کہ محمد اللہ کا رسول ہے، ورنہ ایسی خبریں اس کو کیسے پتہ چلتا۔

محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور عقیدہ تثلیث:

قرآن مجید میں عقیدہ تثلیث کا رد کیا گیا ہے، مصنف اس کو بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عدم فہم پر محمول کر کے کہتا ہے کہ محمد کو اصل واقعہ کا علم نہیں تھا، نصاری تین خدا کے قائل نہیں بلکہ وہ خدا کو ایک ہی مانتے ہیں مگر حضرت مسیح کو سرچشمہ الوہیت کہتے ہے۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ نصاری لاکھ دفع اس کی تاویل وتشریح کرے، ان کی عبارات و تاویلات سے صاف ظاہوتا ہے کہ حضرت مسیح خدا ہے، اب یہ اشارۃً کہے یا دلالۃً مگر ان میں خدائی اوصاف ثابت کرتے ہیں، بعض عیسائی صراحۃً ان کو خدا تسلیم کرتے ہیں بعض اشارۃً بعض وصفا اور بعض الفاظ کا ہیر پھیر کر کے آخر میں خدائی ثابت کرتے ہیں۔کوئی لاکھ دفع شراب کی بوتل پر پانی لکھے یا اس کی طرف اشارہ کرے کہ یہ پانی کی بوتل ہے، مگر شراب، شراب ہی رہے گا، اس کی حقیقت اس کے کہنے سے تبدیل نہیں ہوگی۔

انجیل یوحنا میں موجود ہے کہ:

''ابتدا میں کلام تھا، کلام اللہ کے ساتھ تھا اور کلام اللہ تھا۔''

(انجیل یوحنا 1:1)

اس کی تفسیر مسیحی مفسر سے ملاحظہ فرمائیں:

''(ابتدا میں کلام تھا) اس کا اپنا کوئی آغاز نہیں۔ وہ ازل سے موجود ہے۔ انسانی ذہن جتنا بھی پیچھے کو ماضی میں جائے خداوند یسوع موجود ہے۔ وہ کبھی خلق نہیں کیا گیا۔ اُس کا کوئی شروع یا آغاز نہیں۔ (اس انجیل میں خدا کے بیٹے کا نسب نامہ بے موقع ہوتا) '' کلام اللہ کے ساتھ تھا'' اُس کی شخصیت بالکل الگ اور جدا ہے۔ وہ کوئی خیال یا تصور ہی نہیں، نہ کوئی مبہم مثال یا نظیر تھا بلکہ حقیقی شخص (اقنوم) تھا جو (خدا کے ساتھ) رہتا تھا۔ (کلام خدا تھا) وہ نہ صرف خدا کے ساتھ رہتا تھا بلکہ وہ خود خدا تھا۔ بائبل مقدس تعلیم دیتی ہے کہ خدا ایک ہی

ہے لیکن ذات الٰہی میں تین اقنوم یعنی باپ، بیٹا اور روح القدس۔ یہ تینوں اقانیم خدا ہیں۔ اس آیت میں ذاتِ الٰہی کے دو اقانیم یعنی خدا باپ اور خدا بیٹا کا ذکر ہوا ہے۔ انجیل میں بہت سے مقامات پر صاف صاف بیان ہوا ہے کہ یسوع مسیح خدا ہے۔ یہ ایسا پہلا موقع ہے ۔ کہ صرف اتنا کہنا کافی نہیں کہ وہ ایک خدا ہے، کہ وہ خدا کی مانند ہے، یا وہ الٰہی صفت کا مالک ہے۔ بائبل مقدس سکھاتی ہے کہ وہ خدا ہے۔''

تفسیر الکتاب جلد 2 صفحہ 240 مفسر ولیم میکڈونلڈ اردو مترجم جیکب سموئیل)

دیکھیئے کتنے صریح الفاظ میں کہہ رہا ہے کہ وہ خود خدا تھا، اور کہہ رہا ہے انجیل میں بہت سارے مقامات پر یسوع مسیح کو خدا کہا گیا ہے، بالفرض اگر اسے اقانیم ثلاثہ میں سے تسلیم بھی کیا جائے تب بھی نصاری اسے مستقل خدا مانتے ہے۔ بات وہی ہے آپ بات کو جتنا گھماؤ لیکن بالآخر نتیجہ وہی اخذ ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک مسیح مستقل خدا ہے۔ اسی لئے قرآن نے ان کی الوہیت کا رد کیا ہے۔

علاوہ ازیں مصنف کا یہ کہنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نصاری کے عقیدہ تثلیث سے بے خبر تھے، ان کو اصل عقیدہ کا معلوم نہیں تھا تو یہ ان کی اپنی تضاد اور اپنے دعویٰ کو کمزور کرنا ہے، کیونکہ کبھی آپ کا یہ دعویٰ ہوتا ہے محمد پڑھے لکھے تھے وہ جانتے تھے نصاری کے کتب کو بھی اور یہودیوں کے بھی، پھر کہتے ہو فلاں فلاں چیز محمد نے نہیں سمجھا تھا، پھر کہتے ہو ان کو سمجھنے میں غلطی ہوئی تھی، اور پھر اب یہ کہہ رہے ہو کہ ان کو تثلیث سے واقفیت نہیں تھی ۔ تو یہ متضاد و متناقض باتیں ابتداء تحریر سے شروع ہے جو مسلسل چل رہا ہے۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ ایک جگہ فرماتے ہیں کہ:

'' وَ قَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ابْنُ اللّٰهِ وَ قَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ ؕ ''

(سورة التوبہ 30)

''یہودی تو یہ کہتے ہیں کہ عزیر اللہ کے بیٹے ہیں، اور نصرانی یہ کہتے ہیں کہ مسیح اللہ کے بیٹے

ہیں۔‘‘

لیجئے اللہ تعالیٰ نے دونوں باتوں کی ردفرما دیا مسیح کی الوہیت کا بھی اور ابنیت کا بھی، مصنف جس آیات کو پیش کر کے یہ کہتا ہے کہ محمد کو عقیدہ تثلیث سے واقفیت نہیں تھی، یہ تو درست ہے رسول اللہ تو نہ انجیل پڑھا تھا اور نہ نصاری کے عقائد جس سے ان کو معلوم ہوتا، مگر وہاں مسیح ابن مریم کی الوہیت کا ابطال ہے۔اور یہاں اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی دونوں باتوں کی ردفرما دیا، چاہے اسے بیٹا کہے یا خدا یا خدا کا جزء ان سب کا اللہ تعالی نے رد کیا ہے۔

مسئلہ مصلوبیت مسیح:

حضرت عیسی علیہ السلام کو سولی پر چڑھایا گیا یا نہیں اور کیا یہود نے انہیں قتل یا نہیں۔اس بارے میں اہل اسلام اور نصاری کے درمیان اختلاف ہے، عیسائی کہتے ہیں کہ حضرت مسیح کو مصلوب کیا گیا اور پھر دوبارہ وہ زندہ ہو گئے اور اس کے بعد وہ آسمان پر اٹھالیا گیا۔

جب کہ مسلمان کہتے ہیں حضرت عیسی علیہ السلام کو یہودیوں نے مصلوب نہیں کیا بلکہ مسیح کے شکل میں کسی اور کو مصلوب کیا گیا، آپ کو اللہ تعالیٰ نے زندہ آسمان پر اٹھالیا۔

مصنف نے اس واقعہ پر کیا تبصرہ کیا ہے، اس خلاصہ یہ ہے کہ:

’’محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بعض نصارائے معتزلہ (Heresiarchs) کا یہ بیان بڑی خوشی سے قبول کر لیا کہ مسیح کو صلیب نہیں دی گئی۔ بہت سے نصارائے معتزلہ نے زمانۂ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بہت عرصہ پہلے اس بات سے انکار کر دیا تھا کہ مسیح کو تکلیفیں دی گئی تھیں۔۔۔۔مسیح کے دنیا میں واپس آنے اور اپنی سلطنت تمام دنیا پر قائم کرنے کا خیال انجیل کے عین مطابق ہے اور اسی سے لیا گیا ہے۔۔۔۔افسوس اسلام کے ہاتھوں سے شمشیر بُرّاں یہاں بھی نہیں چھوٹی، یعنی مسیح آ کر بذریعہ نوک شمشیر اسلام پھیلائے گا۔۔۔۔حضرت مسیح کو بعد نزول موت آنے کا خیال بھی اناجیل باطلہ سے لیا گیا ہے، کیونکہ انجیل میں اس کے خلاف ہے

۔۔۔۔مسلمانوں کی روایات میں یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ دنیا میں دوبارہ آکر عیسیٰ اپنی شادی کرے گا۔ یہ خیال غالباً مکاشفہ ۱۹:۷۔۹ کو غلط سمجھنے سے پیدا ہوا۔ان آیات میں لکھا ہے کہ:''آؤ ہم خُوشی کریں اور نہایت شادمان ہوں اور اُس کی تمجید کریں۔اِسلئے کہ برّہ کی شادی آپہنچی اور اُس کی بیوی نے اپنے آپ کو تیاّر کرلیا۔اور اُس کو چمکدار اور صاف مہین کتانی کپڑا پہننے کا اِختیار دِیا گیا کیونکہ مہین کتانی کپڑے سے مُقدّس لوگوں کی راست بازی کے کام مُراد ہیں۔اور اُس نے مُجھ سے کہا لِکھ۔مُبارک ہیں وہ جو برّہ کی شادی کی ضیافت میں بُلائے گئے ہیں۔ پھر اُس نے مُجھ سے کہا یہ خُدا کی سچی باتیں ہیں ''۔۔۔۔۔یہ بات کہ عیسیٰ دنیا میں دوبارہ آکر چالیس برس تک رہے گا کتاب اعمال ۱:۳ کی غلط فہمی سے پیدا ہوئی ہے، جہاں یہ لکھا ہے کہ یسوع مردوں میں سے جی اٹھنے اور آسمان پر چڑھ جانے کے درمیان چالیس دن تک اپنے شاگردوں کے ساتھ رہا۔''

پہلی بات کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے عدم مصلوبیت کے خیال کو رسول اللہ نے بعض معتزلہ نصاریٰ سے لینے کا الزام بھی محض الزام ہی ہے، حقائق سے اس کا کچھ تعلق نہیں، اگر اس جیسا نظریہ بعض نصاری میں موجود تھا تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں رسول اللہ نے وہاں سے لیا ہے، کیونکہ مصنف کے اس سے ماقبل کی تحاریر نے ثابت کردیا ہے کہ رسول اللہ کے دور میں اناجیل کا ترجمہ موجود نہیں تھا، اور اس میں اناجیل باطلہ بھی شامل ہیں، کیونکہ جب اصل اناجیل کا ترجمہ موجود نہیں تھا تو چہ جائیکہ اباطیل اناجیل کا موجود ہو۔اس لئے یہ ثابت نہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہاں سے لیا ہے، یہ محض اتفاقی بات ہے تو بغیر تحقیق اور بلا دلیل یہ کہنا کہ یہ بات فلاں سے لی گئی ہے غیر معقول ہے، اور اس کا غیر معقول ہونا ماقبل ثابت کیا جاچکا ہے۔ یہ عجیب منطق ہے محض اتفاقی اشیاء کو بغیر دلیل ماخذ کا نام دینا، نہ جانے دنیا کے کس منطق میں ہے، کسی بندے میں اگر کوئی ہنر موجود ہے، تو دوسرا اس کو کہے آپ نے یہ کام فلاں بندے سے سیکھا ہے کیونکہ یہ تم سے پہلے وہ جانتا تھا اور وہ بھی ایسا کرتا ہے، تو کیا اس کی یہ بات معتبر ہوگی،

کیونکہ ممکن ہے وہ اس شخص سے نہیں سیکھا ہو بلکہ کہی اور سے سیکھا ہو، یا خود بخود کہی سے دیکھ کر اس کو آیا ہو، جیسے عمرو جو کہ خطاط ہے، اس سے بکر کہے کہ آپ نے یہ خط زید سے سیکھا ہے کیونکہ زید خطاط ہے، اور آپ کا خط اس سے ملتا جلتا ہے، حالانکہ عمرو نے زید سے نہیں سیکھا بلکہ کسی اور سے سیکھا ہے یا خود محنت کر کے کچھ خطاط کو دیکھ کر خط لکھنا شروع کیا۔ تو کیا بکر کا دعویٰ درست ہوگا نہیں کیونکہ بکر محض شک کی بنیاد پر کہہ رہے ہیں، نہ اس نے عمرو کو دیکھا ہے زید سے خطاطی سیکھتے ہوئے اور نہ کوئی ٹھوس قرینہ یا دلائل وشواہد موجود ہے کہ عمرو زید سے سیکھا ہے۔

یہی حال ہمارے فاضل مصنف کا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کچھ باتیں اتفاقی موجود ہو یا کچھ شرعی تو ان پر اپنے گمان کر کے یہی ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فلاں سے لی ہے۔

دوسری بات کہ ”حضرت مسیح کے دنیا میں واپس آنے اور اپنی سلطنت تمام دنیا پر قائم کرنے کا خیال انجیل کے عین مطابق ہے اور اسی سے لیا گیا ہے“ اس کا جواب ابھی عدم مصلوبیت کے جواب میں دیا گیا کہ کسی بات کو اس لئے ماخذ قرار دو کہ یہ بات پہلی بات کے عین مطابق ہے، غلط ہے۔

تیسری بات کہ حضرت مسیح علیہ السلام آ کر دجال کو قتل کریں گے، اور جہاد کریں گے اس کو مصنف اسلام کو بذریعہ شمشیر پھیلانے کا دعویٰ کر رہا ہے کہ مسلمان یہاں بھی حضرت مسیح علیہ السلام کے لئے بزور شمشیر اسلام پھیلانے کو ثابت کر رہے ہیں۔ یہ بات سرے سے غلط ہے کہ اسلام بزور شمشیر پھیلا، پہلے بھی مسلمانوں نے اس اعتراض کو رد کیا ہیں اور آج بھی کر رہے ہیں، اگر اسلام بزور شمشیر پھیلا تو اس وقت ہمارے ملک پاکستان میں اقلیتوں پر اب تک تلوار پھیل گیا ہوتا اور پاکستان میں اب تک تمہیں سب مسلمان نظر آتے، مگر ایسا نہیں جہاں عیسائی بھی ہیں، یہودی بھی ہے، اور دیگر مذاہب سے تعلق رکھنے والے افراد بھی ہیں، مگر آج تک مسلمانوں

نے ان پر تلوار یا بندوق نہیں کھینچا کہ مسلمان ہو جاؤ ورنہ مار دیئے جاؤ گے۔ اس کے علاوہ پورے دنیا میں مسلم ممالک میں تمام مذاہب سے تعلق رکھنے والے افراد ہیں جا کر دیکھو، تحقیق کرو کیا آج تک مسلمانوں نے انہیں زبردستی اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا ہیں؟ گزنہیں، یہ مثال اور جواب ہمارے لئے کافی ہے۔

مجھے افسوس ہوتا ہے ایسے الزام پر کہ یہ الزام ایک ایسے مذہب پر لگایا جاتا ہے جس مذہب میں دوسرے مذاہب کے خداؤں یا دیوتاؤں کو سب و شتم کرنے سے روک دیا گیا ہے، جس مذہب میں راستے سے پتھر اٹھانے کو ایمان کے شاخ قرار دیا ہے، اس کے علاوہ تاریخ پر اگر نظر دوڑائیں تو اندازہ ہوگا شمشیر سے کام کس نے لیا، بیت المقدس کو فتح کرنے کا واقعہ اس بات پر شاہد ہے۔ اور آج بھی دنیا میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں کیا عیسائی یا یہودیوں کی جانب سے ان پر ظلم نہیں کیا جارہا، اس کی حالات ہمارے سامنے ہیں۔ اور اس کے سب سے بڑی مثال فلسطین ہے جہاں اب تک ساٹھ ہزار (60000) سے زائد افراد کو شہید کیا گیا ہیں، اور یہ بات صرف ہم مسلمان نہیں کہتے کہ وہاں ظلم ہو رہا ہیں بلکہ پوری دنیا مسلم و غیر مسلم یہ بات تسلیم کر چکی ہیں کہ فلسطین میں اسرائیل کی جانب سے بے گناہ مسلمانوں کو شہید کیا جارہا ہیں۔ اس کے برخلاف جن اسلامی ممالک میں عیسائی یا یہودی اقلیت میں ہیں، پوچھ لو مسلمانوں سے نہیں۔ خود ان عیسائی اور یہودی و دیگر مذاہب سے تعلق رکھنے والوں سے پوچھ لو، مسلمانوں کا تمہارے ساتھ رویہ کیسا ہے۔ تب ان شاء اللہ حقائق اور آنکھیں کھلیں گی۔

میں چیلنج کرتا ہوں پوری دنیائے عیسایت و یہودیت و دیگر معترضین کو کہ آج تک جو غیر مسلم اسلام میں داخل ہو رہے ہیں، جا کر ان سے پوچھ لو تم پر کس نے بندوق یا شمشیر پکڑا تھا کہ تم مسلمان ہو جاؤ۔ اگر کوئی یہ ثابت کرے کہ فلاں کو زبردستی مسلمان بنایا گیا ہیں تو میں اپنی وسعت کے مطابق اس کی سوچ سے بڑھ کر اس کو انعام دینے کے لئے تیار ہوں۔ اگر ایسا نہیں

اور گز نہیں تو پھر ایک بار نہیں ہزار بار سوچ لو اور اسلام کو بغرض تحقیق پڑھو نہ کہ بغرض بغض وحسد و تنقید۔

اور ساتھ ساتھ یہ وضاحت بھی سنو اسلام کا مزاج یہ نہیں کسی کو زبردستی مسلمان بنایا جائے، جو ایسا کرے گا وہ ان کا اپنا فعل ہوگا، اسلام کا اس سے کوئی تعلق نہیں اور نہ اسلام نے اس کا حکم دیا ہے۔ ہاں دعوت کا حکم دیا ہے، ہم غیر مسلم کو دعوت دیتے ہیں کہ آپ آجاؤ اسلام میں داخل ہوجاؤ ،سوچ لو، حق مذہب یہی ہیں، اب اس کی مرضی قبول کرے یا نہ کرے، مگر اس پر کوئی زبردستی نہیں۔

چوتھی بات کہ حضرت مسیح کو بعد نزول موت آئے گی یہ بھی اناجیل باطلہ سے لیا گیا ہیں کیونکہ انجیل میں اس کے خلاف ہے۔ یہ بھی عجیب منطق ہے، کوئی بات اگر انجیل کے خلاف ہو یا انجیل میں واقع نہ ہو تو اس کا مطلب کہی سے لیا ہے۔ میرے خیال سے مزید اس پر اب کلام کرنے کی ضرورت نہیں۔

پانچویں بات شادی کرنے کا، تو قارئین کرام آپ خود مکاشفہ کی عبارت بھی دیکھے جو مصنف نے پیش کیا ہے اور مسلمانوں کا نظریہ بھی اس سے متعلق دیکھے، کیا دونوں کا جوڑ بنتا ہے۔ اس پر بجائے ہم تبصرہ کرے قارئین کو تبصرہ کا موقع دیتے ہیں وہ دونوں خیالات کو پڑھ کر فیصلہ کرے ۔اور ساتھ ساتھ اس بات پر بھی غور کیجئے گا کہ اسلام کے رو سے حضرت مسیح علیہ السلام چالیس برس تک رہے گا، اس پر اعمال کی جس آیت کو پیش کیا ہے، ذرا وہ بھی دیکھ لینا۔ نہ جانے موصوف کیوں سفید کو سیاہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

بعثت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی نسبت عیسیٰ کی پیش گوئی:

اس عنوان کے تحت مصنف نے اولاً مشہور بحث ''فارقلیط''، جو انجیل یوحنا اور برناباس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے پیشگوئی کے طور پر آئی ہے، کو چھیڑا ہے، سردست اس کے

بارے میں الحمداللہ مسلمان علماء کی جانب سے اس کو خوب واضح اور صاف کردیا گیا ہیں اور اس پر مستقل تصانیف موجود ہے، اس کے علاوہ مولانا رحمت اللہ کیرانوی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''اظہارالحق''، اور مولانا سید آل حسن مہانی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''کتاب الاستفسار'' میں اس پر کافی وشافی بحث کی ہے، اور مولانا سید آل حسن نے اس پر اپنی کتاب میں زبردست چیلنج بھی دیا ہے ۔لہذا اس مشہور بحث کو یہاں ذکر کرنا نہیں چاہتا، جن کو تفصیل درکار ہو وہ ان کتب کے علاوہ دیگر ردعیسائیت پر لکھی گئی کتب کی طرف مراجعت کرے یہ بحث وہاں ملے گا ان شاءاللہ ۔

اس بحث میں مصنف نے ایک اور بات بھی کی ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے پیشگوئیوں کو صرف محمد نے اپنے اوپر چسپاں نہیں کیا بلکہ اس سے پہلے بھی ایسے گزرے ہیں، چنانچہ لکھتے ہیں کہ:

''قبل اس کے کہ ہم بحث ختم کریں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ناظرین پر یہ بات واضح کر دی جائے کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی پہلے شخص نہیں ہیں جنہوں نے انجیل یوحنا کی ان آیات میں اپنے لئے پیش گوئی ہونے کا دعویٰ کیا۔ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پہلے مانی جو ایران کے قصے کہانیوں میں ایک حیرت انگیز مصور کی حیثیت سے مشہور رہے، یہ دعویٰ کیا تھا کہ میں وہی ''شخص'' ہوں جس کی طرف مسیح نے ان آیات میں اشارہ کیا ہے۔ مانی کا دعویٰ یہ تھا کہ میں ''فارقلیط'' ہوں جس سے اس کا مقصد غالباً یہ تھا کہ جاہل عیسائیوں کو اپنا طرف دار بنالے۔ اور یہ امر قابل توجہ ہے کہ اس شخص نے تاریخی یسوع کو تسلیم نہیں کیا تھا بلکہ اپنی طرف ایک ایسا مسیح ایجاد کر لیا تھا ''جس نے نہ تکلیف اٹھائی نہ وفات پائی''۔ ایک اور بات جس میں وہ اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دونوں برابر ہیں یہ ہے کہ اس نے اپنے لئے ''انبیا کا سردار'' اور ''سفیر النور'' ہونے کا دعویٰ کیا تھا اور کہتا تھا کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ یہی دعویٰ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بھی ہے مگر وہ شخص محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرح خوش قسمت نہیں تھا کیونکہ اسے بام اول شاہ ایران کے حکم سے

تقریباً ۲۷۶ء میں سولی پر چڑھا دیا گیا۔اس شخص نے ایک کتاب پیش کی تھی جسے مشرقی ممالک کے مصنفین ''ارتنگ'' یا (ارژنگ) کہتے ہیں۔اس کا دعویٰ یہ تھا کہ اس پر یہ کتاب آسمان سے نازل ہوئی ہے اور لوگوں کے لئے آخری الہام ہے۔''

جان لینا چاہیے کہ نبوت کا دعوی اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کوئی شخص کرتا تو اس کو دیکھ لیا جاتا کہ نبوت کی علامات اس میں پائی جاتی ہے یا نہیں، اگر علامات موجود تھے تو وہی نبی تھے ورنہ وہ جھوٹا اور کذاب ہوتا۔ کیونکہ ہمارا عقیدہ ہے اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نیا نبی نہیں آئے گا اور نبوت کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے، اس لئے رسول اللہ کے بعد یہ بات اب ختم ہوئی کہ کوئی نبوت کا دعویٰ کرے اور لوگ اس میں نشانیاں ڈھونڈے کہ اس میں علامت نبوت موجود ہے یا نہیں۔

جب کوئی نبی آتا تو جانے کے بعد وہ اپنے مابعد آنے والے نبی کی طرف اشارات ونشانیاں چھوڑ دیتا تا کہ یہ قوم آنے والے نبی کو پہچان لے، اسی سلسلہ حضرت عیسی علیہ السلام نے بھی ایسے ارشادات وفرمودات چھوڑ گئے جس سے نبی آخر الزماں کی طرف اشارہ ملتا ہے۔

مصنف نے جو واقعہ پیش کیا ہے کہ رسول اللہ سے پہلے بھی ایسے شخص گزرا ہے جس نے دعوائے نبوت کیا، اور اسی طرح ایک کتاب پیش کی کہ یہ آسمانی اور الہامی کتاب ہے جو مجھ پر نازل ہوا ہے، یہی بات ہم سمجھانا چاہتے ہیں کہ جھوٹی مدعی نبوت ہر دور میں پیدا ہوتے ہیں، مگر اس میں وہ نبوت کی علامات موجود نہیں ہوتے جس کی وجہ سے اس کو نبی تسلیم کیا جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں تمام نبوت کی علامات موجود ہیں۔ہم نے صرف یہ کہہ کر ان کو نبی نہیں مانا کہ انہوں نے کہا میری پیشگوئی حضرت عیسی علیہ السلام نے کی ہے اس لئے میں نبی ہوں، منجملہ اس کے اور بھی وجوہات کی بنا پر آپ اللہ کے آخری نبی اور رسول ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ آپ سے باوجودِ امی ایسے کلام کا صدور رہوا جس کی شہادت مخالفین نے بھی دیا کہ یہ کسی بشر کا کلام نہیں

ہوسکتا ، علاوہ ازیں ایسے معجزات کا صدور آپ سے ہوا ہے جس سے آپ کی نبوت اظہر من الشّمس ہوجاتا ہے ۔ اس کے علاوہ دیگر علامات نبوت آپ میں موجود تھے ۔ کیونکہ اس وقت موضوع سخن قرآن کریم ہے اس لئے ہم نے اسی معجزہ کا ذکر کیا۔ ورنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی علامات نبوت پر مستقل تصانیف موجود ہیں۔

اس لئے کوئی اٹھے اور دعوائے نبوت کرے پھر اس کو نبی تسلیم کیا جائے ، یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ اور یہ بات بھی واضح ہونا چاہیے کہ دور میں ایسی جھوٹی مدعیان نبوت پیدا ہوئے ہیں ، جیسے مصنف کہہ رہا ہے رسول اللہ سے پہلے بھی ایسا ہوا ہے ، مگر مصنف کا یہ قیاس ، قیاس مع الفارق ہے اس لئے سچے نبی کی پہچان علامات سے ہوتی ہے ، خاص کر معجزات سے اور دیگر قرائن سے۔ مگر جھوٹی مدعی نبوت ایسا نہیں ہوتا ، اسی لئے جس شخص نے قبل محمد صلی اللہ علیہ وسلم نبوت کا دعویٰ کیا تھا ، وہ کہا ہے؟ اور اس کی کتاب کہا ہے؟ اس کے متبعین کہا ہے شاید وہ اب موجود نہیں ۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کتاب پیش کی وہ صدیوں سے موجود ہے ، جو نشانیاں لے کر آئے وہ نشانیاں موجود ہے ، جو پیشگوئیاں کی وہ پوری ہو چکے ہیں ، اور ہو رہے ہیں ۔ اور خود لوگوں کا دل اس بات پر گواہی دیتا ہے کہ یہ رسول اللہ تھا ، بشرطیکہ ز دو عناد سے ہٹ کر رسول اللہ کو پڑھے ، جنھوں نے دیکھا انہوں نے یقین کیا اور پہچان لیا یہی آخرالزماں رسول ہے مگر ز دو عناد و بغض یا کسی وجہ سے انکار کیا ، آج بھی یہی حال چل رہا ہے کوئی بھی غیر مسلم اگر اسلام قبول کر رہا ہے تو قرآن و رسول اللہ کی سیرت پڑھ کر کر رہا ہیں نہ کہ اسے زبردستی اس پر مجبور کیا جا رہا ہے ۔ یہی اسلام کی سب سے بڑی خاصیت ہیں جو افراط وتفریط سے پاک ہے ۔ باقی تمام مذاہب میں افراط وتفریط پایا جاتا ہے ، جب کہ اسلام ہی عین فطرت دین ہے اور فطرت انسان ہے۔

تین باتوں پر بے معنی اعتراض:

آگے مصنف نے تین باتوں پر بے معنی و بے جا اعتراض کیا ہے، ایک ان میں سے تخلیق آدم وسجدہ ملائکہ ہیں، جس کا واقعہ قرآن میں کئی مقامات پر مذکور ہے۔اس پر مصنف نے جو واقعات ماخذ کے حوالے سے پیش کیا ہے کسی ایک ایک میں بھی ماخذ تو کجا مشابہت بھی نہیں پائی جاتی، اگر ہم بعینہ قرآن اور مصنف کے پیش کردہ واقعات کو پیش کریں تو شاید ہمارے یہ مضمون باعث تطویل ہو، حاصل کلام یہی ہے کہ دعوی ماخذ کا ہے مگر واقعہ دور دور تک قرآن کے واقعہ سے نہیں ملتا، چہ جائیکہ ماخذ ہو۔

اور اسی طرح دوسرا پل صراط کا واقعہ ہے جس کا تذکرہ سورۃ مریم آیت 71 میں موجود ہے کہ:

''وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا ۚ كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا''

''اور تم میں سے کوئی نہیں ہے جس کا اس (دوزخ) پر گزر نہ ہو۔ اس بات کا تمہارے پروردگار نے حتمی طور پر ذمہ لے رکھا ہے۔''

اس سے مصنف نے یہ سمجھا کہ انسان کو جہنم میں جانا پڑے گا، چاہے مسلم ہو یا کافر، حالانکہ اس سے مراد پل صراط ہے جس سے شخص خواہ مسلم ہو یا کافر کا گزر ہوگا۔اور اس پر جو واقعہ پیش کیا ہے وہ بھی پہلے کی طرح اس سے ملتا ہی نہیں۔

اور تیسری بات میزان الاعمال کا ہے، یعنی قیامت کے دن اچھے اور برے اعمال تولے جائیں گے، مصنف نے اس پر کئی اقتباسات پیش کیا ہیں مگر وہ تفصیلات نہ قرآن میں موجود ہے اور نہ احادیث صحیحہ میں، اور اس پر وہ ایک کتاب جو بقول مصنف مشکوک الصحت ہے ''صحیفہ ابراہیم'' سے اقتباس پیش کیا ہے، مگر خود نہیں معلوم یہ کتاب کب لکھی گئی ہے اس کی تاریخ کیا ہے، اور یہاں بھی ممکن اور غالبا جیسے شکیہ الفاظ کہہ کر اپنے دعویٰ کو ثابت کرنے کی کوشش کر رہا

ہے۔اور پھر کہتے ہیں غالباً ماریہ قبطیہ سے لیا ہوگا، آگے چل کر پھر ''کتاب الموتی'' نامی کتاب سے اقتباس پیش کر کے یہی کہتا ہے غالباً یہاں سے لیا ہوگا۔ حالانکہ خود مصنف کو یقینی معلوم نہیں ،کتب کی حالت کا معلوم نہیں اور نہ واقعات کے تقابل کا۔فقط اپنے گمان کے مطابق کہتا ہے یہ غالباً یہاں سے لیا ہوگا یا وہاں سے۔

بہشت میں حضرت آدم کی خوشی وغم:

موصوف نے معراج کی حدیث نقل کرنے کے بعد ''صحیفہ ابراہیمی'' سے اس جیسا واقعہ نقل کیا ہے جو کہ باہم مختلف ہے، مگر یہ بھی موصوف کا ظرف ہے کہ اسے ماخذ قرار دے رہا ہے۔ سب سے پہلے وہ مکمل حدیث ملاحظہ فرمائیں جو مصنف نے نصف بیان کیا ہے، خوف طوالت سے فقط ترجمہ پر اکتفاء کرتے ہیں:

''حضرت ابن شہاب، انس ؓ سے روایت کرتے ہیں انہوں نے کہا: ابوذر ؓ حدیث بیان کیا کرتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''میں مکہ میں تھا کہ میرے گھر کی چھت کھول دی گئی تو جبریل ؑ نازل ہوئے انہوں نے میرا سینہ چاک کیا، پھر اسے آب زم زم کے ساتھ دھویا، پھر وہ حکمت وایمان سے بھری ہوئی سونے کی طشت لائے، اسے میرے سینے میں ڈال دیا، پھر اسے جوڑ دیا، پھر میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے آسمان کی طرف لے گئے، جب میں آسمان دنیا پر پہنچا تو جبریل نے آسمان کے محافظ سے کہا، دروازہ کھولو، اس نے پوچھا: آپ کون ہیں؟ فرمایا، جبریل، اس نے پوچھا: آپ کے ساتھ کوئی ہے؟ انہوں نے فرمایا: ہاں، میرے ساتھ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔اس نے پوچھا: کیا ان کی طرف بلانے کے لیے بھیجا گیا تھا؟ انہوں نے فرمایا: ہاں، جب دروازہ کھول دیا گیا تو ہم آسمان دنیا پر چلے گئے، وہاں ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا کچھ لوگ اس کے دائیں طرف تھے اور کچھ اس کے بائیں طرف، جب وہ اپنی دائیں جانب دیکھتے تو مسکرا دیتے اور جب اپنی بائیں جانب دیکھتے تو رونا شروع کر

دیتے، انہوں نے کہا: خوش آمدید نبی صالح اور بیٹے صالح، میں نے جبریلؑ سے پوچھا یہ کون ہیں؟ انہوں نے فرمایا: یہ آدمؑ ہیں، اور ان کے دائیں اور بائیں جانب جو گروہ ہیں، یہ ان کی اولاد کی روحیں ہیں، ان کے دائیں طرف والا گروہ اہل جنت کا ہے، اور ان کے بائیں طرف والا گروہ جہنمیوں کا ہے، جب وہ اپنی دائیں جانب دیکھتے ہیں تو مسکراتے ہیں، اور جب اپنی بائیں جانب دیکھتے ہیں تو رو دیتے ہیں، پھر مجھے دوسرے آسمان تک لے جایا گیا، جبریلؑ نے اس کے محافظ سے کہا: دروازہ کھولو، اس کے محافظ نے بھی انہیں ویسے ہی کہا جیسا پہلے آسمان والے محافظ نے کہا تھا۔'' انسؓ بیان کرتے ہیں، آپ ﷺ نے ذکر فرمایا کہ انہوں نے آسمانوں میں آدم، ادریس، موسیٰ، عیسیٰ اور ابراہیمؑ سے ملاقات کی، اور ابوذرؓ نے یہ بیان نہیں کیا کہ ان کی منازل کیسی ہیں، البتہ انہوں نے یہ ذکر کیا کہ آپ ﷺ نے آدمؑ کو آسمان دنیا پر اور ابراہیمؑ کو چھٹے آسمان پر پایا، ابن شہاب نے بیان کیا، ابن حزم نے مجھے خبر دی کہ ابن عباس اور ابوحبہ انصاریؓ دونوں بیان کیا کرتے تھے، نبی ﷺ نے فرمایا: ''پھر مجھے اوپر لے جایا گیا حتیٰ کہ میں اس قدر بلند جگہ پر پہنچ گیا کہ میں قلموں کے لکھنے کی آواز سنتا تھا۔'' ابن حزم اور انسؓ نے بیان کیا، نبی ﷺ نے فرمایا: '' اللہ نے میری امت پر پچاس نمازیں فرض کیں، میں یہ (حکم) لے کر واپس ہوا، اور میرا گزر موسیٰؑ کے پاس سے ہوا تو انہوں نے فرمایا: اللہ نے آپ کی امت پر کیا فرض کیا ہے؟ میں نے کہا: پچاس نمازیں، انہوں نے فرمایا: اپنے رب کے پاس واپس جائیں کیونکہ آپ کی امت طاقت نہیں رکھے گی، انہوں نے مجھے واپس لوٹا دیا، تو اللہ تعالیٰ نے ان (نمازوں) کا کچھ حصہ کم کر دیا، میں موسیٰؑ کے پاس واپس آیا تو میں نے بتایا کہ اس نے ان میں سے کچھ کم کر دی ہیں، انہوں نے فرمایا: اپنے رب کے پاس واپس جائیں کیونکہ آپ کی امت اس کی طاقت نہیں رکھ سکے گی، میں واپس گیا اور اپنی بات دائی تو اس نے ان میں سے کچھ اور کم کر دیں، میں پھر ان کے پاس واپس آیا، تو انہوں نے فرمایا: اپنے رب کے پاس واپس جائیں کیونکہ آپ کی امت اس کی طاقت نہیں رکھے گی، میں نے پھر اس سے

درخواست کی تو اس نے فرمایا: وہ (ادائیگی میں) پانچ ہیں اور (ثواب میں) وہ پچاس ہیں میرے ہاں بات تبدیل نہیں کی جاتی، میں موسیٰؑ کے پاس آیا تو انہوں نے فرمایا: اپنے رب کے پاس پھر جائیں، میں نے کہا: مجھے اپنے رب کے (پاس بار بار جانے) سے شرم آتی ہے، پھر مجھے سدرۃ المنتہی تک لے جایا گیا، کئی رنگوں نے اسے ڈھانپ رکھا تھا، میں نہیں جانتا وہ کیا ہیں؟ پھر مجھے جنت میں لے جایا گیا، وہاں موتیوں کے گنبد تھے اور اس کی مٹی کستوری کی تھی۔'' متفق علیہ۔

(مشکوٰۃ، باب معراج کے بیان میں)

اس کے ماخذ پر مصنف نے جو روایت نقل کیا ہے وہ بھی ملاحظہ کیجئے اور مصنف کے عقل کو داد دیتے جائیے:

'' میکائیل نے سواری کو موڑا اور ابراہیم کو جانب مشرق آسمان کے پہلے دروازہ پر لے گیا اور ابراہیم نے دو راستے دیکھے۔ ایک راستہ ٹیڑھا اور تنگ اور دوسرا وسیع اور چوڑا تھا۔ اور وہاں اس نے دو پھاٹک دیکھے یعنی ایک چھوٹا جو تنگ راستہ پر تھا اور دوسرا چوڑا جو وسیع راستہ پر تھا۔ اور دونوں پھاٹکوں کے باکی طرف میں نے ایک آدمی کو تخت پر بیٹھے دیکھا اور یہ تخت سونے سے منڈھا ہوا تھا اور اس آدمی کا چہرہ ایسا ہولناک تھا جیسا خداوند کا چہرہ۔ اور میں نے دیکھا کہ بہت سی روحوں کو فرشتے ہانکنے لئے جا رہے تھے اور ان کو بڑے پھاٹک سے لے جایا جا رہا ہے۔ اور میں نے دوسری روحیں بھی دیکھیں، مگر چند، جنہیں فرشتے تنگ راستے سے لے جا رہے تھے اور جب اس عجیب وغریب آدمی نے جو طلائی تخت پر بیٹھا تھا تنگ راستہ سے کم اور بڑے راستہ سے زیادہ روحوں کو جاتے دیکھا تو اس نے فوراً اپنے سر کے بال اور اپنی داڑھی پکڑ لی اور خود کو تخت سے زمین پر گرا دیا اور فریاد وزاری کرنے لگا۔ اور جب وہ چھوٹے پھاٹک سے بہت سی روحوں کو داخل ہوتے دیکھتا تھا تو وہ زمین پر سے اٹھ کر اپنے تخت پر بیٹھ جاتا تھا اور بہت خوش ہوتا تھا اور خوشی کے مارے پھولا نہ سماتا

تھا۔ابرہیم نے سپہ سالار سے دریافت کیا کہ ''اے میرے آقا سپہ سالار اعظم یہ عجیب و غیریب آدمی کون ہے جس پر اس قدر عظمت وشان برس رہی ہے اور جو ایک وقت فریاد و زاری کرتا ہے اور دوسرے وقت مسرور وشادماں ہوتا؟'' تب اس ہستی بے جسم (میکائیل) نے کہا کہ ''یہ آدم ہے جو پہلا انسان ہے، جسے پیدا کیا گیا، جو اس قدر عظمت وجلال کے ساتھ بیٹھا ہے اور وہ دنیا کو دیکھتا ہے کیونکہ سب آدمی اسی کی اولاد ہیں۔ جب وہ بہت سی روحوں کو چھوٹے پھاٹک سے داخل ہوتے دیکھتا ہے تو وہ اٹھ کر اپنے تخت پر بیٹھ جاتا ہے اور مسرور وشادماں ہوتا ہے۔ کیونکہ چھوٹے راستہ سے نیک اور عادل روحیں داخل ہوتی ہیں اور یہ راستہ حیات کی طرف لے جاتا ہے۔اور جو لوگ اس راستہ سے جاتے ہیں وہ جنت میں داخل ہوتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ آدم جو سب سے پہلا مخلوق شدہ انسان ہے، خوش ہوتا ہے کیونکہ وہ روحوں کو نجات پاتے ہوئے دیکھتا ہے۔اور جب وہ بہت سی روحوں کو بڑے پھاٹک سے داخل ہوتے دیکھتا ہے تو وہ اپنے بال اکھاڑتا ہے اور خود کو تخت سے زمین پر گرا دیتا ہے اور بری طرح گریہ بکا کرتا ہے کیونکہ بڑا پھاٹک گنہگاروں کا راستہ ہے جو تباہی اور عذاب ابدی کی طرف لے جاتا ہے۔''

ہم نے مکمل حدیث بیان کر دیا ہے، مصنف نے محض حضرت آدم علیہ السلام کا ذکر بیان کر کے یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ ''صحیفہ ابراہیمی'' میں بھی ایسا واقعہ ہے۔اب یہ فیصلہ قارئین پر چھوڑتے ہیں وہ دونوں واقعات بغور مطالعہ کریں اور فیصلہ کرے کیا اس سے ماخذ ثابت ہوتا ہے، یا ماخذ کا سوال پیدا ہوتا ہے۔

پہلی بات اگر یہ بات رسول اللہ نے ''صحیفہ ابراہیمی'' سے لیا ہے تو پھر واقعہ میں اختلاف کیوں ہے، صحیفہ ابراہیمی میں کچھ اور ہے یہاں کچھ اور۔

دوسری بات پھر یہ کیسا ممکن ہے رسول اللہ نے صرف حضرت آدم کا ذکر تو وہاں سے لیا، اور آگے جو کچھ بیان ہوا ہے حدیث میں وہ پھر کہاں سے لیا؟ اگر اپنی طرف سے بیان کیا ہے تو

آپ کا ماخذ کا دعویٰ باطل ہوگا، کیونکہ اس صورت میں پھر ممکن ہے جتنے ماخذ پر دلائل آپ نے پیش کئے ہیں وہ سب اپنی طرف سے بیان کیا ہو، کیونکہ سب میں واقعات مختلف ہیں، اور اگر کہیں اور سے لیا ہے یعنی یہودی یا نصاری سے، تو کیا نصاریٰ اور یہودیوں کی کس کتاب میں یہ واقعہ درج ہے؟ اور ان لوگوں نے کہا سے لیا تھا؟

کیا رسول اللہ نے عہد نامہ جدید سے کچھ لیا ہے؟

اس سلسلہ میں مصنف نے جو دعوی مع دلیل پیش کیا ہے، ملاحظہ کیجئے:

''یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مشکوک الصحت نصرانی ذرائع سے اس قدر کثیر مواد لیا ہے تو کیا انہوں نے عہد نامۂ جدید سے کچھ نہیں لیا ہوگا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ واقعی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عہد نامۂ جدید سے بہت کم مواد لیا ہے۔ یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بالواسطہ یہ باتیں سیکھی تھیں کہ عیسیٰ کا باپ کوئی بشر نہیں تھا، عیسیٰ مامور من اللہ تھا، وہ معجزے دکھاتا تھا، اس کے بہت سے حواری تھے اور وہ آسمان پر چڑھ گیا تھا۔ مگر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے الوہیت مسیح سے انکار کیا، مسیح کی موت کو بنی آدم کے گناہوں کا کفارہ نہیں مانا (اور اسی وجہ سے مسیح کے نشر ثانیہ سے انکار کیا)۔ مگر بایں ہمہ قرآن اور احادیث میں عہد نامہ جدید کے بعض مقامات سے استفادہ کیا گیا ہے، مثلاً قصہ مائدہ یعنی مسیح اور اس کے حواریوں پر آسمان سے خوان نعمت کا نازل ہونا یا محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق انجیل میں پیش گوئی ہونا۔ ان میں ایک خیال بہت نمایاں طور پر براہ راست انجیل سے لیا گیا ہے۔ یہ سورۂ الاعرف کی آیت ۴۰ ہے:

'' إِنَّ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَاسْتَكْبَرُوا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ أَبْوَابُ السَّمَاءِ وَلَا يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ حَتَّىٰ يَلِجَ الْجَمَلُ فِي سَمِّ الْخِيَاطِ وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُجْرِمِينَ ''۔ (ترجمہ) ''یقیناً جن لوگوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا اور غرور تکبر کے ساتھ ہماری نشانیوں کی طرف سے ہٹ گئے، ان کے لئے آسمان کے

دروازے نہیں کھلیں گے اور وہ جنت میں داخل نہ ہوں گے تاوقتیکہ اونٹ سوئی کے ناکہ سے نہ گزر جائے۔ یہ آیت انجیل لوقا ۱۸:۲۵ کا لفظی ترجمہ ہے، جو یہ ہے ''اونٹ کا سوئی کے ناکہ میں نکل جانا زیادہ آسان ہے بمقابلہ اس کے کوئی دولت مند آدمی خدا کی سلطنت میں داخل ہو''۔اسی کے قریب قریب الفاظ انجیل متی ۱۹:۲۴ اور انجیل مرقس ۱۰:۲۵ میں بھی ہیں۔''

قارئین کرام! تضاد کا عالم دیکھیے، اب تک تو یہ ثابت کر رہا تھا کہ رسول اللہ نے حضرت عیسی علیہ السلام کے بارے میں یہ باتیں کہ'' وہ بن باپ پیدا ہوئے، مامور من اللہ تھے، آسمان پر چڑھ گیا، معجزے دکھاتے تھے، اناجیل باطلہ مشکوکہ سے لیا ہے'' یہاں یہ کہہ رہا ہے کہ بالواسطہ یہ باتیں سیکھیں تھیں، یعنی خود تو نہیں دیکھا تھا، کسی کے واسطے سے سیکھا تھا یا کسی نے بتایا تھا براہ راست خود نہیں دیکھا تھا۔اس پر بجز اس کے اور کیا کہہ سکتے ہیں ؂

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

اور سورۃ الاعراف کی آیت کو لوقا کی آیات کا لفظی ترجمہ کہنا گویا بمثل'' الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے'' کی طرح ہے، یعنی چوری بھی کروں گا اور بدمعاشی بھی۔آیت کا ترجمہ ہی لوقا کے عبارت سے الگ ہے، چہ جائیکہ لفظی ترجمہ ہو۔

آگے ایک روایت حدیث پیش کی ہے، جس کے متعلق کہتا ہے کہ یہ بھی بائبل عہد جدید سے لیا گیا ہے۔قطع نظر اس بات سے کہ روایت انجیل کی عبارت سے ملتا ہے یا نہیں۔ہم سیدھا سادہ الفاظ میں یہ جواب دیں گے کہ موصوف کے نزدیک جب بائبل عہد نامہ جدید کا ترجمہ رسول اللہ کے دور میں موجود ہی نہیں تھا، تو پھر رسول اللہ نے یہ روایت کیسے دیکھا۔

فصل ششم: باب پنجم کی مدافعت

قرآن واحادیث میں زردشتی عنصر:

یہ عنوان قائم کرنے کے بعد مصنف نے بطور تمہید جو باتیں پیش کی ہے، ان کا خلاصہ یہ ہے کہ:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے پہلے کی حالت بیان کیا ہے کہ اطراف میں کون سی سلطنت قائم تھی۔۔۔۔اور تہذیب یافتہ قوم کون سی تھی، یعنی قیصر وکسری کا تذکرہ کیا ہے۔۔۔اور اس میں کسری کا تذکرہ کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ایران اس وقت تہذیب یافتہ قوم سمجھی جاتی تھی، اور چونکہ عرب اس وقت جہالت میں تھے، اور عرب کو جاہل ہی سمجھا جاتا تھا، غیر مہذب قوم تھی، اور جب ایران سے ان کے تعلقات وتجارت ہوئی، اور پھر رسول اللہ کی وفات کے بعد جب صحابہ کرام نے ایران فتح کیا تو ظاہر ہے جب کبھی ایسی دو قومیں جن میں سے ایک تمدن وشائستگی میں بہت زیادہ ترقی یافتہ ہو اور دوسری نسبتاً جاہل ہو، آپس میں مل جاتی ہیں تو ترقی یافتہ قوم دوسری قوم پر ہمیشہ بہت بڑا اثر ڈالتی ہے۔تمام تاریخ اس حقیقت سے معمور ہے۔۔۔۔مصنفین کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے، ایرانی قوم بہت ہی قدیم زمانہ سے نہایت ترقی یافتہ اور شائستہ تھی۔بس یہ قدرتی امر تھا کہ عربوں پر اس قوم کا بہت اثر پڑتا۔۔۔۔عرب مورخین، قرآن کے بیانات اور مفسرین قرآن کی تحریروں سے ظاہوتا ہے کہ ایران کے رومانی قصص اور عجمی شعر شاعری نے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں عربوں میں بہت کچھ دلعزیزی حاصل کر لی تھی۔۔۔۔قریش میں یہ ایرانی قصے اس قدر زیادہ مشہور تھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مخالفین نے ان پر یہ الزام لگایا کہ انہوں نے قرآن میں ایرانی قصص سے مواد لیا ہے یا نقل اتاری ہے، مثلاً ابن ہشام نے بیان کیا ہے کہ: ''ایک روز محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لوگوں کو جمع کیا اور انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف بلایا۔انہیں قرآن پڑھ کر

سنایا اور ڈرایا کہ جو قومیں ایمان نہ لائیں گی ان کا کیا حشر ہوگا۔اس وقت نضر بن حارث جو محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ساتھ مجمع میں گیا تھا، اٹھا اور اس نے رستم وستان، اسفندیار اور شاہان ایران کے قصے سنائے اور پھر یوں کہا کہ ''قسم خدا کی محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم مجھ سے اچھا داستان گو نہیں ہے اور اس کی تقریر میں اساطیر الاولین کے سوا کچھ نہیں ہے۔جس طرح میں نے یہ قصے بنا کر سنائے ہیں اسی طرح محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے بھی بنائے ہیں''۔

یعنی مصنف کا مقصد یہی ہے کہ اسلام پر ایرانیوں کے تہذیب وتمدن ونظریات کا اثر ہے، اور اس کی نظیر میں نضر بن حارث کا واقعہ پیش کرنا ہی بے محل بے جا استدلال ہے، کیونکہ نضر بن حارث عجمی قصے خاص کر رستم وغیرہ کے قصص بیان کرتے جب کہ رسول اللہ پہلی امتوں کے تذکرہ کرتے جس پر نضر بن حارث جیسے لوگوں نے کہا یہ تو پرانے لوگوں کے قصے بیان کرتا ہے جب کہ میں تمہیں بادشاہوں اور ملوک کا قصہ سناتا ہوں۔اور اس بارے میں قرآن مجید کے مختلف آیات نازل ہوئے۔اگر رسول اللہ کو ان بادشاہوں اور ملوک کا قصہ معلوم ہوتا تو وہ مخالفین کی رو سے ضرور قرآن میں بیان ہونا چاہیے تھا، حالانکہ ایسا نہیں ہے۔اسی لئے تو نضر بن حارث نے کہا تھا محمد تمہیں پرانے زمانے کے قصے سناتا ہے جبکہ میں تمہیں فارس کے بادشاہوں وملوک کا قصہ سناتا ہوں، وہ پرانے ہوچکے ہیں یہ نئی کہانیاں ہیں۔

یہ بات تو درست ہے کہ تہذیب یافتہ قوم اپنی اثر چھوڑ دیتی ہے، مگر اس کا تعلق رسول اللہ اور قرآن سے کہا؟ کیا رسول اللہ نے کبھی عجمی کتب پڑھی ہے؟ ثابت ہی نہیں تو پھر یہ دعویٰ کیونکر درست ہوسکتا ہے۔رسول اللہ کی امی ہونے کا سب سے بڑی حکمت یہی ہے کہ بعد میں مخالفین کہیں گے یہ تو فلاں مذہب سے باتیں سیکھیں ہے فلاں مذہب سے کچھ لیا ہے، رسول اللہ کا امی ہونا ان سب باتوں پر پانی پھیر دیتا ہے۔

اور پھر اثر کیسے چھوڑتی جب رسول اللہ نے نیا تہذیب وتمدن اور فطرت انسان پیش کیا تو

تمام تہذیب اس کے مقابل مردود و معدوم ہوئے۔ کوئی ثابت ہی نہیں کرسکتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے بعد جنہوں نے آپ پر ایمان لایا تو وہ دیگر قوموں کی تہذیب سے متاثر ہوئے یا اسے اپنایا ہو۔ رسول اللہ نے جو تہذیب و شائستگی پیش کیا اس کے بعد مسلمان اسی پر عمل پیرا ہوئے، قیصر و کسریٰ کے تختہ الٹنے کے بعد بھی مسلمانوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریق عمل کو نہیں چھوڑا۔ اس کی ایک مثال آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں، جو اگرچہ صحت کے اعتبار سے ضعیف ہے، لیکن بطور مثال اسے پیش کرتا ہوں، اس سے ہمارا مقصد حاصل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ سنن ابن ماجہ میں روایت موجود ہے کہ:

> ''حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ کھانا کھا رہے تھے کہ اتنے میں ان (کے ہاتھ) سے ایک لقمہ گر گیا۔ انہوں نے اسے اٹھایا اور اسے جو گرد و غبار وغیرہ لگ گیا تھا، اسے دور کیا، پھر وہ لقمہ کھا لیا۔ زمینداروں نے ایک دوسرے کو اشارے کیے (کہ دیکھیں یہ کیا کر رہے ہیں۔) انہیں کہا گیا: اللہ تعالیٰ گورنر صاحب (آپ) کو درست رکھے، آپ کے لقمہ اٹھانے کی وجہ سے زمیندار ایک دوسرے کو اشارے کرتے ہیں جب کہ آپ کے سامنے یہ کھانا موجود ہے (پھر گرا ہوا لقمہ نہ اٹھاتے تو کیا حرج تھا، خواہ مخواہ ان لوگوں کے مذاق کا نشانہ بنے۔) انہوں نے فرمایا: میں ان عجمیوں کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنی ہوئی حدیث پر عمل کرنا ترک نہیں کرسکتا۔ ہم تو، جب کسی کا لقمہ گر پڑتا تھا، اسے حکم دیا کرتے تھے کہ اسے اٹھا کر اس پر لگی ہوئی چیز (تنکا، غبار وغیرہ) دور کرے اور اسے کھا لے، اور اسے شیطان کے لیے نہ رہنے دے۔''
>
> (سنن ابن ماجہ، باب ہاتھ سے لقمہ گر جائے تو کیا کرے)

یہ ہے ہماری تہذیب، بتاؤ اس تہذیب کو کہا سے لیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ سینکڑوں ایسی مثالیں پیش کیا جا سکتا ہے جو رسول اللہ نے ایسی تہذیب کا نمونہ پیش کیا جو عین فطرت انسان ہے اس دور کے تہذیب و تمدن کے پرخچے اڑا دیئے اور دنیا نے دیکھا اور تسلیم کی کہ اصل تہذیب

اگر عین فطرت سلیمہ کے مطابق ہے تو وہ فقط وہی ہے جو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے پیش کیا۔

معراج مصطفیٰ:

معراج پر مصنف نے انتہائی تفصیل سے کلام کیا ہے مگر پھر بھی اپنے اصل مدعا کو ثابت کرنے میں ناکام ہے۔

معراج کا واقعہ کتب احادیث میں تفصیلا موجود ہے، یہاں ذکر کرنا باعث تطویل ہے۔اس لئے ہم صرف اتنا کہنا چاہتے ہیں کہ مصنف کا دعویٰ ماخذ کا ہے مگر پوری بحث میں انہوں نے ایسا واقعہ پیش نہیں کیا جس سے ماخذ ثابت ہورہا ہو۔

سردست اتنا کہوں گا کہ جس کتاب یعنی ''ارداویراف نامک'' (Arta Viraf Namak) سے واقعات پیش کیا ہیں، بقول مصنف یہ کتاب محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے تقریباً چارسو برس قبل زبان پہلوی میں بعہد اردشیر بابکان شاہ ایران لکھی گی تھی۔ جب چارسو برس قبل لکھی گئی تھی تو کیا ثبوت ہے اس کا کہ رسول اللہ کے دور میں یہ موجود تھی یا نہیں؟ اور عربی میں اس کا ترجمہ ہوا تھا یا نہیں۔آپ اندازہ لگائیں انجیل جو نصاری کے ہاں ایک مقدس کتاب ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور میں نصاری موجود بھی ہیں، اس کا ترجمہ بقول مصنف رسول اللہ کے دور میں موجود نہیں تھا، تو پھر یہ کتاب جو پہلوی زبان میں اردشیر بابکان کے عہد میں، اور رسول اللہ سے چارسو برس قبل لکھی گئی تھی کہا موجود ہوگا، اس لئے پہلے یہ ثابت کرو کہ یہ کتاب موجود بھی تھی یا نہیں۔ اس کے بعد یہ ثابت کرنا ہے کہ رسول اللہ نے براہ راست اس کتاب سے استفادہ کیا ہے یا بالواسطہ، اگر بالواسطہ کیا ہے تو وہ واسطہ کون ہے۔استفادہ کا طریقہ کار کیا تھا۔

دوسری بات بالفرض والمحال یہ ثابت ہو جائے کہ رسول اللہ نے براہ راست کتاب سے استفادہ کیا تھا، اور وہاں سے یہ واقعہ لیا ہے تب بھی مصنف کا مدعا ثابت نہیں ہوتا، کیونکہ معراج کا واقعہ اور مصنف کا پیش کردہ واقعات میں زمین وآسمان کا فرق ہیں، معراج کا واقعہ ایک اہم

اور تسلسل اور اچھے انداز میں شروع سے آخر تک بیان ہوا ہے، جبکہ دیگر کتب جس کا مصنف نے حوالہ دیا ہیں ایسا نہیں ہے، آدھا واقعہ کسی اور کتاب سے پیش کیا ہے دوسرا کسی اور سے۔ اور پھر وہ بھی معراج کے واقعہ سے ملتے جلتے نہیں ہیں، اس لئے ان سے ہرگز مصنف کا مدعا ثابت نہیں ہوتا، بلکہ خواہ مخواہ اتنے صفحات سیاہ کئے ہیں۔

چار واقعات کا اجمالی جواب:

بعد از اں مصنف نے مسلسل چار واقعات پیش کر کے حسب معمول وہی طریقہ اپنایا ہے جو اس سے ماقبل تھا، جن کا جواب اصولی طور پر دیا جا چکا ہے، مزید یہاں ہم اجمالا جواب دیں گے۔ سب سے پہلے مصنف کے پیش کردہ واقعات اور جن کتب سے بطور ماخذ واقعہ پیش کیا ہے مختصرا ملاحظہ کیجئے:

''پہلا واقعہ: جنت میں حوروں کے واقعہ قرآن مجید میں مذکور ہے، اس پر مصنف نے بطور ماخذ کچھ واقعات پیش کر کے دعویٰ کیا ہے کہ یہ صفات و واقعہ پارسیوں زرتشت سے لیا گیا ہے۔۔۔۔۔ دوسرا: شیطان کا نام بعض روایات میں (قطع نظر صحت روایات کے کہ وہ صحیح ہے یا نہیں) عزازیل آیا ہے، اس پر مصنف نے ''عرائس المجالس'' سے واقعہ پیش کرنے کے بعد بطور ماخذ جو واقعہ ذکر کیا ہے وہ مجوسیوں کی کتاب ''بندہ ہشینہ'' سے پیش کیا ہے۔۔۔۔ تیسرا: نور محمد کے حوالے سے، یعنی رسول اللہ کے نور کے بارے میں جو روایات میں ذکر ہے کہ ''جب آدم کو پیدا کیا گیا تو اللہ تعالیٰ نے وہ نور اس کی پیشانی میں رکھا اور فرمایا ''اے آدم یہ نور جو میں نے تیری پیشانی میں رکھا ہے، یہ تیرے شرف اور افضل بیٹے کا نور ہے۔ اور یہ ان تمام انبیا کے جو زمین پر مبعوث کئے جائیں گے، سردار کا نور ہے'' اس بارے میں جو واقعہ نقل کیا ہے وہ پہلوی زبان کی کتاب ''مینوخرد'' ہے، اور اس کے ساتھ پارسیوں کے مذہبی کتاب ''اوستا'' سے بھی پیش کیا ہے۔۔۔۔ چوتھا: پل صراط کے بارے

میں جس کا ذکر احادیث میں موجود ہے، اس پر ایک ''اوستا'' اور دوسرا ''دینکارت'' سے اقتباسات پیش کر کے ثابت کرنے کی کوشش کیا ہے کہ یہ بھی انہیں سے ماخذ ہے۔''

اولاً ان سے ماخذ ثابت ہی نہیں، کیونکہ جو واقعات پیش کیا ہیں وہ قرآن کے مضامین سے بالکل مختلف ہے۔ محض خیال و وہم کی بنیاد پر مصنف ان کو کہتا ہے ممکن ہے یہ فلاں کتاب اور فلاں جگہ سے لیا ہو، حالانکہ ٹھوس شواہد خود مصنف کے پاس بھی نہیں محض اپنے خیال کے مطابق گفتگو کرتا ہے۔

ثانیاً جن کتابوں سے مصنف نے بطور ماخذ واقعات پیش کیا ہیں ان کے بارے میں مصنف کہتا ہے کہ یہ کتب رسول اللہ کے دور سے تقریبا چار صدی قبل لکھی گئی ہے، تو اس بارے میں وہ شواہد پیش کیا جائے جس میں اس کا ثبوت موجود ہو۔ اور وہ کتب کیا مکہ و مدینہ میں موجود تھے .اگر موجود تھے تو کیا اصل زبان میں تھے یا مترجم۔ اگر مترجم تھے کیا ثبوت ہے، اور اگر اصل زبان میں موجود تھے تو کیا رسول اللہ نے براہ راست ان سے استفادہ کیا یا بالواسطہ۔ اگر براہ راست کیا تو کیا ثبوت ہے اور اگر بالواسطہ کیا تو وہ واسطہ کون ہے کس کے ذریعہ استفادہ کیا۔ ان سوالات کے جوابات میں، ہمارا جواب پوشیدہ ہے۔

دیگر ایرانی خیالات:

آخر میں موصوف دو باتوں کو پیش کر کے اس باب کو ختم کرتا ہے، پہلا یہ کہ مسلمان کہتے ہیں نبی اپنے مابعد نبی کی پیشگوئی کرتا ہے، اسی لئے تورات و انجیل و زبور میں رسول اللہ کی پیشگوئی موجود ہے، حالانکہ بائبل میں ایسا کچھ نہیں یہ خیال زرتشتیوں سے لیا گیا ہیں، چنانچہ لکھتے ہیں کہ:

''مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ نبی نے قبل از وفات اپنے بعد آنے والے نبی کی نسبت پیش گوئی کر دی تھی۔ بائبل سے تو اس عقیدہ کی تائید کہیں نہیں ہوتی۔ بائبل میں آئندہ آنے والے مسیحا کی نسبت پیش گوئیاں ضرور ہیں مگر ان میں ایسی کوئی بات نہیں جن سے یہ اسلامی

عقیدہ ماخوذ ہو سکے۔مسلمانوں کا یہ عقیدہ غالباً زردشتیوں کی کتاب ''دساتیر آسمانی'' سے لیا گیا ہے۔ یہ کتاب بہت ہی قدیم بتائی جاتی ہے اور زمانۂ حال کے بہت سے پارسیوں کا یہ عقیدہ ہے کہ یہ کتاب ''اہل بہشت کی زبان میں لکھی گئی تھی''۔کتاب کے اصلی متن کے بین السطور قدیم فارسی زبان دری ترجمہ دیا گیا اور یہ کتاب ملّا فیروز ساکن بمبئی کے زیرادارت شائع ہوئی ہے۔کتاب مذکور پندرہ رسالوں کا مجموعہ ہے جن کی نسبت یہ خیال ہے کہ وہ بذریعہ الہام پندرہ رسولوں پر یکے بعد دیگرے نازل ہوئے تھے۔سب سے پہلے رسول کا نام''مہ آباد '' (Mahabad)اور سب سے آخری رسول کا نام''ساسان'' (Sasan)لکھا ہے۔ یہ غالباً وہی ساسان ہے جس سے ایران کے ساسانی بادشاہوں کے خاندان کا سلسلہ جاری ہوا تھا۔دری زبان کا جو ترجمہ کتاب مذکور میں بین السطور دیا گیا ہے،وہ خسرو پرویز شاہ ایران (۵۹۰ء۔۵۹۵ء) کے وقت کا بتایا جاتا ہے۔اس کے معنی یہ ہیں کہ اصل کتاب بہت زیادہ پرانی ہے۔کتاب کے اول چودہ رسالوں میں خاتمہ کے قریب ایسی عبارت درج ہے جس سے یہ ظاہوتا ہے کہ یہ آئندہ آنے والے رسول کی نسبت پیش گوئی ہے۔اس کا مقصد صاف ظاہے۔ بہت سے پارسیوں کے نزدیک یہ کتاب معتبر نہیں ہے مگر مسلمان اس ''آیندہ آنے والے نبی'' کے خیال سے اس قدر خوش ہوئے کہ انہوں نے اسے اپنے معمولی عقائد میں داخل کرلیا۔دوسری بات قابل غور اس کتاب میں یہ ہے کہ صحیفہ کی دوسری آیت یوں درج ہے:''بنام ایزد۔بخشا نیدہ بخشا یشگر ، مبان،دادگر''۔ان الفاظ سے صاف ظاہوتا ہے کہ ان کا قرآن کے الفاظ ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' سے کس قدرگ تعلق ہے۔انہی الفاظ یعنی''بسم اللہ'' سے قرآن کی سورۃ سوائے سورۃ ۹ کے شروع ہوتی ہے۔صاف ظاہے کہ یہ الفاظ قرآن میں پارسیوں کی کتاب سے داخل ہوئے ، پارسیوں کی کتاب میں قرآن سے نہیں لیے گئے۔پارسیوں کی کتاب''بندہ ہش نیہ''میں اسی قسم کی عبارت ہے یعنی''بنام یزداں آفریدگار''۔''

پہلی بات ہم کہتے ہیں کہ نبی اپنے مابعد نبی کے بارے میں پیشگوئی کرتا ہے یہ قاعدہ کلیہ

نہیں ہے کہ نبی ایسا کرے،اور نہ قاعدہ جز ئیہ ہے، بلکہ خصوصا بعض نبی ایسے تھے جنہوں نے اپنے مابعد نبی کی پیشگوئی کی ہے، جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے رسول اللہ کے بارے میں پیشگوئی کی ہے، اور حضرت عیسی علیہ السلام کے بارے میں، اور حضرت عیسی علیہ السلام نے رسول اللہ کے بارے میں پیشگوئی کی ہے۔اور یہ بھی یادرکھنا چاہیے کہ نبی اپنے مابعد نبی کے بارے میں پیشگوئی کرتا،مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ہر نبی نے پیشگوئی کی ہے ، کیونکہ ہر نبی خاص زمانے اور خاص قوم کے کے نبی ہوتا اور اس کے بعد دوسرے نبی نے آنا تھا، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ کسی خاص قوم اور خاص زمانے اور خاص مکان کے لئے نبی نہیں تھا بلکہ تمام اقوام و عالم جہاں کے لئے وہ نبی تھا اس لئے جتنی بڑی شان ہے آپ کی تو ظاہر ہے استقبال کے ساتھ ساتھ پیشگوئی بھی عظیم ہونا چاہیے، تاکہ مکمل طور پر عالم جہاں پر اتمام حجت ہو۔اور کسی قسم کا شک وشبہ نہ رہے۔یہی وجہ ہے باقی انبیاء کے معجزات ان کے زمانے اور وقت کے ساتھ خاص تھے،مگر رسول اللہ کا معجزہ تا قیامت رہے گی، اور یہ بات مخالفین یادرکھے، اور لکھ کر اپنے پاس محفوظ رکھے کہ تم لاکھ دفعہ رسول اللہ کی پیشگوئیاں اور صفات اپنی کتب میں چھپاؤ اور تبدیلیاں کرتے رہو، مگر اللہ کو یہ ظاہر کرنا ہی ہے، اور تمہاری نسل سے لوگ آکر اس کی گواہی دے رہے ہیں اور دیں گے کہ واقعی بائبل میں رسول اللہ کی صفات مذکور ہیں جو ہمارے بڑوں نے محض زدوعناد کی بنیاد پر انہوں نے تبدیلی کی، مگر آج بھی جو لوگ محض حق کو پہچاننے کی غرض سے یہ حقیقت تلاش کرنے لگتے ہیں تو ان کو صاف نظر آتا ہے اور وہ رسول اللہ کی نبوت اور نبی ہونا تسلیم کرتے ہیں۔

دوسری بات مصنف نے جس کتاب کا ذکر کیا ہے اور اس کے بارے میں دعویٰ کر رہا ہے کہ وہ انتہائی قدیم ہے، یہ ان کی کم علمی دراصل یہ کتاب دراصل آذر کیوان یا ان کے کسی مرید نے دسویں یا گیارہویں صدی میں لکھی ہے اور یہ مختلف مذاہب کے عناصر یعنی اخذ شدہ ہیں، ہر

مذہب سے باتیں لے کر اس کو جمع کیا گیا ہے۔ جیسے مصنف نے ذکر کیا ہے کہ ہر صحیفہ کے ابتداء ''بنام ایزد بخشائندہ بخشایشگر ، مہربان دادگر''۔ سے کیا ہے جو قرآن کے ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم '' سے ملتا جلتا ہیں۔ دراصل انہوں نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا ترجمہ ہی قرآن سے لیا ہے اور فارسی میں اس کا ترجمہ کیا ہے ، جیسے خود اس کتاب میں ''بنام ایزد بخشا نیدہ بخشا یشگر مہربان دادگر''۔ پر حاشیہ لگا ہے اور نیچے ترجمہ ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' سے کیا گیا ہے۔ نا صرف یہ بلکہ تعوّذ کا ترجمہ بھی انہوں نے قرآن سے لیا ہے، ہر تذکرہ کے ابتداء میں بسم اللہ کا ترجمہ کرنے سے پہلے تعوذ کو ذکر کرتا ہے، چنانچہ لکھتے ہیں کہ:

''پناہیم بہ یزداں از منش وخوی بد وزشت گمراہ کنندہ ی بہ راہ ناخوب برندہ ی رنج دہندہ یہ آزار رسانندہ''

(دساتیر آسمانی صفحہ 15 ناشر شبنم 1400ھ)

اس کا ترجمہ حاشیہ میں ''اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم'' سے کیا گیا ہے۔ تو یہ بھی قرآن سے لیا ہے۔ لہذا یہ کہنا کہ یہ قدیم کتاب ہے، غلط ہے بلکہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے 9 یا 10 صدی بعد لکھی گئی ہے۔

دوسری بات مصنف نے یہ کی ہے کہ رسول اللہ کبھی کبھار فارسیوں سے ایک دو لفظ بولتے تھے، اور سلمان فارسی بھی چونکہ فارس کا رہنے والا تھا، اور وہ تعلیم یافتہ تھا اور کفار نے بھی سمجھ لیا تھا کہ یہ سلمان فارسی سے کچھ سیکھتا ہے جس کا ذکر قرآن مجید کی آیت '' وَلَقَدْ نَعْلَمُ أَنَّهُمْ يَقُولُونَ إِنَّمَا يُعَلِّمُهُ بَشَرٌ لِّسَانُ الَّذِي يُلْحِدُونَ إِلَيْهِ أَعْجَمِيٌّ وَهَٰذَا لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُّبِينٌ ''، میں ہے، اور اس میں اسی طرف اشارہ ہے۔

سلمان فارسی اور اس آیت کا جواب ماقبل گزر چکا ہے۔ رہی بات فارسی میں کچھ بولنے کی تو ایک دو لفظ بولنے سے کیا زبان آجائے گی؟ اگر یہی معیار ہے تو پھر ہر دوسرا شخص دنیا میں جتنی

زبانیں ہیں سب کو جاننے والا شمار ہوگا، کیونکہ ہر شخص دوسری زبان کے کچھ الفاظ نہیں بلکہ زیادہ جانتا ہے، تو کیا آپ اسے یہ کہیں گے کہ یہ بندہ ہر زبان سے واقف ہے۔ ممکن ہے مصنف اور اس کے کوئی ہمنواء اس کو تسلیم کرے۔ مگر سخن شناس کے ہاں اس کی اہمیت نہیں۔

فصل ہفتم: باب ششم کا محاسبہ

فرقۂ حنیف اور اس کا اثر ابتدائی اسلام پر:

اس عنوان کے تحت مصنف نے دین حنیف پر گفتگو کی ہے، اور دور جہالت میں جن لوگوں نے عرب رسوم سے بیزار ہو کر الگ دین حنیف کو تلاش کرنے اور اس پر عمل کرنے کی کوشش کئے تھے، ان کے بارے میں تفصیل پیش کی ہے، بعد ازاں ان میں سے زید بن عمر بن نفیل کے بارے میں یہی تاثر دینے کی کوشش کیا ہے کہ رسول اللہ نے ان سے بہت کچھ سیکھا ہے، اور انہیں کے تلاش کردہ عقائد کو دین میں داخل کیا ہے۔ اس سلسلہ میں اس کا مختصر جائزہ لیتے ہیں۔

رسول اللہ کے بعثت سے پہلے جسے دور جاہلیت کہا جاتا ہے، جس میں اچھے اور برے کی تمیز نہیں تھی، مکہ کے لوگ جو صدیوں سے دین ابراہیم پر عمل پیرا تھے، اس کا نقشہ مٹ چکا تھا، اور اس میں ایسی خرافات کو داخل کیا گیا تھا جس سے دین ابراہیم علیہ السلام کا کچھ تعلق ہی نہیں تھا۔ اور اس کا آغاز بت پرستی سے ہوا، اور یہ عمرو بن عامر بن لُحیّ الخزاعی کے دور سے شروع ہوا، یہ شخص مکہ سے شام گیا اور وہاں دیکھا کہ لوگ بتوں کو پوجتے ہیں، اور اس کو یہ پسند آئی چنانچہ اس نے ایک بت یا کچھ بے وہاں سے حاصل کر کے مکہ میں نصب کئے اور لوگوں کو اس کی تعظیم اور پرستش کا حکم دیا۔ اور بعض لوگ بت پرستی کے آغاز کو تدریجاً کہتے ہیں کہ اس کا آغاز اس طرح ہوا کہ قریش اگر کہیں سفر کا ارادہ کرتے تو حرم کی پتھر تعظیما اپنے ساتھ لیتے، اور پھر جو پتھر ان کو پسند آتا اس کی تعظیم اور زیادہ کرنے لگتے، یہ نسل تو ایسا ہی گزر گیا آنے والے نسلوں نے اس کی پرستش کرنے لگے، مگر عہد ابراہیم کے کچھ اعمال اور روایات ان میں باقی رہے۔

عمرو بن عامر بن لُحیّ کے بارے میں بخاری شریف باب خزاعہ کے بیان میں، روایت موجود ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''رَأَيْتُ عَمْرَو بْنَ عَامِرِ بْنِ لُحَيٍّ الْخُزَاعِيَّ يَجُرُّ قُصْبَهُ فِي النَّارِ وَكَانَ أَوَّلَ مَنْ سَيَّبَ السَّوَائِبَ''

''میں نے عمرو بن عامر بن لحی خزاعی کو دیکھا کہ جہنم میں وہ اپنی انتڑیاں گھسیٹ رہا تھا اور یہی عمرو وہ پہلا شخص ہے جس نے سائبہ کی رسم نکالی۔''

سائبہ اس اونٹنی کو کہتے ہیں جس کو وہ اپنے معبودوں کے لیے چھوڑ دیتے اور ان پر کوئی بوجھ نہ لادتا اور نہ کوئی سواری کرتا۔

جب مکہ میں بت پرستی عام ہوئی، اور اس کے علاوہ کئی طرح کے خرافات ان میں داخل ہوئے، زمانہ بدتر سے بدتر ہوتا گیا، اس صورت میں ظاہر ہے انسان کے ذہن وطبیعت میں لازمی یہ بات آجاتی ہے کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ یہ پتھر کے بت کیسے ہمیں سنتے ہیں اور ہمارے لئے کیا کر سکتے ہیں، جبکہ یہ بے جان شئی ہے، اور اس کے علاوہ وہ اپنے اعمال پر سوچتے کہ یہ عمل فطرت کے خلاف کیوں ہے، یہ سب دیکھنے کے بعد بھی کسی میں اتنی جرأت نہیں ہوتی کہ وہ سوال کرے یا دوسرا راہ اختیار کرے۔اور جو کرتے بھی وہ چھپ کر کرتے۔

مگر رسول اللہ کے بعثت سے قبل کچھ لوگوں نے اعلانیہ بے پرستی سے بیزاری اختیار کی اور سچے دین کے تلاش شروع کی، ان میں مختلف قبائل کے لوگ تھے، مگر ابن اسحاق و ہشام نے ان میں چار مشہور نام ذکر کئے ہیں:

(1) ورقہ بن نوفل اسدی قریشی، (2) عبیداللہ بن جحش اسدی خزیمی، (3) عثمان بن حویرث اسدی قریشی، (4) زید بن عمرو بن نفیل عدوی قریشی۔

ان چاروں نے باتفاق رائے دین حنیف (ابراہیمی) کو تلاش کرنے کا عزم کیا، چنانچہ ابن ہشام نے نقل کیا ہے کہ قریش اپنی بتوں میں سے کسی ایک بت کے پاس اپنی عید منانے کے لئے جمع ہوتے، اور اس کی تعظیم کرتے اور اس کے لئے جانور ذبح کرتے اور اس کے سجدے و

طواف کرتے ، ہر سال اس عید کے لئے مخصوص و معلوم تھا، قریش میں چار افراد اس عمل سے بیزاری اختیار کر کے کہا ہم صحیح دین ابراہیمی کا تلاش کریں گے۔

کیونکہ وہ جانتے تھے دین ابراہیم میں ایسا کچھ نہیں تھا۔ اور وہ باہم مشورہ کیا کہ کسی دوسرے کو خبر نہیں دیں گے، چنانچہ اسی پر اتفاق ہوا۔

اور کچھ مدت تک یہ لوگ دین ابراہیمی (حنیفیت) پر قائم رہے، مگر کچھ وقت بعد اول الذکر تینوں نصرانی بن گئے، صرف مؤخر الذکر زید بن عمرو بن نفیل دین حنیف پر قائم رہے۔

حنیف کا معنی:

حنیف کا معنی مولانا عبدالحمید سواتی رحمہ اللہ یوں کرتے ہیں کہ:

''حنیف عربی زبان میں اس اونٹ کو کہتے ہیں جس کے پاؤں میں کجی ہو اور وہ چلتے وقت ایک طرف کو مائل ہو جاتا ہو، اس کو احنف بھی کہتے ہیں لفظ حنیف اسی مادے سے ہے اور اس کا معنی ہے ہر طرف سے کٹ کر ایک طرف لگنے والا یعنی یکسو اور اصطلاحا حنیف اس شخص کو کہتے ہیں جو ہر طرف سے کٹ کر صرف اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے والا ہو (آیت) "حنفآء للہ غیر مشرکین بہ"۔ حضرت ابراہیمؑ کے متعلق بھی یہی آتا ہے (آیت) "وما کان من المشرکین"۔ آپ شرک کرنے والوں میں نہ تھے۔''

(معالم العرفان، تفسیر سورۃ البقرہ آیت 135)

یعنی حنیف انحراف کو کہتے ہیں، جو ہر طرف سے رخ پھیر کر خاص اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے والا ہو، اور مکہ میں جن چار لوگوں نے کہا تھا کہ اصل دین ابراہیم یہ نہیں ہے، کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں بھی یہی آتا ہے کہ انہوں نے دین کو خالص اللہ کے لئے کیا تھا اور بتوں سے بیزاری اختیار کیا تھا، گو یا وہ حنیف تھے، اور مشرکین میں سے نہیں تھے، اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراتے جیسے مشرکین مکہ نے کہا۔ اسی لئے ان چار کو بھی حنیفہ سے

موسوم کیا گیا، جودراصل حضرت ابراہیم علیہ السلام کی صفت ہے۔

زید بن عمرو بن نفیل:

یہاں چونکہ موضوع سخن زید بن عمرو ہی ہے اور مصنف نے اعتراض بھی انہیں سے متعلق کیا ہے، اس لئے اولاً ہم زید بن عمرو کے بارے میں کچھ معروضات پیش کریں گے، بعد ازاں مصنف کے اعتراض کا جائزہ لیں گے۔

بخاری شریف میں زید بن عمرو کے بارے میں امام بخاری نے ایک باب باندھا ہے، جس میں زید بن عمرو کا بیان ہے۔

علامہ بدر الدین عینی رحمہ اللہ (855ھ) اس باب کے تحت زید بن عمرو بن نفیل کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

”زید بن عمرو بن نفیل بن عبدالعزی بن رباح بن عبداللہ بن قرط بن رزاح بن عدی بن کعب بن لوئی بن غالب بن فھر العدوی، یہ سعید کے والد ہے جوعشرہ مبشرہ میں سے ہے۔ اور حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے بھتیجا ہے، اس لئے حضرت عمر کے والد خطاب وہ بیٹا ہے نفیل کا اور وہ عبدالعزی کا بیٹا ہے، اور زید کے والد عمرو وہ خطاب کے بھائی ہے، پس اس صورت میں زید حضرت عمر رضہ اللہ عنہ کے بھتیجا ہوگا، زید توحید کے تلاش کرنے میں بتوں سے علیحدگی اختیار کی، اور شرک سے دور رہوا لیکن رسول اللہ کی نبوت سے پہلے انتقال کر گئے، حضرت سعید بن مسیب فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہونے سے پانچ سال قبل قریش کعبہ کی تعمیر کر رہے تھے تو آپ کا انتقال ہو گیا۔ زکریا السعدی کے مطابق جب ان کا انتقال ہوا تو انہیں حرا کے مقام پر دفن کیا گیا۔ اور ابن اسحاق کے نزدیک جب وہ لحم کی سرزمین کے وسط میں پہنچا تو دشمن نے اس پر حملہ کر کے اسے قتل کر دیا۔ اور زبیر سے روایت ہے کہ ہمیں یہ بات پہنچی کہ زید شام میں تھے، جب

انہوں نے ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کے جانے کی خبر سنی تو آنے کا ارادہ کیا، لیکن اہل میفعہ نے انہیں قتل کر دیا۔ البکری کہتا ہے کہ یہ شام کے علاقے بلقع کا ایک گاؤں ہے۔ کہا جاتا ہے: زید حیرہ میں رہتا تھا اور چھپ کر مکہ میں داخل ہوتا تھا، پھر وہ شام میں دین کے بارے میں پوچھتا تھا، عیسائیوں نے اس میں تفرقہ ڈال دیا اور وہ مر گیا۔ اگر آپ کہیں (یا کوئی سوال کرے) کہ دین کے بارے میں اس کا کیا حکم ہے؟ تو میں کہتا ہوں کہ ذہبی نے "تجرید الصحابہ" میں اس کا ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ خود ہی ایک امت کے طور پر اٹھائے جائیں گے۔ اور جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زید بن عمرو بن نفیل کے بارے میں پوچھا گیا کہ وہ زمانہ جاہلیت میں قبلہ کی طرف منہ کر کے کہتے تھے: میرا معبود ابراہیم کا معبود ہے اور میرا دین ابراہیم کا دین ہے، اور سجدہ کرتا تھا۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ میرے اور عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام کے درمیان ایک امت کے طور پر دوبارہ زندہ کیا جائے گا، یہ ابن ابی شیبہ نے روایت کیا ہے۔ محمد بن سعد نے بنوعدی بن کعب کے حلیف عامر بن ربیعہ کی حدیث سے روایت کی ہے، انہوں نے کہا: زید بن عمرو نے مجھ سے کہا: میں نے اپنی قوم کی مخالفت کی اور ابراہیم اور اسماعیل کے دین کی پیروی کی اور جس کی وہ عبادت کرتے تھے، حالانکہ وہ اس قبلہ کی طرف نماز پڑھتے تھے۔ میں بنی اسماعیل میں سے کسی نبی کے بھیجے جانے کا انتظار کر رہا ہوں لیکن مجھے نہیں لگتا کہ میں اس سے ملوں گا اور میں اس پر ایمان لاتا ہوں اور اس کی تصدیق کرتا ہوں اور گواہی دیتا ہوں کہ وہ نبی ہیں۔ اگر آپ کی عمر لمبی ہے تو اسے میرا اسلام کہنا۔ عامر نے کہا: جب میں نے اسلام قبول کیا تو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا واقعہ سنایا۔ تو آپ نے سلام کا جواب دیا، اور اس کے لیے رحمت کی دعا کی اور کہا: میں نے اسے جنت میں اپنے کپڑے گھسیٹتے ہوئے دیکھا۔ البزار اور طبرانی نے سعید بن زید کی حدیث سے روایت کی ہے، جس میں انہوں نے کہا: میں نے اور عمر نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زید کے بارے میں پوچھا، تو آپ نے فرمایا: اللہ ان کی

مغفرت فرمائے اوران پر رحم فرمائے، کیونکہ ان کی وفات ابراہیم علیہ السلام کے دین پر ہوئی تھی۔اور باغندی کہتا ہے ابوسعید اشجع سے منقول ہے،اوروہ روایت کرتے ہیں ابو معاویہ سے، اوروہ ہشام سے، وہ اپنے والد سے، انہوں نے عائشہ رضی اللہ عنہا سے، انہوں نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں جنت میں داخل ہوا تو زید بن عمرو بن نفیل کے دو درخت دیکھے۔ابن کثیر فرماتے ہیں اس کی سند صحیح ہے۔۔۔۔۔اگر آپ پوچھیں (یعنی کوئی سوال کرے کہ) بخاری نے اپنی کتاب میں اس باب کا ذکر کیوں کیا؟ میں کہتا ہوں: اس نے اس سے اشارہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے نبی بنا کر بھیجے جانے سے پہلے ملاقات کی تھی۔''

عمدۃ القاری شرح بخاری جلد/ 16 صفحہ/ 391-392 مطبوعہ بیروت)

اس باب کے تحت جو امام بخاری رحمہ اللہ نے زید بن عمرو کے بارے میں تین روایات نقل کئے ہیں، پہلی روایت یہ ہے:

''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زید بن عمرو بن نفیل رضی اللہ عنہ سے (وادی) بلدح کے نشیبی علاقہ میں ملاقات ہوئی، یہ قصہ نزول وحی سے پہلے کا ہے، پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے ایک دسترخوان بچھایا گیا تو زید بن عمرو بن نفیل نے کھانے سے انکار کر دیا اور جن لوگوں نے دسترخوان بچھایا تھا ان سے کہا کہ اپنے بتوں کے نام پر جو تم ذبیحہ کرتے ہو میں اسے نہیں کھاتا، میں تو بس وہی ذبیحہ کھایا کرتا ہوں جس پر صرف اللہ کا نام لیا گیا ہو، زید بن عمرو قریش پر ان کے ذبیحے کے بارے میں عیب بیان کیا کرتے اور کہتے تھے کہ بکری کو پیدا تو کیا ہے اللہ تعالیٰ نے، اسی نے اس کے لیے آسمان سے پانی برسایا ہے، اسی نے اس کے لیے زمین سے گھاس اگائی، پھر تم لوگ اللہ کے سوا دوسرے (بتوں کے) ناموں پر اسے ذبح کرتے ہو۔زید نے یہ کلمات ان کے ان کاموں پر اعتراض کرتے ہوئے اوران کے اس عمل کو بہت بڑی غلطی قرار دیتے ہوئے

کہے تھے۔''

دوسری روایت:

''ابن عمر رضی اللہ عنھما سے روایت ہے کہ زید بن عمرو بن نفیل شام گئے۔ دین (خالص) کی تلاش میں نکلے، وہاں وہ ایک یہودی عالم سے ملے تو انہوں نے ان کے دین کے بارے میں پوچھا اور کہا ممکن ہے میں تمہارا دین اختیار کرلوں، اس لیے تم مجھے اپنے دین کے متعلق بتاؤ۔ یہودی عالم نے کہا کہ ہمارے دین میں تم اس وقت تک داخل نہیں ہو سکتے جب تک تم اللہ کے غضب کے ایک حصہ کے لیے تیار نہ ہو جاؤ۔ اس پر زید رضی اللہ عنہ نے کہا کہ واہ میں اللہ کے غضب ہی سے بھاگ کر آیا ہوں، پھر خدا کے غضب کو میں اپنے اوپر کبھی نہ لوں گا اور نہ مجھ کو اسے اٹھانے کی طاقت ہے! کیا تم مجھے کسی اور دوسرے دین کا کچھ پتہ بتا سکتے ہو؟ اس عالم نے کہا میں نہیں جانتا (کوئی دین سچا ہو تو دین حنیف ہو)۔ زید رضی اللہ عنہ نے پوچھا دین حنیف کیا ہے؟ اس عالم نے کہا کہ ابراہیم علیہ السلام کا دین جو نہ یہودی تھے اور نہ نصرانی اور وہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہیں کرتے تھے۔ زید وہاں سے چلے آئے اور ایک نصرانی پادری سے ملے، ان سے بھی اپنا خیال بیان کیا اس نے بھی یہی کہا کہ تم ہمارے دین میں آؤ گے تو اللہ تعالیٰ کی لعنت میں سے ایک حصہ لو گے۔ زید رضی اللہ عنہ نے کہا میں اللہ کی لعنت سے ہی بچنے کے لیے تو یہ سب کچھ کر رہا ہوں۔ اللہ کی لعنت اٹھانے کی مجھ میں طاقت نہیں اور نہ میں اس کا یہ غضب کس طرح اٹھا سکتا ہوں! کیا تم میرے لیے اس کے سوا کوئی اور دین بتلا سکتے ہو۔ پادری نے کہا کہ میری نظر میں ہو تو صرف ایک دین حنیف سچا دین ہے زید نے پوچھا دین حنیف کیا ہے؟ کہا کہ وہ دین ابراہیم علیہ السلام ہے جو نہ یہودی تھے اور نہ نصرانی اور اللہ کے سوا وہ کسی کی پوجا نہیں کرتے تھے۔ زید نے جب دین ابراہیم کے بارے میں ان کی یہ رائے سنی تو وہاں سے روانہ ہو گئے اور اس سرزمین سے باہر نکل کر اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھائے اور یہ دعا کی، اے اللہ! میں گواہی دیتا ہوں کہ میں دین ابراہیم پر ہوں۔''

تیسری روایت:

''حضرت اسماء بنت ابوبکر رضی اللہ عنھما سے مروی ہے وہ فرماتی ہے کہ میں نے زید بن عمرو بن نفیل کو کعبہ سے اپنی پیٹھ لگائے ہوئے کھڑے ہو کر یہ کہتے سنا، اے قریش کے لوگو! خدا کی قسم میرے سوا اور کوئی تمہارے یہاں دین ابراہیم پر نہیں ہے اور زید بیٹیوں کو زندہ نہیں گاڑتے تھے اور ایسے شخص سے جو اپنی بیٹی کو مار ڈالنا چاہتا کہتے اس کی جان نہ لے اس کے تمام اخراجات کا ذمہ میں لیتا ہوں، چنانچہ لڑکی کو اپنی پرورش میں رکھ لیتے جب وہ بڑی ہو جاتی تو اس کے باپ سے کہتے اب اگر تم چاہو تو میں تمہاری لڑکی کو تمہارے حوالے کر سکتا ہوں اور اگر تمہاری مرضی ہو تو میں اس کے سب کام پورے کر دوں گا۔''

اختصار کے پیش نظر عربی عبارات نقل کرنے سے گریز کیا۔ مذکورہ روایات واقتباسات سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ زید بن عمرو دین ابراہیم پر تھا، اور توحید کے قائل تھے، بتوں سے بیزاری اختیار کی تھی، نماز پڑھتا تھا، اور بتوں کے نام پر مذبوح جانور نہیں کھاتے تھے، اور بہت سے غلط رسوم سے دور تھے۔ جیسے بیٹیوں کو زندہ درگور کرنا وغیرہ۔ اور رسول اللہ کے زمانہ کو بھی پایا مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلان نبوت سے پانچ سال پہلے انتقال کر گئے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات ان سے ہوئی تھی۔

پہلی روایت میں جو مذکور ہے کہ رسول اللہ کے زمانے دسترخوان بچھایا گیا اور زید نے کھانے سے انکار کیا کہ یہ بتوں کے نام پر ذبح شدہ ہے، اور میں اس سے نہیں کھاتا۔ ممکن ہے کسی کو شبہ ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے کھایا ہوگا، پھر اس کا مطلب یہ ہوگا کہ رسول اللہ قبل نبوت بتوں کے ذبیحہ کھایا۔ حالانکہ ایسا نہیں نہ روایت میں اس طرح مذکور ہے اور نہ اس طرف اشارہ ہے، بلکہ ممکن ہے دسترخوان زید کے لئے بچھایا گیا ہوں، اور چونکہ رسول اللہ بھی اس کے ساتھ تھا اس لئے نام رسول اللہ کا لیا، ورنہ رسول اللہ کا اس سے کھانا ثابت نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ علامہ بدرالدین عینی حنفی رحمہ اللہ نے اس پر تفصیل سے کلام کیا ہے اور ان

شبہات کا جواب دیا ہے، ملاحظہ ہو (عمدۃ القاری جلد 16 صفحہ 393)

سیرت نگاروں میں قدیم اور مقبول سیرت ''السیرۃ النبویۃ'' کے مصنف ابوالملک بن ہشام المعروف ابن ہشام نے بھی زید بن عمرو کا تفصیلاً ذکر کیا ہے، اوران کے اشعار بھی وہاں مذکور ہے، ہم نے بقدر مقصود ان کا تذکرہ کیا، جن سے ہمارا مقصد ثابت ہوتا ہے۔ (ملاحظہ ہو سیرت النبی لابن ہشام جلد/ 1 صفحہ/ 252۔260 مطبوعہ بیروت)

بعدازاں آمدم برسرِ مطلب، اصل مقصود کی جانب آتے ہیں، مصنف نے یہ الزام لگایا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زید بن عمرو سے بھی کچھ استفادہ کیا ہے۔

کیا زید نے رسول اللہ پر اثر چھوڑا تھا:

موصوف رقمطراز ہے کہ:

''زید کے پر اثر قصّہ اور اس کی نظم کی رفیع الخیالی سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر کس قدر اچھا اثر ڈالا ہوگا۔''

چنانچہ مزید لکھتے ہیں کہ:

''کہا جاتا ہے کہ جب محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ۶۱۲ء میں نبوت کا دعویٰ کیا تو اس سے صرف پانچ سال قبل زید کی وفات ہوئی تھی۔ ابن اسحٰق بیان کرتا ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں قریش کی رسم تھی کہ وہ شہر سے نکل کر ایک مہینہ تک کوہ حرا پر رہتے تھے (یعنی ماہ رمضان میں) اور وہ اس طرح ہر سال وہاں توبہ استغفار و عبادت و ریاضت کیا کرتے تھے۔ اسے ''تحنث'' کہتے تھے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ قریش کی اسی رسم کی وجہ سے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بعد میں تمام ماہ رمضان کو مسلمانوں کے لئے خاص طور پر بغرض زہد و عبادت منتخب کیا۔ اور چونکہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں ماہ رمضان موسم گرما میں واقع ہوا تھا، اس لئے متمول لوگوں نے شہر کی تنگ اور گھٹی ہوئی گرم گلیوں سے نکل کر کھلے علاقہ کی تازہ اور صاف ہوا میں جا کر رہنا

زیادہ پسند کیا ہوگا۔ یہ سمجھنے کی کوئی وجہ نہیں کہ ان ایام میں ان لوگوں کی زندگی بہت زیادہ متقیانہ اور پرہیزگارانہ ہوتی تھی۔ بہر حال جیسا کہ صاف طور سے بیان کیا جاتا ہے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر سال ماہ رمضان کے دن رسم کے موافق کوہ حرا پر جا کر بسر کیا کرتے تھے اور وہ درحقیقت اسی غار میں مقیم تھے جس میں زید رہا کرتا تھا، جبکہ ان پر پہلی وحی بذریعہ جبرئیل فرشتہ نازل ہوئی۔ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اس طرح کوہ حرا پر جا کر غار میں رہنے کا مطلب ''ترک دنیا''سمجھنا غلطی ہے کیونکہ قریش کی رسم کے بموجب محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیوی خدیجہ بھی اس وقت ان کے پاس اسی غار میں موجود رہتی تھیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اپنی قوم کی رسم کے مطابق محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر سال جا کر ایک ماہ کے لئے کوہ حرا پر رہتے تھے تو انہیں وہاں زید سے گفتگو کرنے کا بہت کافی موقعہ ملتا ہوگا اور روایت سے صاف ظاہر ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس زید کی کس قدر عزت وتکریم کرتے تھے۔ اور یہ ہم ظاہر کر چکے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے زید کے لئے دعا کرنا منظور کر لیا تھا۔ اور یہ واقعہ بہت زیادہ قابل غور ہے کیونکہ بیضاوی نے سورۂ توبہ کی آیت ۱۱۴ کی تفسیر کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنی ماں آمنہ کے لئے دعا مانگنے سے منع کر دیا گیا تھا۔ حالانکہ وہ اپنی والدہ سے جو اس کے بچپن ہی میں وفات پا چکی تھیں بہت محبت کیا کرتے تھے۔ علاوہ ازیں الواقدی نے بیان کیا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے زید کو سلام کیا ،حالانکہ یہ اعزاز صرف مسلمانوں کے لئے مخصوص ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے زید کے لئے خدا سے دعائے آمرزش کی اور بیان کیا کہ ''میں نے اسے جنت میں دیکھا ہے ،اس کے پیچھے لوگوں کی قطار ہے''۔ بقول اسپرنجر'' محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کھلم کھلا زید کو اپنا پیشرو تسلیم کر لیا تھا اور زید کا ہر لفظ جس کا ہم کو علم حاصل ہے وہ قرآن میں موجود ہے''۔ مثلاً سورۂ آل عمران میں محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ عوام سے کہے ''کیا تم مسلمان ہو گئے ہو؟'' ابن اسحٰق نے بیان کیا ہے کہ یہی الفاظ زید نے لوگوں سے قبل از محمد کہے تھے۔ خاص خاص اصول جو زید نے قائم کیے تھے وہ سب قرآن میں موجود ہیں، مثلاً:

(۱) دختر کشی سے ممانعت (اس زمانہ میں یہ ظالمانہ رسم رائج تھی کہ وہ اپنی شیر خوار بیٹیوں کو زندہ دفن کر دیا کرتے تھے)۔

(۲) توحید باری تعالیٰ کا تسلیم کرنا۔

(۳) بُت پرستی، لات وعزیٰ اور دیگر بُتوں کی پرستش سے منع کرنا۔

(۴) جنت یا فردوس میں آئندہ عیش ومسرت کا وعدہ۔

(۵) گنہگاروں کے لئے جو عذاب دوزخ میں مخصوص ہے اس سے انتباہ۔

(۶) کافروں کو خدا کے قہر وغضب سے ڈرانا۔

(۷) خدا کے لئے الرحمٰن، الرب اور الغفور کے خطابات استعمال کرنا۔

علاوہ ازیں زید اور جملہ دیگر مصلحین عرب، دین ابراہیم کے لئے قرآن میں بھی ''حنیف'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور یہ خطاب زید اور اس کے دوستوں نے پسند کیا تھا۔ جس لفظ سے ''حنیف'' مشتق ہے اس کے معنی عبرانی زبان میں ''چھپانا، دھوکا دینا، جھوٹ بولنا، مکر کرنا'' ہیں اور ایسے ہی معنی اس لفظ کے سریانی زبان میں ہیں۔ عربی میں پہلے اس کے معنی ''لنگڑا کر چلنا'' یا ناہمواری کے ساتھ چلنا'' تھے، مگر چونکہ حنیف لوگوں نے عوام کے بُتوں کی پرستش چھوڑ دی تھی اس لئے بعد میں اس کے معنی ''الحاد وکفر'' ہو گئے۔ اس معنی میں سابق مصلحین عرب کے لئے یہ لفظ طنزاً استعمال کیا جاتا تھا۔ مگر چونکہ ابن ہشام نے لکھا ہے کہ قریش کے لب ولہجہ میں وہ لفظ جس کے معنی ''توبہ استغفار'' اور ''تقویٰ'' کے ہیں اسے ''حینیف'' سے خلط ملط کر دیا گیا۔ اس لئے اپنی بُت پرستی سے تائب ہونے کے باعث حنیف لوگ اس خطاب کو بخوشی قبول کرتے ہوں گے۔ مگر یہ عجیب بات ہے کہ محمد ﷺ نے لفظ حنیف ابراہیم کے لئے استعمال کیا اور لوگوں کو دعوت دی کہ وہ ''دین ابراہیم'' یعنی اسلام قبول کر کے حینیف بن جائیں۔ بہر حال محمد ﷺ نے لفظ ''حنیف'' استعمال کر کے یہ بات صاف طور پر ظاہر کر دی کہ وہ سابق مصلحین عرب کے اصول پر چل رہے تھے اور جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ انہوں نے حنیف لوگوں کی تعلیمات قبول کر کے ان کو قرآن میں

بھی داخل کرلیا تو ہم بلا پس و پیش کہہ سکتے ہیں کہ قرآن کے ماخذ میں حنیف لوگوں کے اصول بھی شامل ہیں۔''

پہلی بات: جس روایت کی بنیاد پر مصنف نے کہا ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں قریش کی رسم تھی کہ وہ شہر سے نکل کر ایک مہینہ تک کوہ حرا پر رہتے تھے۔اور پھر بریکٹ میں اپنی طرف سے ماہ رمضان کا قید لگا دیا،اور یہ بھی کہتا ہے کہ رسول اللہ کے اعتکاف کے ایام میں ہر سال حضرت خدیجہ آپ کے ساتھ ہوتی ، یہ بھی اپنی طرف سے بیان کیا جبکہ سیرت ابن ہشام میں ان قیودات کا کوئی تذکرہ نہیں۔ملاحظہ ہو اول عبارت:

'' كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يجاور في حراء من كل سنة شهراً، وكان ذلك مما تحنث به قريش في الجاهلية. والتحنث التبرر ''

(سیرت النبی لابن ہشام جلد 1 صفحہ 266)

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر سال ایک مہینہ حراء میں اعتکاف کیا کرتے تھے،اور بات ان عادتوں میں سے تھی جس کو قریش بھی جاہلیت میں بطور عبادت کرتے تھے۔تحنث کا معنی نیکی کی ہے۔''

غور کرے یہاں ایسی کوئی بات نہیں کہ رسول اللہ ہر سال ماہ رمضان میں کوہ حراء جاتے ، بلکہ سیرت ابن ہشام سے جو بات معلوم ہوتی ہے وہ یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر سال ایک مہینہ معتکف ہوتے ،اور کیا حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا بھی آپ کے ساتھ ہوتی ،تو اس کا تذکرہ بھی ابن ہشام میں موجود نہیں ،فقط اس کا تذکرہ ہے کہ جس سال جس مہینے آپ کو نبوت پر مطلع کرنا تھا یعنی وحی نازل ہونے والا تھا اسی مہینہ حضرت خدیجہ بھی آپ کے ساتھ تھی اور وہ مہینہ رمضان کا تھا ۔اس کے علاوہ ہمیشہ ہر سال کی تصریح نہیں۔

بالفرض اگر تسلیم بھی کرلیا جائے کہ ہر سال رمضان کے مہینے میں معتکف ہوتے تب بھی اس

سے یہ لازم نہیں آتا کہ رسول اللہ نے قریش کی وجہ سے یا اس رسم کی وجہ سے رمضان کے روزے فرض کئے، بلکہ وہ تو اللہ کے حکم سے تھا اس میں کوئی شک نہیں، مگر ہم پوچھتے ہے اگر رسول اللہ نے قریش کی اس رسم کی وجہ سے یہ رسم اپنا لی اور ہر مہینہ رمضان کے روزے فرض کئے تو پھر عاشورہ کا روزہ کس لئے فرض تھا؟ وہ کس کو دیکھ کر فرض کیا؟ وہاں تو آپ کہتے ہیں کہ یہودیوں کو دیکھ کران کی خاطر یہ روزہ کا حکم دیا اور یہاں آپ کہتے ہیں پرانی رسم کی وجہ سے۔

لہذا یہ فقط تمہارا بدگمان ہے، اور اپنے گمان کے مطابق نتیجہ اخذ کرنا ہے، اور اس سے ہمارا کوئی تعلق نہیں نہ ہم تمہارے خیالات کے پابند ہے اور نہ یہ طریقہ واصول ہے۔ کیونکہ ممکن ہے جو نتیجہ آپ اخذ کررہے ہیں وہ یقینی اور صحیح نہیں بلکہ غلط ہوسکتا ہے، اس لئے یہاں شواہد و دلائل کی بنیاد پر جواب دیا جائے گا۔

دوسری بات: کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر سال معتکف رہتا تو وہاں زید سے ان کی ملاقات ہوتی، اور ظاہر ہے وہاں سے بہت کچھ سیکھا ہوگا اور زید کی اثرات محمد پر پڑے ہوں گے، اسی لئے رسول اللہ نے زید کے لئے دعا کی اور ان کی تعظیم وتکریم کرتے۔

جوابا عرض ہے کہ اگر زید کو اتنی معلومات تھی اور زید دین ابراہیم کو بھی پہچان لیا تھا تو پھر خود کیوں نبوت کا دعویٰ نہیں کیا؟ کیونکہ جس طرح تم کہتے ہو کہ محمد اللہ کا رسول نہیں ہے ویسے مدعی نبوت ہے، تو پھر زید بھی تو یہ کام کرسکتا تھا مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ اور اگر انہیں کچھ معلومات حاصل تھی جس کی بناء پر وہ ایسا نہیں کرسکتے تو پھر محمد کے بارے میں کیسے کہہ سکتے ہو کہ اللہ کا رسول نہیں، کیونکہ تم بھی مانتے ہو کہ محمد کو زیادہ معلومات حاصل نہیں تھی، بس کہی سے کچھ سنتا یا ملتا اسی کو وحی کا نام دیتا۔ اس صورت میں تمہارا یہ دعوی کہ ''رسول اللہ کچھ چیزوں سے واقف نہیں تھے، جیسے سن لیا ویسے بیان کیا'' یہ دعوی باطل ہوگا۔

زید کو خود معلوم ہوا کہ بنی اسماعیل میں ایک نبی پیدا ہوں گے، اور اسی لئے انہوں نے اس

کے لئے سلام عرض کیا تھا اور ساتھ اپنے ایمان کا اظہار کیا تھا، چنانچہ عامر بن ربیعہ کا روایت ماقبل گزر چکا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ میں بنی اسماعیل میں سے کسی نبی کے بھیجے جانے کا انتظار کر رہا ہوں لیکن مجھے نہیں لگتا کہ میں اس سے ملوں گا اور میں اس پر ایمان لاتا ہوں اور اس کی تصدیق کرتا ہوں اور گواہی دیتا ہوں کہ وہ نبی ہیں۔ اگر آپ کی عمر لمبی ہے تو اسے میرا اسلام کہنا۔ عامر نے کہا: جب میں نے اسلام قبول کیا تو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا واقعہ سنایا۔ تو آپ نے سلام کا جواب دیا، اور اس کے لیے رحمت کی دعا کی اور کہا: میں نے اسے جنت میں اپنے کپڑے گھسیٹتے ہوئے دیکھا۔ رسول اللہ کیسے زید سے سیکھ سکتا ہے یا ان سے کچھ لے سکتا ہے جبکہ خود انہیں یقین ہے کہ عنقریب بنی اسماعیل میں ایک نبی ظاہر ہونے والا ہے، اس سے تو رسول اللہ کی نبوت کی تصدیق ہوتی ہے۔

اور رہی یہ بات کہ جو باتیں زید نے کہا تھا وہی باتیں قرآن میں بھی موجود ہے، تو عرض ہے جناب جب زید دین ابراہیم کو تلاش کر چکا تھا اور اسے بعض وہ باتیں جو دیں ابراہیم میں تھے معلوم ہو چکے تھے، تو اس نے ایسا ہی کیا، اور پھر جب رسول اللہ پر وحی نازل ہوئی تو ظاہر ہے رسول اللہ بھی تو انہیں دیں ابراہیم ہی کی دعوت دیتے، جو توحید کی دعوت تھی۔ اس کے علاوہ وہ باتیں جو عقلا و شرعاً ناپسندیدہ تھے ان سے بھی روکا۔ اس سے یہ ہرگز لازم نہیں آتا کہ رسول اللہ نے زید سے کچھ لیا ہوں۔ زید نے جو کیا تھا یا نہیں، رسول اللہ نے وہی بتادیا جو ان کے منصب کے عین مطابق تھا۔ اگر رسول اللہ محض یہاں وہاں سے کچھ سیکھتا جیسے زید وغیرہ تو پھر صرف وہی باتیں پیش کرتا جو ان سے منقول ہیں، حالانکہ آپ شریعت اسلام کا مطالعہ کریں آپ کو اس کے علاوہ اور بھی عقائد و احکام و معاملات ملیں گے جو ان سے ثابت نہیں، پھر وہ رسول اللہ نے کہا سے لیا؟ کیا کسی کتاب میں وہ بھی موجود ہیں؟ اس لئے زید دین ابراہیم پر تھا اور اس نے دین ابراہیم سے متعلق کچھ باتوں کو معلوم ہو چکا تھا جس پر وہ عمل پیرا تھا، اس کے بعد رسول اللہ صلی

اللہ علیہ وسلم نے دیگر انبیاء کی طرح وہی باتیں بتائے جو حکمت و محل کے مطابق تھا۔

اور ''حنیف''لفظ کا معنی عبرانی یا سریانی میں جو بھی ہو مگر جب لفظ عرف عام میں کسی خاص معنی یا اچھے معنی میں مستعمل ہو تو لوگ اسی کو ہی استعمال کرتے ہیں چہ جائیکہ اس کے معانی میں کوئی غلط معنی بھی نکلے، اور اگر رسول اللہ نے اس لفظ کا استعمال بھی کیا ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے تو اسی معنی کو مدنظر رکھتے ہوئے کیا ہے کہ بت پرستی سے باز آجاؤ جیسے حنیف لوگوں نے کیا، اور چونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام بت پرستی سے بیزار اور سخت مخالف تھے اس لئے یہ لفظ بطور مجاز ان کے لئے استعمال کیا گیا کہ جیسے حنیف کا معنی بت پرستی سے بیزاری ایسا ہی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی بت پرستی سے بیزاری اختیار کی۔

ایک سوال مخالفین سے:

آخر میں ایک سوال کر کے ہم اس بحث کے ساتھ اس باب کو ختم کریں گے، مخالفین کہتے ہیں رسول اللہ نے فلاں فلاں مذہب سے کچھ باتیں لیا یا سیکھا یا کسی بھی ذریعہ سے حاصل کر کے اسے وحی کا نام دیا اور شریعت کا نام دیا۔ حالانکہ ایسا کچھ نہیں تھا وہ محض دوسروں سے سنی سنائی باتیں تھی۔

ہمارا سوال یہ ہیں کہ اگر رسول اللہ نے کچھ باتیں یہودیوں یا عیسائیوں یا دیگر مذاہب یا لوگوں سے لیا تھا اور اسی کو قرآن کا نام دیا۔ تو پھر ہمیں بتایا جائے کہ اس کے علاوہ قرآن میں جو احکام و قصص موجود ہے، کہیں اجمالا کہیں تفصیلا اور کہی ان کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، اور جو احکام وغیرہ ہیں وہ پھر رسول اللہ نے کہا سے لیا تھا؟

بالفرض والمحال اگر تسلیم کر لیا جائے کہ رسول اللہ اپنی طرف سے یا کہی اور ذرائع سے معلومات حاصل کر کے ان کو وحی کا نام دیتے، تو پھر ہم چیلنج کرتے ہیں مخالفین کو کہ ہم قرآن اٹھا کر لے آئیں گے اور شروع کریں گے سورۃ الفاتحہ سے آخر تک ایک ایک سورت اور اس

میں جو آیات ہیں جس حوالے سے بھی ہیں، اس کا پس منظر بیان کریں گے اور مخالفین اس کو قدیم کتب سے ثابت کریں گے کہ رسول اللہ نے یہ بات فلاں کتاب سے لی ہے۔ جیسے یہاں ذکر ہوا ہے ویسے فلاں کتاب میں، اور کتاب سے اس کا ماخذ ثابت نہ کر سکے تو اس شخص کا نام بتائے جن سے رسول اللہ نے یہ بات سیکھی اور اس کا مکمل پس منظر بیان کرے کہ سیکھنے کی کیفیت کیا تھی ۔

اس کے بعد ہم آئیں گے حدیث کی جانب، صحیح قول رسول پیش کریں گے اور مخالفین اس کے مقابل وہ کتب پیش کریں گے جن میں یہ بات مذکور ہو، یا وہ ذرائع کی تفصیل بتائیں گے جن ذرائع سے رسول اللہ نے یہ حاصل کیا۔ اور اس کی مکمل کیفیت بتائیں گے ۔ نَحْنُ نَنْتَظِرُ

الحمد اللہ اللہ تعالیٰ کے خاص فضل و مدد سے آج بروز بدھ 2 اکتوبر 2025ء بمطابق 8 ربیع الثانی 1447ھ ڈاکٹر ٹسڈل کی کتاب ''ماخذ القرآن'' کا جواب مکمل ہوا۔

باب دوم میں ''الفرقان الحق'' کا جائزہ لیا جائے گا۔

اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَسْتَعِیْنُکَ

باب دوم

''الفرقان الحق'' کا علمی محاسبہ:

قرآن مجید کے چیلنج کے بعد مختلف ادوار میں کچھ لوگوں نے قرآن کے مقابلہ میں کچھ آیات یا سورتیں پیش کر کے یہ دعوی کیا کہ ہم نے قرآن کے چیلنج کا جواب دے دیا۔ اور وہ فقط کچھ آیات یا ایک سورت کے مقابلہ میں پیش کیا گیا، مگر اکیسویں صدی میں ایک نام نہاد عیسائی مبلغ نے قرآن کے مقابلہ میں مکمل ایک کتاب پیش کی، اور دعویٰ کیا کہ قرآن نے جو چیلنج دیا تھا وہ میں نے مکمل کیا۔ اور قرآن معاذ اللہ صحیح کتاب نہیں وہ قتل و غارت کا حکم دیتا ہے، جبکہ مسلمانوں کو اب ''الفرقان الحق'' پڑھنا چاہیے۔ اور اسے اکیسویں صدی کا قرآن یا امریکی قرآن کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔

اس کے مصنف ڈاکٹر انیس شوروش (Anis Shorrosh) ہے جو خود کو 'الصفی' 'المہدیٰ' اور 'مہدی منتظر' جیسے القاب سے ملقب کرتا ہے۔ اور 1933ء فلسطین میں پیدا ہوا یعنی یہ اصلاً فلسطینی عربی ہے۔ اُردن کے میسپی کالج (Mississppi College) میں تعلیم حاصل کی۔ ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنے سے قبل Orleans Baptist New Theological Seminary ادارہ میں پڑھاتا رہا اور دو مرتبہ ڈاکٹریٹ کی ڈگری بالترتیب Institute of Seminory Ministory Dayton Tennessee اور International luther Rice کی یونیورسٹیوں سے حاصل کیں۔ یہودیوں کے ساتھ مقبوضہ ارضِ مقدس میں کام کرتا رہا۔ مزید براں 1959 تا 1966ء تک یروشلم کے کنیسا میں بھی خدمات انجام دیں۔ امریکہ اور اسرائیل کے مابین 40 سال تک Clorgyman یعنی پادری سفارتکار کے طور پر جبکہ افریقہ' کینیا' کیپ ٹاؤن' ڈربن'

جوہانسبرگ وغیرہ میں بطور عیسائی مبلغ کام کیا۔ 1955ء میں نیوزی لینڈ سے انگلینڈ منتقل ہوا اور بعدازاں پرتگال میں رہائش پذیر رہا اور 2018 میں مرگیا۔

کتاب کا نام ''الفرقان الحق'' صفحات کی تعداد: 366 /صفحہ سائز: 1520 x سم۔

سورتوں کی تعداد: مقدمہ، بسملہ اور خاتمہ کے علاوہ (77) سورتیں۔

فصل اول: قرآنی چیلنج اور معارضین کے چہ میگوئیاں

قرآن مجید کے نزول کے وقت اللہ نے حکمت عملی کے ساتھ یہ چیلنج دیا کہ اگر کسی کو اس میں شک ہے تو وہ اس جیسا کلام پیش کرے۔ یہ انتہائی مضبوط اتمام حجت تھا، کیونکہ رسول اللہ کے بعد کوئی نبی نے نہیں آنا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے انتہائی مضبوط انداز میں اتمام حجت کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے واضح نشانیاں پیدا کی، جو اہل فہم تھے وہ تو سمجھ گئے اور تسلیم کر لئے، مگر کچھ بے وقوف واحمق اس کو بھی نہیں سمجھا یا سمجھ تو گئے مگر زدو عناد کی بنیاد پر تسلیم کرنے سے انکاری ہوئے۔

قرآن کے نزول کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور ہی سے جھوٹے نبوت کے دعویدار پیدا ہوئے، اور وحی کے جھوٹے دعوی کئے، مگر اس میں بھی وہ قرآن کے نقل اتارنے لگے۔ کسی نے بھی ایسے انداز میں وحی پیش نہیں کیا جیسے رسول اللہ نے پیش کیا۔ بعض لوگوں نے اسے وحی کا نام دیا اور بعض لوگوں نے قرآن کے چیلنج کو قبول کرنے کا نام دے کر اس کی نظیر پیش کرنے کے لئے کمر کس لی، غرض ہر دور میں جھوٹے نبی کے ساتھ ساتھ جھوٹی وحی کے دعویدار پیدا ہوئے۔ مگر ان کا یہ جھوٹا بیانیہ زیادہ دیر تک برقرار نہ رہ سکا، اور جلد اپنے انجام کو پہنچے۔

سب سے پہلے جس نے جھوٹی نبوت وجھوٹی وحی کا دعویٰ کیا وہ مسیلمہ بن ثمامہ المعروف مسیلمہ کذاب تھا، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں نبوت کا دعویٰ کیا۔ اس کا تعلق بنی حنیفہ سے تھا اور یمامہ میں رہتا تھا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف عرب قبائل کے وفود آتے

تھے۔ بنی حنیفہ کا وفد بھی سنہ 9 ہجری میں مدینہ آیا، جس میں مسیلمہ بن ثمامہ بھی شامل تھا۔ یہ وفد اسلام قبول کر کے واپس چلا گیا، لیکن بعد میں مسیلمہ نے دعویٰ کیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے بھی نبوت میں شریک کیا ہے۔

مسیلمہ نے ایک خط لکھا: ''من مسيلمه رسول الله إلى محمد رسول الله، أما بعد، فإني قد أشركت في الأمر معك''

(مسیلمہ، اللہ کا رسول، محمد اللہ کے رسول کی طرف لکھتا ہے... مجھے بھی اس معاملے میں شریک کیا گیا ہے)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جواب: ''من محمد رسول الله إلى مسيلمة الكذاب، السلام على من اتبع الهدى''

(محمد اللہ کے رسول کی طرف سے، مسیلمہ جھوٹے کے لیے، ہدایت کی پیروی کرنے والوں پر سلام ہو)

(ابن کثیر، البدایہ والنہایہ، جلد 6 / سیرت ابن ہشام، جلد 4 / صحیح ابن حبان، حدیث 6546 / سیر اعلام النبلاء، الذھبی، جلد 1)

جنگ یمامہ میں وحشی بن حربؓ (جنہوں نے اسلام قبول کرلیا تھا اور طائف میں طویل توبہ کی زندگی گزاری) نے نیزہ مارا، اور ابودجانہؓ نے اس کا سرتن سے جدا کیا۔

انہوں نے دعوی کیا کہ مجھ پر وحی نازل ہوا ہے، دراصل وہ وحی نہیں بلکہ قرآن سے سرقہ شدہ عبارت بنا کر پیش کرتا۔ اور جھوٹ بولتا کہ وحی نازل ہوا ہے۔

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے ان کی کچھ عبارات نقل کئے ہیں جن کے متعلق وہ یہ کہتا کہ مجھ پر وحی ہوئی ہے:

'' يا ضفدع بنت الضفدعين نقي لكم نقين، لا الماء تكدرين ولا

الشارب تمنعين، رأسك في الماء، وذنبك في الطين''

(البدایہ والنہایہ مترجم جلد 6 صفحہ 433)

اے مینڈکی جو دو مینڈکوں کی بیٹی ہے، تمہارے لئے پانی صاف ہے اور تو پانی کو گدلا نہیں کرتی، اور نہ لینے والے کو منع کرتی ہے، تیرا سر پانی میں اور تیری دم کیچڑ میں ہوتی ہے۔

''والمبذرات زرعا، والحاصدات حصدا، والذاريات قمحا، والطاحنات طحنا، والخابزات خبزا، والثاردات ثردا، واللاقمات لقما، إهالة وسمنا، لقد فضلتم على أهل الوبر، وما سبقكم أهل المدر، رفيقكم فامنعوه، والمعتر فآووه، والناعي فواسوه''

(حوالہ ایضا)

''اور قسم ہے کھیتی کا بیج ڈالنے والی جماعتوں کی، اور کھیتی کاٹنے والی جماعتوں کی، اور گندم اڑانے والی جماعتوں کی، اور پیسنے والی جماعتوں کی، اور روٹی پکانے والی جماعتوں کی، اور ثرید بنانے والی جماعتوں کی، اور چربی اور گھی کے لقمے لینے والی جماعتوں کی، تحقیق تم دیہاتی لوگوں سے بڑھ گئے ہو اور نہ شہر والوں نے تم سے سبقت کی ہے، اور اپنے ساتھی کی حفاظت کرو اور فقیر کو پناہ دو، اور موت کی خبر دینے والے سے ہمدردی کرو۔''

''والفيل وما أدراك ما الفيل، له زلوم طويل ۔۔۔۔ والليل الدامس، والذئب الهامس، ما قطعت أسد من رطب ولا يابس ۔۔۔۔ لقد أنعم الله على الحبلى، أخرج منها نسمة تسعى، من بين صفاق وحشي''

''اور ہاتھی، اور تمہیں کیا معلوم کہ ہاتھی کیا ہے؟ اس کی دم لمبی ہے ۔۔۔۔۔ اور قسم ہے سیاہ رات کی، اور سرگوشی کرنے والا بھیڑیا کی، کسی شیر نے تازہ یا خشک چیز کو نہیں کاٹا۔ بیشک اللہ نے حاملہ عورت پر انعام کیا، اس میں سے ایک چلتی پھرتی جان نکالی، وحشی درندے کے بیچ سے۔''

علامہ باقلانی رحمہ اللہ مسیلمہ کے ان خود ساختہ آیات پر یوں تبصرہ فرماتے ہیں کہ:

'' جہاں تک مسیلمہ جھوٹے کے الفاظ کا تعلق ہے اور جو اس نے گمان کیا ہے کہ وہ قرآن ہے، وہ ہمارے لیے اس قدر گھٹیا ہے کہ ہم اس کا ذکر وفکر بھی نہیں کرنا چاہتے۔ہم نے اس کا صرف ایک حصہ اس لیے نقل کیا ہے کہ پڑھنے والا حیران رہ جائے اور دیکھنے والا بصیرت حاصل کر سکے۔ کیونکہ اس نے اپنی حماقت کے باوجود لوگوں کو گمراہ کیا، اور اپنی کمزوری کا بھی ہمیشہ مظاہرہ کیا اس لئے جہالت کا میدان بہت وسیع ہے! اگر کوئی اس پر غور کرے جو ہم نے اس سے نقل کیا ہے، تو اس کی جہالت سے واقف ہوگا، وہ برجستہ اس بات پر اللہ تعالیٰ کی تعریف بیان کرے گا جو فہم اور علم اللہ تعالی نے اس کو دیا ہے۔''

(اعجاز القرآن صفحہ 156-158)

مزید فرماتے ہیں کہ:

''روایت ہے کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بنوحنیفہ کے کچھ لوگوں سے جو ان کے پاس آئے تھے ان الفاظ کے بارے میں پوچھا۔انہوں نے وہ بیان کر دیا جو ہم نے ماقبل ذکر کیا۔ پس ابوبکر نے کہا: سبحان اللہ (اللہ پاک ہے) ایسا کلام تو اللہ کی ذات وربوبیت سے نہیں ہوسکتا، کا تم کہا جا رہے ہو۔۔۔ پس جس کے پاس عقل ہوگا وہ اس کے کلام کی بیہودگی سے خوب واقف ہوگا''

(اعجاز القرآن للباقلانی)

مسیلمہ کے کلام آپ نے ملاحظہ کرلیا جس کے متعلق علامہ باقلانی رحمہ اللہ فرما رہے ہیں کہ ان کا کلام کوئی خاص کلام نہیں جس کو ذکر کر کے ہم اپنا وقت ضائع کرے۔ یقیناً انہوں نے اپنے اس جھوٹے کلام سے لوگوں کو گمراہ کیا، اس لئے ان کے کلام کو نقل کر رہے ہیں۔

ان کا کلام ایک مسخرہ ہے، وحی سے اس کا کچھ تعلق ہی نہیں، کیونکہ اہل سخن پر یہ ظاہر ہوگا کہ یہ کلام، کلام نہیں محض ایک دھوکہ اور قرآن کی نقالی ہے۔ بے جا قسم اٹھانا، قسم کا تعلق نہ نہ سیاق

سے ہیں اور نہ سباق، مزید لہجہ قسم کے انداز گفتگو جو یقیناً کسی ادیب کے ہاں محض ایک نو آموز طالب کا کلام بھی نہیں لگتا۔

ابو الطیب احمد بن حسین بن حسن الجعفی المعروف متنبی چوتھی صدی ہجری کا مشہور شاعر و ادیب ہیں، ۳۰۳ ھجری کوفہ میں پیدا ہوئے۔ اور ۳۵۴ ھ میں انتقال کر گیا۔ ان کی مشہور تصنیف دیوان المتنبی انتہائی شہرت کے حامل ہے۔ انہوں نے بھی کسی زمانے میں نبوت کا دعویٰ کیا تھا، پھر وقت کے حکمران نے قید کیا پھر توبہ کر کے دوبارہ رجوع کیا۔ اسی لئے بعض نے متنبی کہنے کی وجہ یہی بتلائی ہیں کہ ان کو تنبیہ کیا گیا۔ چنانچہ انہوں نے بھی کہا تھا کہ مجھ پر وحی کا نزول ہوتا ہے، اور وہ یہ ہے:

”والنجم السیار، والفلک الدوار، واللیل والنہار، ان الکافر لفی اخطار، امض علی سننتک، واقف اثر من قبلک من المرسلین، فان اللہ قامع بک زیغ من الحد فی دینہ، وضل عن سبیلہ“

”اور چلتے ہوئے ستارے اور گردش کرنے والے کرہ اور رات اور دن کی قسم، بے شک کافر خطروں میں ہیں۔ اپنے نمونے کی پیروی کرو اور اپنے سے پہلے کے رسولوں کی پیروی کرو، پس بے شک اللہ تعالیٰ کاٹ دے گا تمہارے سبب اس شخص کو جو کج روی اختیار کرے اپنے دین میں اور بھٹک جائے راستے سے۔“

غور فرمائیں کس طرح یہ درباری شاعر قرآن کی نقالی کر رہا ہے، سورۃ العصر سے سرقہ کر کے کچھ الفاظ کی زیادتی کی ہے۔ چار قسموں کے بعد جواب قسم پر غور فرمائیں، بھلا اس چیز پر بھی قسم اٹھایا جا سکتا ہے۔

فصل دوم: علم بلاغت واعجاز القرآن

مقدمہ میں وجوہ اعجاز القرآن کومختصر بیان کیا گیا ہے، چونکہ یہ ایک مستقل عنوان ہے جس کا تعلق عموماً علوم القرآن سے ہے، اور علماء کرام نے مستقل تصانیف اس موضوع پر لکھی ہیں، خاص طور پر چوتھی صدی ہجری کے محقق عالم علامہ باقلانی رحمہ اللہ کی کتاب ''اعجاز القرآن''اس موضوع پر بہترین تصنیف ہے۔اس لئے یہاں اگر اعجاز القرآن کے عنوان کو مستقل ذکر کیا جائے تو اصل مقصد فوت ہوجائے گی، بنابریں دیگر وجوہات میں سے علم بلاغت کو بیان کریں گے، کیونکہ قرآن کے منجملہ وجوہات ایک وجہ اعجاز فصاحت و بلاغت ہے، اس لئے اس کو ذکر کرنے کا مقصد آگے''الفرقان الحق'' کی حیثیت کا آپ کو اندازہ ہوگا کہ کجا فصاحت قرآن اور کجا یہ سرقہ شدہ کتاب۔علاوہ ازیں آگے جب بھی فصاحت و بلاغت کی بحث آئے گی تو یہی اس کے لئے کافی ہے۔

علم بلاغت سے متعلق اصطلاحات وتعریفات مع امثلہ قرآنی محمد مرشد قاسمی صاحب کے ترتیب شدہ مختصر رسالہ ''معین البلاغہ مع امثلہ قرآنی'' سے پیش خدمت ہے، جو اختصار کے ساتھ ساتھ امثال قرآنی سے مزین ہے۔

فصاحت کا بیان:

فصاحت کے لغوی معنی: ظاہر کرنا، ظاہر ہونا۔

فصاحت کی اصطلاحی تعریف: ایسے الفاظ جو ظاہر ہوں، جلد سمجھ میں آجانے والے اور مانوس الاستعمال ہوں۔

فصاحت کی تقسیم:

فصاحت کی تین قسمیں ہیں: ۱۔فصاحت کلمہ ۲۔فصاحت کلام ۳۔فصاحت متکلم۔

فصاحت کلمہ: کلمہ تنافر حروف، مخالفت قیاس، غرابت اور کراہت فی السمع سے محفوظ ہو۔

تنافر حروف: کلمے میں کچھ ایسے حروف جمع ہو جائیں جس کے سبب اس کا تلفظ دشوار ہو، جیسے ظش (کھردرا)

مخالفت قیاس: کلمہ قاعدہ صرفی ولغوی کے خلاف ہو، جیسے الحمد لله العلي الأجلل۔ (الاجلل میں ادغام نہیں کیا گیا)

نوٹ: اگر کوئی کلمہ قاعدہ صرفی کے خلاف ہو لیکن استعمال عرب کے موافق ہو تو وہ کلمے غیر فصیح نہیں کہلائیں گے، جیسے مسجد، مشرق مغرب وغیرہ۔

غرابت اور کراہت فی السمع: کلمہ ایسا غیر مانوس الاستعمال ہو کہ کان اس کے سننے سے نفرت کرے، جیسے خوعم (بمعنی احمق)

فصاحت کلام:

کلام تنافر کلمات، ضعف تالیف، تعقید لفظی اور معنوی سے محفوظ ہو۔

تنافر کلمات: کلام میں کچھ ایسے فصیح کلمے جمع ہو جائیں، یا مکرر آ جائیں جس کے سب اس کا تلفظ دشوار ہو جائے، جیسے

قبر حرب بمكان قفر
وليس قرب قبر حرب قبر

قرب اور قبر کی تکرار سے ثقل پیدا ہو گیا۔

ضعف تالیف: کلام مشہور قاعدہ نحوی کے خلاف ہو، جیسے جزی بنوہ ابا الغیلان (اضمار قبل الذکر ہے)۔

تعقید لفظی: کلام میں کچھ ایسی لفظی (عبارت میں حذف تقدیم وتاخیر کی وجہ سے پیچیدگی پیدا ہوتی ہے۔

) پیچیدگی (حذف، فصل، تقدیم وتاخیر) ہوجس کے سبب اس کا مفہوم سمجھنا دشوار ہو جیسے ما قرأ إلا واحدًا محمدٌ مع اخیہ کتابا. اس کی اصل ہے ما قرأ محمد مع أخیہ إلا کتابا واحدا.

تعقید معنوی: کلام میں کچھ ایسی معنوی (مجاز کی کثرت اور کنایات بعیدہ کی وجہ سے معنوی پیچیدگی ہوتی ہے۔

) پیچیدگی ہو جس کے سبب اس کا مفہوم سمجھنا دشوار ہو، جیسے نشر الملک السنتہ فی المدینۃ.

السنہ سے مراد جاسوس ہے، جب کہ بہتر یہ تھا کہ جاسوسی کے لیے کنایہ قریبہ ''اعین'' کا استعمال ہوتا ہے، چوں کہ جاسوس زبان کے بنسبت آنکھ زیادہ استعمال کرتا ہے۔

فصاحت متکلم: وہ ایسا ملکہ ہے جس کے ذریعے متکلم فصیح کلام کے ذریعے مقصود کی تعبیر پر قادر ہو۔

فائدہ: تنافر کا علم، ذوق سلیم سے مخالفت قیاس، کا صرف سے، ضعف تالیف اور تعقید لفظی کا نحو سے، تعقید معنوی کا علم بیان سے، غرابت اور کراہت فی السمع کا علم کلام عرب کا بکثرت مطالعہ کرنے سے ہوتا ہے۔

بلاغت کا بیان:

بلاغت کے لغوی معنی پہونچنا، انتہاء ہونا۔

بلاغت کی اصطلاحی تعریف: کسی عظیم مفہوم کو ایسی فصیح عبارت سے ادا کرنا جو نفوس میں مؤثر اور احوال کے مطابق ہو۔

بلاغت کی دو قسمیں ہیں: (۱) بلاغت کلام (۲) بلاغت متکلم۔

بلاغت کلام: کلام کا حالات کے تقاضے کے مطابق ہونا۔ بلاغت متکلم: وہ ایسا ملکہ ہے جس کے ذریعے متکلم، بلیغ کلام کے ساتھ مقصود کی تعبیر پر قادر ہو۔

بلاغت کے چار درجے ہیں: ۔حد الاعجاز ۲۔اعلی ۳۔اوسط ۴۔اسفل

علم معانی:

فصاحت و بلاغت تین علوم پر مشتمل ہیں: (۱)علم معانی (۲)علم بیان (۳)علم بدیع

علم معانی وہ علم ہے جس میں عربی الفاظ کے ان احوال سے بحث کی جائے جن کے ذریعے الفاظ مقتضی حال کے مطابق ہوں۔

علم معانی میں آٹھ قسم کے احوال سے بحث ہوتی ہے: (۱) خبر و انشاء (۲) ذکر و حذف (۳) تقدیم و تاخیر (۴) تعریف و تنکیر (۵) اطلاق و تقیید (۶) قصر (۷) وصل و فصل (۸) ایجاز و اطناب و مساوات

خبر و انشاء:

خبر وہ کلام جو بذات خود صدق و کذب کا احتمال رکھے، جیسے: **فتلقی آدم من ربه کلمات**

انشاء وہ کلام ہے جو بذات خود صدق و کذب کا احتمال نہ رکھے جیسے: **اتق الله ولا تطع الکافرین والمنافقین**۔

جو بات خارج اور واقع کے مطابق ہو اسے صدق اور خارج و واقع کے خلاف ہو اسے کذب کہتے ہیں۔

اجزاء کے اعتبار سے خبر کی دو قسمیں ہیں: (۱) جملہ فعلیہ (۲) جملہ اسمیہ۔

جملہ فعلیہ وہ جملہ جس کا پہلا جزء فعل ہو جیسے: یخلقکم فی بطون امہاتکم۔

جملہ اسمیہ وہ جملہ جس کا پہلا جزء اسم ہو جیسے: محمد رسول اللہ۔

جملہ فعلیہ حدوث کا فائدہ دیتا ہے مع استمرار تجددی۔ اور جملہ اسمیہ استمرار و دوام کا فائدہ دیتا ہے۔

اقسام خبر:

مخاطب کے احوال کے اعتبار سے خبر کی تین قسمیں ہیں: (۱) ابتدائی (۲) طلبی (۳) انکاری
۔

ابتدائی وہ خبر ہے جس میں خالی الذہن شخص سے خطاب کیا جائے جیسے" ھذا کتاب مبارک انزلناہ" ۔اور طلبی وہ خبر ہے جس میں متردد شخص سے خطاب کیا جائے جیسے:" ان ھذا القرآن یھدی للتی ھی اقوم" ۔اور انکاری وہ خبر ہے جس میں منکر شخص سے خطاب کیا جائے جیسے:" انہ لقرآن کریم" ۔

خبر ابتدائی تاکید سے خالی ہوتا ہوگی ،اور خبر طلبی میں تاکید لانا بہتر ہے، اور خبر انکاری میں تاکید لانا واجب ہے بلکہ انکار کی شدت کے اعتبار سے تاکید میں بھی زیادتی ہوگی۔

انشاء کی دو قسمیں ہیں: (۱) طلبی (۲) غیر طلبی۔

طلبی وہ انشاء ہے جس میں کسی مقصود کو طلب کیا جائے جیسے:" اقم الصلوۃ" ۔اور غیر طلبی وہ انشاء ہے جس میں کسی مقصود کو طلب نہ کیا جائے جیسے:"نعم الثواب" ۔

انشاء طلبی کی چھ قسمیں ہیں: (۱) امر (۲) نہی (۳) تمنی (۴) ترجی (۵) استفہام (٦) ندا

امر وجود فعل کو طلب کرنا اپنے کو بڑا سمجھتے ہوئے جیسے: **اقیموا الصلوۃ**۔

امر کا مقصود اصلی تو یہی ہے، اس کے علاوہ امر دیگر معانی میں مجازا استعمال ہوتا ہے جیسے: التماس، تمنی، تہدید، تعجیز، تسویہ، دوام، اکرام، امتنان، ارشاد، اباحت، تعجب، اہانت تہکم، اعتبار
۔

نہی کا مطلب ترک فعل کو طلب کرنا اپنے کو بڑا سمجھتے ہوئے جیسے: **لاتفسدوا فی الارض**۔

نہی کا بھی اصل معنی یہی ہے، اس کے علاوہ دیگر معانی میں مجازا استعمال ہوتا ہے۔

تمنی کہتے ہیں کسی ایسی محبوب چیز کو طلب کرنا جس کے حصول کی امید نہ ہو محال یا مشابہ بالمحال ہونے کی وجہ سے، جیسے: **یالیتنی کنت ترابا۔**

ترجی کا معنی کسی ایسی محبوب چیز کا انتظار کرنا جس کے حصول کی امید ہو، جیسے: **لعل اللہ یحدث بعد ذلک امرا۔**

استفہام کہتے ہیں کسی چیز کے متعلق علم طلب کرنا، جیسے: **أإله مع اللہ۔**

استفہام کا اصل معنی یہی ہے، مگر کبھی مجازا دیگر معانی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

ندا کا معنی یہ ہے کہ کسی کی توجہ طلب کرنا ایسے حرف کے ذریعے جو "**أدعو**" فعل کے قائم مقام ہو، جیسے: **یا داؤد انا جعلناک خلیفۃ فی الارض۔**

ندا بھی کبھی اصلی معنی کے علاوہ دیگر معانی میں مجازا استعمال ہوتا ہے۔

انشاء غیر طلبی:

وہ ہے جس میں کسی مقصود کو طلب نہ کیا جائے۔ اس کی سات قسمیں ہیں: (۱) تعجب (۲) قسم (۳) افعال رجاء (۴) افعال مدح وذم (۵) معاملات کے صیغے (۶) رُبّ (۷) کم خبریہ۔

ذکر وحذف:

کلام میں جو بھی لفظ ذکر یا حذف کیا جائے اس کا کوئی سبب ضرور ہوتا ہے۔ اول ذکر کے اسباب ملاحظہ فرمائیں۔

(۱) قرینہ کا نہ پایا جانا، جیسے "**ظهر الفساد فی البر والبحر**" (اگر فساد کو حذف کیا جائے تو معلوم نہیں ہوگا کہ مسند الیہ کون ہے) (۲) تقریر (وضاحت کی زیادتی) جیسے: "**اولئک علی هدی من ربهم واولئک هم المفلحون**" (اولئک کو مکرر لانے سے بات پختہ ہوگئی) (۳) سامع پر کسی بات کو پختہ کر دینا تا کہ انکار کی گنجائش نہ رہے، جیسے: "

الا ان ثمود کفروا ربھم آلا بعدا لثمود ''(ثمود کو دوبارہ ذکر کیا تا کہ سامع پر بات پختہ ہو جائے کہ بددعا انہیں کے لئے ہے)(۴) تعریض (سامع کی کند ذہنی کی طرف اشارہ کرنا) جیسے: '' توبوا الی بارئکم فاقتلوا انفسکم ذالکم خیر لکم عند بارئکم ''(باری کو آخر میں دوبارہ ذکر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اگر اس کا ذکر نہ کرتا تو سامع اس سے کچھ اور سمجھ لیتا)(۵) تبرک واستلذاذ، جیسے '' الذی خلقنی فھو یھدین والذی ھو یطعمنی و یسقین '' (الذی کا اعادہ برکت اور لذت کے لئے ہے)(۶) تعظیم جیسے:'' ربنا الذی اعطی کل شئی ''(ربنا کو ذکر کیا اللہ کی عظمت ظاہر کرنے کے لئے ہے) (۷)تحقیر جیسے ''قال فرعون وما رب العالمین''(فرعون کا ذکر کرنا بطور تحقیر ہے ورنہ نام ذکر کرنے کی ضرورت نہیں تھی)

حذف کے بھی چند اسباب ہیں:

(۱) غیر مخاطب سے کسی امر کو چھپانا، جیسے: ''عبس وتولی ''(مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے، مگر نام ظاہر نہیں کیا)(۲) مقام کی تنگی، جیسے ''فصبر جمیل''(اصل میں امری صبر جمیل)(۳) وزن اور قافیہ کی حفاظت، جیسے: '' نعب الغراب فقلت بین عاجل ''(۴) اہل عرب کے استعمال کی پیروی، جیسے: '' لولا انتم لکنا مؤمنین ''اصل میں (لولا انتم موجود لکنا مؤمنین) (۵) مسند ایک ہی ذات کے لائق ہو، جیسے:''خالق کل شئی عالم الغیب والشھادۃ ''(اصل میں اللہ خالق کل شئی)(۶) کسی قرینہ کا دلالت کرنا، جیسے:'' وقالت عجوز عقیم ''(اصل میں انا عجوز)(۷) انکار کی گنجائش پیدا کرنا، جیسے: '' ھمّاز مشاء بنمیم '' (ولید بن مغیرہ مراد ہے مگر نام نہیں لیا تا کہ بوقت ضرورت انکار کی گنجائش ہے کہ وہ مراد نہیں)

تقدیم وتاخیر:

مسند الیہ کے تقدیم کے اسباب:

(۱) اہمیت جیسے ''محمد رسول الله ''(۲) اتباع قواعد جیسے ''من یرزقکم من السموات و الارض''(۳) تشویش جیسے '' ان اکرمکم عند الله اتقاکم ''(۴) غمی یا خوشی کو جلد بیان کرنا جیسے '' سلام علی المرسلین''(۵) تخصیص جیسے ''الله ربنا '' (۶) تقویت حکم جیسے '' الله الذی خلق سبع سموات'' (۷) افادہ عموم جیسے ''کل ظالم لایفلح ''

مسند کی تقدیم کے اسباب:

منجملہ تقدیم اسباب مسند الیہ کے کچھ یہ ہیں: (۱) مسند کا موقع سوال یا موقع تعجب وانکار ہونا جیسے '' اتخشونهم ''(۲) نیک فالی جیسے '' ادخلوها بسلام آمنین ''(۳) اس کا عامل ہونا جیسے '' سیقول السفهاء ''(۴) وزن کی حفاظت جیسے '' خذوه فغلّوه ''

تعریف وتنکیر:

تعریف کا معنی کلمہ کسی متعین چیز پر دلالت کرے۔ اور تنکیر کا مطلب کلمہ کسی غیر متعین چیز پر دلالت کرے۔

معرفہ کی سات قسمیں ہیں: (۱) ضمیر (۲) علم (۳) اسماء اشارہ (۴) اسماء موصولہ (۵) معرف باللام (۶) ان میں سے کسی ایک طرف اضافت (۷) منادی

تعریف کے فائدے: ضمیر کے ذریعے معرفہ بنانے کے دو فائدے ہیں:

(1) موقع تظلم خطاب اور غیبت ظاہر ہو جائے جیسے '' أنا الله لا إله إلا أنا فاعبدني، أأنت قلت للناس، وهو خير الحاكمين.

(۲) اسم اور ذات کو چھپانا، اور اختصار پیدا کرنا۔ جیسے اعد الله لهم مغفرة۔

علم کے ذریعے معرفہ بنانے کے پانچ فائدے ہیں:

(1) اول وہلہ میں اس کو سامع کے ذہن میں حاضر کر دینا: جیسے وإذ يرفع ابراهيم القواعد من البيت واسمعيل.

(۲) تعظیم جیسے الله ربنا.

(۳) تحقیر: جیسے قال فرعون وما رب العالمين.

(٤) ڈرانا جیسے لمن الملك اليوم لله الواحد القهار.

(۵) استلذاذ (لذت حاصل کرنا): جیسے هو الله الواحد القهار۔

اسم اشارہ کے ذریعے معرفہ بنانے کے پانچ فائدے ہیں:

(1) قرب کو بتانا: جیسے هذا ما وعد الرحمن.

(۲) بعد کو ظاہر کرنا: جیسے ذلک خير .

(۳) تعظیم جیسے ذلک الکتاب لا ریب فیه، إن هذا القرآن يهدى.

(۴) تحقیر: جیسے أهذا الذي يذكر آلهتكم. فذلك الذي يدع اليتيم .

(۵) مخاطب کے ذکاوت کی طرف اشارہ کرنا: جیسے هذا وان للطاغين لشرماب.

اسم موصول کے ذریعے معرفہ بنانے کے چھ فائدے ہیں:

(1) تعظیم (عظمت ظاہر کرنا) جیسے إذ يغشى السدرة ما يغشى.

(۲) ابہام (پوشیدہ رکھنا): جیسے لیس للإنسان الا ما سعى،

(۳) توبیخ (ڈانٹنا): جیسے إنكم وما تعبدون من دون الله حصب جهنم.

(۴) تعلیل (علت بیان کرنا): جیسے إن الذين امنو و عملو الصالحات لهم جنت النعيم.

(۵) تمسخر (مذاق اڑانا): جیسے الذي نزل عليه الذكر انك لمجنون.

(٦) صلہ کا علم نہ ہونا: جیسے رب إني نذرت لك ما بطني محررًا.

الف لام کے ذریعے معرفہ بنانے کا صرف ایک فائدہ ہے:

(1) متعین شئ کی طرف اشارہ کرنا۔ جیسے لیس الذکر کالانثی ۔ انثی سے مراد متعین ذات حضرت مریم علیہا السلام مراد ہیں۔

اضافت کے ذریعہ معرفہ بنانے کے پانچ فائدے ہیں:

(۱) اختصار (عبارت کو مختصر کرنا: جیسے اقترب للناس حسابهم.

(۲) تعظیم جیسے ان عبادي ليس لك عليهم سلطان.

(۳) اکرام پر ابھارنا: جیسے الحمد لله رب العلمين.

(۴) ذلت پر ابھارنا: جیسے لا تتخذوا عدوی وعدوکم أولياء.

(۵) تہکم (استہزاء کرنا) جیسے ان رسولكم الذي ارسل إليكم لمجنون.

ندا کے ذریعے معرفہ بنانے کے وہی فائدے ہیں جو ندا میں ہیں۔

تنکیر کے فائدے: چار غرضوں کی بنیاد پر مسند الیہ کو نکرہ لایا جاتا ہے:

(1) افراد (ایک ہونے کو بتانا): جیسے جاء رجل من أقصى المدينة يسعى.

(۲) نوعیت (کسی ایک حالت کو بتانا): جیسے فويل للذين كفروا من النار، وعلى أبصارهم غشاوة.

(۳) تکثیر (زیادتی کو بتانا): جیسے ائن لنا لأجرا (کیا واقعی ہمارے لیے خوب اجر ہے)

(۴) تقلیل (قلت اور کمی کو بتانا): جیسے ورضوان من اللہ اکبر۔ اللہ کی تھوڑی رضا مندی بہت بڑی ہے)

فائدہ: مسندا کثر نکرہ ہوتا ہے۔ چوں کہ اس سے تعیین مقصود نہیں ہوتا۔

فائدہ: اگر مسند کو معرفہ لایا جائے تو اس سے حصر مقصود ہوتا ہے۔ کبھی حقیقتاً جیسے وھوالغفور، (وہی بہت معاف کرنے والا ہے) کبھی مبالغہ جیسے انت الأمیر (تو ہی امیر ہے۔ کسی انسان سے کہا جائے)۔

فائدہ: اضافت اور صفت کے ذریعے مسند میں تخصیص پیدا کی جاتی ہے، جیسے تلک آیات الکتاب الحکیم۔

اطلاق وتقیید:

اطلاق یہ ہے کہ کلام میں صرف مسند اور مسند الیہ کو ذکر کیا جائے، جیسے: اللہ ربنا۔ اور تقیید یہ ہے کہ کلام میں مسند اور مسند الیہ کے علاوہ کوئی زائد چیز ہو، جیسے: ان الدین عند الله الاسلام۔

اطلاق سے دو غرض ہوتی ہے: (۱) ایک یہ کہ قید سے کوئی غرض وابستہ نہ ہو، جیسے اقترب الساعة وانشق القمر۔ (۲) دوسرا یہ کہ سامع کو سوچ کی آزادی دینا وہ جو چاہے سوچ لے، جیسے: جاء زید (سامع جو سوچے کہ سوار آرہا ہے یا پیدل یا صبح یا شام)

تقیید کے دو غرض ہوتی ہے: (۱) ایک یہ کہ فائدہ مقصود ہو حاصل کرنا، جیسے: یکاد زیتها یضیئ (یکاد سے قرب کا فائدہ حاصل ہو رہا ہے) (۲) دوسرا یہ کہ کلام کو کاذب ہونے سے بچانا، جیسے: وما خلقنا السماء والارض وما بینهما لاعبین (لاعبین نہ ہو تو نعوذ باللہ اللہ کا عدم خالق ہونا لازم آئے گا جو جھوٹ ہے)

قصر:

قصر کا مطلب ایک چیز کو دوسری چیز کے ساتھ مخصوص طریقے پر خاص کرنا، جیسے: ان هذا الا

ملک کریم۔

قصر کی باعتبار ذات کے اولا دو قسمیں ہیں: (۱) حقیقی (۲) اضافی۔

قصر حقیقی: وہ قصر ہے جس میں تخصیص حقیقتا اور واقعی ہو۔ جیسے إنما الله واحد

قصر اضافی: وہ قصر ہے جس میں تخصیص کسی دوسری شئی کے لحاظ سے ہو۔ جیسے وما محمد إلا رسول

قصر حقیقی اور اضافی دونوں میں سے ہر ایک کی دو دو قسمیں ہیں:

(1) قصر موصوف علی الصفت (۲) قصر صفت علی الموصوف

قصر موصوف علی الصفت یہ ہے کہ موصوف کو کسی صفت کے ساتھ خاص کر دیا جائے جیسے إنما الله اله واحد (حقیقی) وما محمد إلا رسول (اضافی)۔

قصر صفت علی الموصوف یہ ہے کہ صفت کو کسی موصوف کے ساتھ خاص کر دیا جائے۔ جیسے لا إله إلا الله (حقیقی) إنما يتذكر اولوا الألباب (اضافی) احوال مخاطب کے اعتبار سے قصر کی تین قسمیں ہیں: (۱) قصر افراد (۲) قصر تعیین (۳) قصر قلب

قصر افراد: اس وقت ہوتا ہے جب کہ مخاطب شرکت کا اعتقاد رکھے۔ جیسے ما من إله إلا الله.

قصر تعیین: اس وقت ہوتا ہے جب کہ مخاطب متردد ہو۔ جیسے وما محمد إلا رسول

قصر قلب: اس وقت ہوتا ہے جب کہ مخاطب برعکس اعتقاد رکھے۔ جیسے انما نحن مصلحون۔

وصل و فصل:

وصل: ایک جملہ کا دوسرے جملہ پر عطف کرنا۔ فصل: دو جملوں کے درمیان عطف کو چھوڑ دینا۔

وصل کے مواقع: دوموقعہ پر وصل (عطف) واجب ہے۔

(1) دونوں میں کمال انقطاع ہو (یعنی خبریہ انشائیہ ہونے میں مختلف ہو) اور عطف نہ کرنے کی صورت میں خلاف مقصود کا وہم پیدا ہوتا ہے جیسے: لا ویرحمک اللہ (اگر بیچ میں واو عاطفہ نہ ہوتو بددعا ہوجائے)

(۲) دونوں جملوں میں توسط بین الکمالین ہو اور جہت جامع ہو۔ جیسے: فلیضحکو اقلیلا ولیبکوا کثیرًا۔ (دونوں جملے انشائیہ ہیں اور جہت تقابل وتماثل ہے)

پانچ مواقع پر فصل (ترک عطف) واجب ہے۔

(1) دونوں جملوں میں کمال اتصال ہو۔ جیسے فمهل الکافرین امهلهم رویدا۔ دونوں جملے انشائیہ ہیں دوسرا جملہ پہلے کی تاکید ہے۔

(۲) دونوں جملوں میں کمال انقطاع ہو۔ جیسے **واقسطوا إن الله يحب المقسطين** -(پہلا جملہ انشائیہ، دوسرا خبریہ ہے اس لیے کمال انقطاع ہے)

(۳) دونوں جملوں میں شبہ کمال اتصال جیسے **و ما ابرئ نفسي ان النفس لامارة بالسوء.**

(۴) دونوں جملوں میں شبہ کمال انقطاع ہو۔ جیسے **قال قائل منهم إني كان لى قرين، يقول إنك لمن المصدقين**

(۵) دونوں جملوں میں توسط بین الکمالین ہو اور عطف سے کوئی مانع ہو۔ جیسے **إنما نحن مستهزؤون الله يستهزئ بهم** -(پہلے جملے میں حصر ہے جو دوسرے جملے میں مقصود نہیں۔ یہی مانع عطف ہے)۔

ایجاز، اطناب اور مساوات:

مافی الضمیر کے ادائیگی کے تین طریقے ہیں: ایجاز، اطناب اور مساوات۔

ایجاز: کسی مفہوم کومختصر عبارت میں ادا کرنا، بشرطیکہ مخل بالفہم نہ ہو۔ جیسے هن لباس لكم وانتم لباس لهن

اطناب: کسی مفہوم کو زائد عبارت میں ادا کرنا بشرطیکہ وہ زیادتی فائدہ کے لیے ہو جیسے خلقت بیدی۔

مساوات: کسی مفہوم کومفہوم کے برابر الفاظ کے ساتھ ادا کرنا جیسے ان الدين عند الله الإسلام

ایجاز کی دو قسمیں ہیں: (۱) ایجاز قصر (۲) ایجاز حذف

ایجاز قصر: بڑے معنی کومختصر عبارت میں بغیر کسی حذف کے بیان کر دینا، جیسے ولكم في القصاص حياة

(۲) ایجاز حذف کسی مفہوم کومختصر عبارت میں حذف کے ساتھ ادا کرنا۔ جیسے واسأل القرية (أي أهلها)-

ایجاز کے فائدے: حفظ کی آسانی فہم سے قریب کرنا، مقام کی تنگی، مخاطب سے کسی امر کو چھپانا، اکتاہٹ دور کرنا۔

اطناب کی قسمیں: اطناب کی بہت سی قسمیں ہیں، چند مشہور قسمیں ذکر کی جارہی ہیں:

(۱) عام کے بعد خاص کو ذکر کرنا یا اس کے برعکس جیسے قل من كان عدوا لله وملائكته ورسله و جبريل و ميكال (خاص) أن يشهد عليهم سمعهم وأبصارهم وجلودهم . (عام)

(۲) ابہام کے بعد کسی امر کو واضح کرنا، تا کہ ذہن میں جم جائے۔ جیسے وقضينا إليه ذلك الأمر أن دابر هؤلاء مقطوع مصبحين

(۳) تکرار (مکرر لانا): جیسے كلا سوف تعلمون ثم كلا سوف تعلمون.

(۴) اعتراض (جملہ معترضہ لانا): ویجعلون لله البنات سبحانه.

(۵) تزییل (تاکید کے لیے ایک جملہ کے بعد دوسرے جملہ کو لانا جو پہلے جملہ کے معنی پر مشتمل ہو جیسے یخلق ما یشاء وھو العلیم القدیر .(وھو العلیم القدیر سے تخلق ما یشاء کی تاکید ہو رہی ہے)

(۶) احتراس (خلاف مقصود وہم کو دور کرنا) جیسے ویطعمون الطعام علی حبه مسکینا ویتیما واسیرا.

(۷) ایغال (کسی مفہوم ومعنی میں مبالغہ پیدا کرنا) جیسے اتبعوا من لا یسئلکم اجرا وھم مھتدون .

(۸) تمیم (کسی نکتہ کے واسطے کوئی جملہ لانا): جیسے ویؤثرون علی أنفسھم ولو کان بھم خصاصة .(آخری جملے سے ان کی مدح میں اضافہ ہو گیا)

علم البیان:

علم بیان وہ علم ہے جس کے ذریعے ایک مفہوم کو مختلف طریقوں سے ادا کرنے کا ڈھنگ معلوم ہو۔

اس علم میں تین چیزوں سے بحث کی جاتی ہے: (۱) تشبیہ (۲) مجاز (۳) کنایہ۔

تشبیہ:

ایک امر کو دوسرے امر کے ساتھ شامل کرنا کسی وصف میں کسی غرض کی بنیاد پر، جیسے کانھن الیاقوت والمرجان

تشبیہ میں تین امور سے بحث کی جاتی ہے: (۱) ارکان تشبیہ (۲) اقسام تشبیہ (۳) اغراض تشبیہ

ارکان تشبیہ چار ہیں : (۱) مشبہ (۲) مشبہ بہ (۳) وجہ تشبیہ (۴) کلمہ تشبیہ۔ جیسے مذکورہ مثال میں حور مشبہ ہے، یاقوت مشبہ بہ، صفائی اور چمک وجہ تشبیہ، کَاَنَّ کلمہ تشبیہ۔

اقسام تشبیہ : مشبہ اور مشبہ بہ کے اعتبار سے تشبیہ کی چار قسمیں ہیں : (۱) مشبہ اور مشبہ بہ دونوں مفرد ہو۔ (۲) دونوں مرکب ہو۔ (۳) مشبہ مفرد اور مشبہ بہ مرکب ہو۔ (۴) مشبہ مرکب اور مشبہ بہ مفرد ہو۔

وجہ شبہ کے اعتبار سے تشبیہ کی چار قسمیں ہیں : (۱) تمثیل (۲) غیر تمثیل (۳) مفصل (۴) مجمل۔

کلمہ تشبیہ ہے اعتبار سے تشبیہ کی دو قسمیں ہیں : (۱) مرسل : وہ تشبیہ جس میں کلمہ تشبیہ مذکور۔ (۲) مؤکد جس میں کلمہ تشبیہ محذوف ہو۔

اغراض تشبیہ چھ ہیں : (۱) مشبہ کے ممکن ہونے کو بتانا (۲) مشبہ کے حال اور وصف کو بیان کرنا (۳) مشبہ کے حال کی مقدار ہو بیان کرنا (۴) مشبہ کے حال کو ثابت اور پختہ کرنا (۵) مشبہ کے اچھائی اور خوبصورتی کو بیان کرنا۔ (٦) مشبہ کے قبح اور بدصورتی کو بیان کرنا۔

مجاز :

استعمال کے اعتبار سے لفظ کی دو قسمیں ہیں: (۱) حقیقت (۲) مجاز۔

حقیقت وہ لفظ جو اپنے معنی موضوع لہ پر دلالت کرے۔ مجاز وہ لفظ جو معنی غیر موضوع پر دلالت کرے۔

مجاز کی دو قسمیں ہیں: (۱) مجاز لغوی (۲) مجاز عقلی

استعارہ :

علاقہ مشابہت کی وجہ سے لفظ کو معنی غیر موضوع لہ میں استعمال کرنا جیسے: لتخرج الناس من

الظلمت الی النور۔

اقسام استعارہ تین ہیں: (۱) تصریحیہ (۲) مکنیہ (۳) تخییلیہ

مجاز مرسل:

کسی لفظ کو معنی غیر موضوع لہ میں استعمال کرنا مشابہت کے علاوہ کسی اور علاقے کی بناء پر۔

مجاز مرسل کے علاقے بہت ہیں، چند یہ ہیں: (۱) سببیت، سبب مراد لینا مسبب مراد لینا) (۲) مسببیت، مسبب بول کر سبب مراد لینا۔ (۳) کلیت، کل بول کر جزء مراد لینا۔ (۴) جزئیت، جزء بول کر کل مراد لینا۔ (۵) حالیت، حال بول کر محل مراد لینا۔ (۶) محلیت، محل بول کر حال مراد لینا۔

مجاز مرکب:

وہ لفظ مرکب ہے جو معنی غیر موضوع میں مستعمل ہو کسی علاقے کی بناء پر، جیسے: فتزل قدم بعد ثبوتھا (ناکامی اور عدم استقامت کو قدم پھسلنے سے تعبیر کیا)

مجاز عقلی:

(متکلم کے ظاہری حالت کو دیکھتے ہوئے) فعل یا شبہ فعل کی نسبت فاعل حقیقی کے علاوہ کی طرف کر دینا، جیسے: ان یرسل الریاح مبشرات۔

کنایہ:

کسی لفظ سے اس کے لازمی معنی مراد لینا، جیسے: حمالۃ الحطب (اس سے کنایہ چغل خور مراد ہے)

علم البدیع:

وہ علم ہے جس کے ذریعے مقتضی حال کے مطابق کلام کو خوبصورت بنایا جائے۔

اس کی دو قسمیں ہیں: (۱) محسنات معنویہ، وہ طریقے جن سے معنی میں حسن پیدا ہو۔ (۲)

محسنات لفظیہ، وہ طریقے جن سے لفظ میں حسن پیدا ہو۔

محسنات معنویہ بہت زیادہ ہیں، ان میں چند یہ ہیں:

(۱) توریہ: کسی لفظ کو ذکر کر کے اس کے بعیدی معنی کو مراد لینا۔ جیسے: إني سقيم، بل فعله كبيرهم (سقیم سے جسمانی بیماری کے بجائے دل کا مغموم ہونا مراد ہے)

(۲) طباق دو متضاد معنی والے لفظ کو جمع کر دینا۔ جیسے هو الاول و الآخر والظاهر والباطن

(۳) مقابلہ دو یا زائد مفہوم کو ذکر کیا جائے، پھر اس کے مقابل کو لایا جائے۔ فأما من اعطى واتقى وصدق بالحسنى، وأما من بخل و استغنى، وكذب بالحسنى

(٤) ایہام تضاد: متکلم دو کلموں کے درمیانی تضاد کا وہم دلائے۔ جیسے: يضله و يهديه إلى عذاب السعير

(٥) تدبیج: متکلم چند مقابل رنگوں کو ذکر کرے پھر اس سے کنایہ ذات مراد ہو۔ جیسے يوم تبيض وجوه وتسود وجوه (سفید چہرے سے مومن اور سیاہ چہرے سے مراد کافر ہے)

(٦) مراعات نظیر: متکلم کسی امر کو اس کے مناسبات کے ساتھ ذکر کرے جیسے والشمس والقمر بحسبان

(۷) استخدام: لفظ کو اولا ایک معنی کے لیے ذکر کرنا، پھر جب اس کی طرف ضمیر لوٹائی جائے یا اسم اشارہ کے ذریعے اشارہ کیا جائے تو دوسرا معنی مراد ہو۔ جیسے فمن شهد منكم الشهر فليصمه (الشہر سے مراد چاند ہے اور اس کی ضمیر فلیصمہ سے مراد زمانہ رمضان ہے)

(۸) جمع: مختلف امور کو ایک حکم میں جمع کر دینا۔ جیسے إنما أموالكم وأولادكم

فتنة.

(۹) تفریق چند امور کو ذکر کرنا، پھر ان کے درمیان فرق بیان کرنا۔ جیسے: وما يستوي البحران هذا عذب فرات سائغ شرابه وهذا ملح أجاج. (دو دریاؤں کا ذکر ہے پھر ایک کے میٹھا اور دوسرے کے کھارا ہونے کو بیان کیا گیا)

(۱۰) جمع مع التفریق: چند امور کو ایک حکم میں جمع کر کے فرق بیان کیا جائے۔ جیسے خلقتنی من نار وخلقته من طين

(۱۱) تقسیم کسی شي کی مکمل تقسیم ذکر کر دینا۔ جیسے والله خلق كل دابة من ماء، فمنهم من يمشي على بطنه، ومنهم من يمشي على رجلين، ومنهم من يمشي على أربع. (اس آیت میں چوپائے کی ساری قسمیں ذکر کر دی گئیں)

(۱۲) جمع مع التقسیم کسی شئ کی ساری قسموں کو ذکر کر کے ان کے درمیان تقسیم کرنا۔ جیسے الله يتوفى الأنفس حين موتها والتي لم تمت في منامها فيمسك التي قضى عليها الموت ويرسل الأخرى إلى أجل مسمى.

(۱۳) تاکید المدح بما یشبہ الذم: کسی شئ کی اس انداز سے تعریف کرنا جو مذمت کے مشابہ ہو۔ جیسے وما نقموا منهم إلا أن يؤمنوا بالله العزيز الحميد.

(١٤) حسن تعلیل کسی شئ کے لیے علت غیر حقیقیہ کا دعوی کرنا۔ جیسے: إن بيوتنا عورة.

(١٥) ائتلاف اللفظ مع المعنی: الفاظ مفہوم کے موافق ہو۔ (یعنی غم کے موقعہ پر مہموسہ والے الفاظ، اظہار شان کے موقع پر مجہورہ والے الفاظ لائے جائیں) جیسے تالله تفتئو تذكر يوسف. (یہ موقعہ غم ہے اس لیے حروف مہموسہ میں سے تا کو ذکر کیا گیا)

محسنات لفظیہ:

محسنات لفظیہ بہت ہیں: چند مشہور صورتیں یہاں ذکر کی جارہی ہیں۔

(۱) جناس: دو لفظوں کا صرف نطق میں مشابہ ہونا۔

اس کی دو قسمیں ہیں: (۱) تام (۲) ناقص

جناس تام: دونوں لفظ، حروف کی تعداد، ہیئت، نوعیت، ترتیب میں موافق ہوں جیسے

ويوم تقوم الساعة يقسم المجرمون مالبثوا غير ساعة.

جناس ناقص دونوں لفظ حروف کی تعداد یا ہیئت یا نوعیت یا ترتیب میں مختلف ہو۔ جیسے

فاما اليتيم فلا تقهر وأما السائل فلا تنهر .

(۲) سجع: نثر کے دونوں جملے کا آخری حرف میں موافق ہونا۔ جیسے: **مالك يوم الدين إياك نعبد وإياك نستعين .**

(۳) اقتباس: متکلم اپنے کلام میں قرآن یا حدیث کے کسی ٹکرے کو شامل کرے۔ جیسے: **الشيوعية إنهدرت، لأن الباطل كان زهوقا ۔۔أطلبوا العلم لوجه الله تعالى لأن الأعمال بالنيات .**

(٤) عقد: کوئی شاعر اپنے نظم میں نثریہ کلام کے مفہوم کو ذکر کرے۔ جیسے

وكانت في حياتك لى عظات

فانت اليوم اوعظ منك حيا

اسکندر بادشاہ کی وفات پر کسی نے کہا تھا **انت اليوم اوعظ من أمس** .اس کا مفہوم شعر میں مذکور ہے۔

(۵) حل: متکلم اپنے نثریہ کلام میں کسی شعر کے مفہوم کو ذکر کرے۔ جیسے **نحن المرضى ونحن العواد.**

کسی شاعر نے کہا **إذا مرضنا اتينا كم نعود كم.** اس شعر کا مفہوم نثر میں بیان کیا گیا۔

(٦) تضمین کوئی شاعر اپنے اشعار کے ساتھ دوسرے کے اشعار ملا لے۔ جیسے

ایاک یعنی من غدا متناشدًا

بیتا رووه علی مرور الاعصر

و إذا تباع کریمة أو تشتری

فسواک بائعها وانت المشتری

(۷) سرقات الکلام: کوئی شاعر یا ناثر غیر کی عبارت کو یا پورے مفہوم کو لے لے۔

(۸) تصدیر: دونوں جملے یا دونوں اشعار ابتداء اور انتہاء میں موافق ہوں۔ جیسے: و تخشی الناس واللہ أحق أن تخشاہ

(۹) تشابہ الاطراف: متکلم (شاعر یا ناثر) اپنے کلام اول کو جس کلمہ پر ختم کرے دوسرے کی ابتداء اسی سے کرے۔ جیسے: مشکوۃ فیها مصباح المصباح في زجاجة.

(۱۰) تشریع شاعر اپنے شعر کی بنیاد دو قافیوں پر رکھے۔ جیسے

لا یعرف الشوق إلا من یکابدہ

ولا الصبابة إلا من یعانیها

اس شعر میں الا پر بھی وقف صحیح ہے اور مفہوم مکمل ہو جاتا ہے۔

(۱۱) عکس: متکلم کوئی کلام کرے، پھر اس کو پلٹ دے۔ جیسے: یخرج الحي من المیت ویخرج المیت من الحي.

(۱۲) تردید: متکلم ایک لفظ کو مکرر ذکر کرے، اور ہر مرتبہ جدید معنی دے۔ جیسے: ویوم تقوم الساعة یقسم المجرمون ما لبثوا غیر ساعة.

(۱۳) قلب: متکلم کوئی کلام پیش کرے اس طور پر کہ سیدھا اور الٹا دونوں برابر ہو۔ جیسے: وربک فکبر (أرانا الا إله هلالا أنارا)

(۱٤) ترتیب: متکلم چند اوصاف یا افعال کوترتیب وار ذکر کرے۔جیسے: **والعادیات ضبحا فالموريت قدحا، فالمغيرات صبحا**

(۱٥) توزیع متکلم اپنے کلام میں کسی مخصوص حرف کوتمام الفاظ میں لازم کرے۔جیسے **فإذا هم مبصرون، وإخوانهم يمدونهم في الغي ثم لا يقصرون**. (پہلی اور دوسری آیت میں آخری چار وحروف ایک ہیں)

فصل سوم: الفرقان الحق کا اجمالی جواب

اس کتاب کا سرے سے جواب نہیں بنتا۔ کیونکہ تمام قرآن کی آیات کو اٹھا کر اپنی طرف سے الفاظ میں ردو بدل اور آگے پیچھے کر کے عبادت بنائی ہے، پھر ان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو مراد لیا ہے۔ یعنی قرآن میں جو آیات مشرکین و کفار کے متعلق نازل ہوئے ہیں یہ ان کو اٹھا کر رسول اللہ اور مسلمانوں پر محمول کرتا ہے، اس کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں۔ اس لئے جواب تو تب بنتا جب یہ اپنی طرف سے کوئی کلام پیش کرتا۔ جب سارا کلام ہی قرآن مجید سے اٹھایا ہے تو ہم کیا جواب دے اس کا۔

اور پھر کیا اس بات کا جواب ہوسکتا ہے کہ کوئی کہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات معاذ اللہ غلط کہا کہ زنا مت کرو، یا جہاد کرو، تو ان کا کیا جواب ہوسکتا ہے، اس لئے مصنف نے گو یا معاذ اللہ خود کو نبی ظاہر کیا ہے، اور اپنی کتاب فرقان حق کو وحی شمار کیا ہے اور صیغے والفاظ وہی استعمال کرتا ہیں جو قرآن میں مذکور ہیں۔ یعنی جیسے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ''انا نحن نزلنا الذکر وانا له لحافظون '' اب یہ قرآن مجید سے متعلق ہیں، اور کہنے والا اللہ تعالیٰ ہے، مصنف نے اس آیت کو اٹھا کر کتاب سے مراد فرقان حق لیا اور گو یا یہ بات ان پر نازل ہوئی ہے۔

تو ایسے جاہل کا کیا جواب بن سکتا ہے، جیسے آج اگر کوئی اٹھ کر کہے قرآن کی فلاں آیات رسول اللہ پر نازل نہیں ہوا مجھ پر ہوا ہے اور فلاں آیات سے مراد میں ہوں رسول اللہ نہیں، تو اس جاہل کو لوگ منہ بھی نہیں لگائیں گے کیونکہ سب کو پتہ ہے قرآن کا نزول آج سے چودہ سو سال قبل ہوا ہے اور یہ جاہل اب دعویٰ کر رہا ہے، اس کی کیا اہمیت۔

اس لئے فقط بطور نمونہ اتمام حجت کے لئے اس کا مختصر جواب دیا جارہا ہے، ورنہ سرے سے اس کا جواب ہی نہیں بنتا۔

فصل چہارم: قرآن سے سرقات

سورتوں کی سرقہ:

قرآن سے سرقہ شدہ سورتوں کے نام ملاحظہ ہو:

(۱) سورۃ الفاتحہ (۲) سورۃ النور (۳) سورۃ التوحید (قرآن میں سورۃ الاخلاص کا ایک نام سورۃ التوحید ہے) سورۃ الفرقان (۴) سورۃ القدر (۵) سورۃ المؤمنین (٦) سورۃ النساء (۷) سورۃ الطلاق (۸) سورۃ المائدہ (۹) سورۃ المنافقین (۱۰) سورۃ الانبیاء (۱۱) سورۃ الملوک (قرآن میں سورۃ الملک کے نام سے معروف ہے) (۱۲) سورۃ الاضحیٰ (۱۳) سورۃ الکافرین۔

من وعن آیات کی سرقہ:

مصنف اپنی کتاب میں بہت سارے جگہوں پر قرآن سے من وعن آیات نقل کر کے سرقہ میں میدان مار لیا ہے ملاحظہ فرمائیں:

(۱) لکھتے ہیں:

"فجاء الحق وزهق الباطل" (سورۃ النور آیت ۱)

یہ سورۃ بنی اسرائیل آیت ۸۱ لی ہے:

"قُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ ؕ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا"

(۲) لکھتے ہیں:

" والذين كذبوا بآيتنا واستكبروا عنها لاتفتح لهم ابواب السماء ولا يدخلون الجنة حتى يلج الجمل فى سم الخياط " (سورۃ المسیح آیت ۱۰)

یہ سورۃ الاعراف آیت ۴۰ سے لیا ہے:

" اِنَّ الَّذِیْنَ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا وَ اسْتَکْبَرُوْا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ وَ لَا یَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰی یَلِجَ الْجَمَلُ فِیْ سَمِّ الْخِیَاطِ ؕ وَ کَذٰلِکَ نَجْزِی الْمُجْرِمِیْنَ "

(۳) لکھتے ہیں:

" ومثل الذی کفروا کمثل الذی ینعق بما لا یسمع آلا دعاء ونداء صم بکم عمی فهم لایعقلون " سورۃ الکبائر آیت ۱۲)

یہ سورۃ البقرہ آیت ۱۷۱ سے لیا ہے:

" مَثَلُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا کَمَثَلِ الَّذِیْ یَنْعِقُ بِمَا لَا یَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّ نِدَآءً ؕ صُمٌّۢ بُکْمٌ عُمْیٌ فَهُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ" "

(۴) لکھتے ہیں:

" ان الذین کفروا وصدوا عن سبیلنا ثم ماتوا وهم کفار فلن یغفر لهم وهم فی الآخرۃ من الخاسرین " (سورۃ الکبائر آیت ۱۵)

یہ بھی سوائے کچھ الفاظ کے تبدیلی کے من وعن سورۃ محمد آیت ۳۴ سے لیا ہے: " اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَ صَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ثُمَّ مَاتُوْا وَ هُمْ کُفَّارٌ فَلَنْ یَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ "

مفہومِ آیات کی سرقہ:

بعض جگہ قرآن کے الفاظ کو تو پیش نہیں کیا البتہ ایک دو لفظ یا پھر بغیر الفاظ قرآن اس کے مفہوم کو اپنے الفاظ میں بنا کر پیش کیا ہے:

(۱) لکھتے ہیں:

" فیایها الذین ضلو من عبادنا توبوا وآمنوا فابواب الجنة مفتوحة

للتائبین " (سورۃ الفاتحہ آیت ۷)

یہ مفہوم قرآن مجید کے مختلف مقامات سے لیا ہے۔ جیسے قرآن میں بہت جگہیں " یاایہا الذین آمنوا " کا ذکر ہے۔اورسورۃ التحریم میں بھی اس جیسی آیت مذکور ہے:

" یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْۤا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا " (سورۃ التحریم آیت ۸)

اورسورۃ ص آیت 50 میں ہے " جَنّٰتِ عَدْنٍ مُّفَتَّحَةً لَّهُمُ الْاَبْوَابُ "

(۲) لکھتے ہیں:

" فایھا الذین ضلوا من عبادنا ، لقد جائکم الفرقان الحق یبین لکم الرشد من الغیّ " (سورۃ النور آیت ٦)

یہ مفہوم بھی قرآن سے اخذ کیا ہے:

" یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا یُبَیِّنُ لَكُمْ عَلٰى فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا جَآءَنَا مِنْۢ بَشِیْرٍ وَّ لَا نَذِیْرٍ " سورۃ المائدہ آیت ۱۹)

مصنف نے ''رسول'' کے جگہ ''الفرقان الحق'' لکھ دیا۔

(۳) لکھتے ہیں:

" فلا تقولوا ما لیس لکم بہ من علم " (سورۃ التوحید آیت ۲)

یہ مفہوم سورۃ النور آیت ۱۵ سے اخذ کیا ہے:

" اِذْ تَلَقَّوْنَهٗ بِاَلْسِنَتِكُمْ وَ تَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِكُمْ مَّا لَیْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ وَّ تَحْسَبُوْنَهٗ هَیِّنًا ٭ۖۗ وَّ هُوَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِیْمٌ "

(۴) لکھتے ہیں:

" واذا تتلی علیھم آیات الفرقان الحق قالوا قد سمعنا لو شاء لقلنا

مثل هذا ان هذا الا اساطیر الاولین " (سورۃ الفرقان آیت ٦)

یہ مفہوم سورۃ المطففین ١٣ سے اخذ شدہ ہے:

" اِذَا تُتْلٰی عَلَیْهِ اٰیٰتُنَا قَالَ اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ "

یہ آیات دراصل الفاظ کے کانٹ چھانٹ کے سرقہ میں آتے ہیں، مگر یہاں چونکہ ان کا تعلق مفہوم آیاتِ قرآن سے ہیں اس لئے نقل کیا۔ ورنہ پوری کتاب میں انہوں نے قرآن کی الفاظ کو آگے پیچھے کر کے اپنی طرف سے معنی اخذ کیا ہے۔

الفاظ کے کانٹ چھانٹ میں سرقہ:

کچھ الفاظ قرآن سے لے کر اور کچھ اپنی طرف سے بڑھا کر آیات کو ترتیب دی ہے۔

(١) لکھتے ہیں:

" فهو آب لم یلد ۔ کلمة لم یفرد " (البسمله آیت 43)

اس میں قرآن مجید، سورۃ الاخلاص سے مدد لیا ہے ملاحظہ فرمائیں:

" قل هو الله احد الله الصمد لم یلد و لم یولد و لم یکن له کفوا احد "

(٢) لکھتے ہیں:

" واقتربت الساعة وانشق الباطل فلا عاصم الیوم من امرنا فویل للمفترین " (سورۃ النور آیت ٢)

اس آیت کو تین سورتوں سے لیا ہے۔ سورۃ القمر آیت نمبر ١ میں ہے:

" اقتربت الساعة وانشق القمر "

سورۃ ھود آیت ٤٣ میں مذکور ہے:

" قَالَ لَا عَاصِمَ ا
لْیَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ "

قرآن میں بہت سے مقامات پر یہ جملہ موجود ہے " **فویل للمکذبین** " اور کہیں " **ویل للمطففین** " ۔

(۳) لکھتے ہیں:

والذین جعلوا اصابعهم فی آذانهم لئلا یسمعوا کلمة الحق فهم المغضوب علیهم وهم الضالون " (سورۃ النور آیت ۵)

اس کو قرآن کی دو سورتوں سے لیا ہے:

" **يَجْعَلُوْنَ اَصَابِعَهُمْ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ ؕ وَ اللّٰهُ مُحِيْطٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ** " (سورۃ البقرہ آیت ۱۹)

" **غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ** " (سورۃ الفاتحہ آیت ۷)

(۴) لکھتے ہیں:

" **فلا اکراہ فی الدین أفلا تؤمنون** " (سورۃ النور آیت ۶)

یہ بھی سورۃ البقرہ آیت ۲۵۶ سے لیا ہے ملاحظہ فرمائیں " **لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۣ ڐ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ** " اور اخیر جملہ " **أفلا تؤمنون** " قرآن میں کئی مقامات پر اس جیسے الفاظ سے مذکور ہے، کہیں " **أفلا تعقلون** " ہے، کہیں " **أفلا تذکرون** " ہے، کہیں " **أفلا تتقون** " ہے، کہیں " **أفلا ینظرون** " ہے۔

(۵) لکھتے ہیں:

" **انا انزلناه نورا علی قلب صفینا فخطه کلما باعیننا والقاه فی اسماعکم وابصارکم وفی قلوبکم وبین ایدیکم لیطهرکم من الکفر ویخرجکم من الظلمات الی النور لعلکم تهتدون** " (سورۃ النور آیت ۷)

شروع کے جملے قرآن کے مختلف آیات سے لی ہے، جیسے سورۃ یوسف آیت ۲ میں موجود

ہے: "اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ"۔

اور کچھ سورۃ ابراہیم آیت نمبر ا سے لیا ہے:

"كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ "

(۶) لکھتے ہیں:

" لقد افک المفترون الذین یرددون قول البهت وخاب کل جبار عنید " (سورۃ السلام آیت ۵)

آخری جملہ سورۃ ابراہیم آیت نمبر ۱۵ سے لیا ہے :

" وَ اسْتَفْتَحُوْا وَ خَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ"

(۷) لکھتے ہیں:

" ومنکم فئة قست قلوبهم من بعد ذلک فهی کالحجارة او اشد قسوة وان من الحجارة لما یتفجر منه الانهار فتوبوا وارحموا انفسکم لعلکم ترحمون وتحشرون مع الصالحین " (سورۃ السلام آیت ۹)

یہ آیت قرآن مجید سورۃ البقرہ آیت ۷۴ سے لیا ہے ملاحظہ ہو:

" ثُمَّ قَسَتْ قُلُوبُكُم مِّنۢ بَعْدِ ذَٰلِكَ فَهِىَ كَٱلْحِجَارَةِ أَوْ أَشَدُّ قَسْوَةً ۚ وَإِنَّ مِنَ ٱلْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ ٱلْأَنْهَٰرُ ۚ وَإِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ ٱلْمَآءُ ۚ وَإِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ ٱللَّهِ ۗ وَمَا ٱللَّهُ بِغَٰفِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ "

(۸) لکھتے ہیں:

" وانا اعلم بمن ضل عن السبیل وانا اعلم بالمهتدین " (سورۃ التوحید آیت ۲)

یہ سورۃ القلم آیت ۷ سے لیا ہے:

" اِنَّ رَبَّکَ ہُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِیْلِہٖ ۚ وَ ہُوَ اَعْلَمُ بِالْمُہْتَدِیْنَ "

(۹) لکھتے ہیں:

" فطهروا نفوسكم من نجس الشرک فذلكم خير لكم" (سورة التوحيد آیت ۳)

اخیر جملہ قرآن میں مختلف مقامات پر موجود ہے جیسے سورۃ النور آیت ۲۷ میں ہے " ذٰلِکُمْ خَیْرٌ لَّکُمْ لَعَلَّکُمْ تَذَکَّرُوْنَ " اور سورۃ الجمعۃ آیت ۹ میں بھی موجود ہے۔

(۱۰) لکھتے ہیں:

" ولاتقربوا الزنى انه كان فاحشة المؤمنين وآفة المتقين " (سورة التوحيد آیت ۴)

یہ جملہ بھی قرآن مجید سے لیا ہے سورۃ بنی اسرائیل آیت ۳۲ میں مذکور ہے" وَ لَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓی اِنَّہٗ کَانَ فَاحِشَۃً ؕ وَ سَآءَ سَبِیْلًا "

(۱۱) لکھتے ہیں:

" فاتبعه الذين فى قلوبهم زيغ واما الراسخون فى العلم من عبادنا الصالحين فيعلمون تاويلها ويعلمون انها ليست من عندنا ولو كانت من عندنا لما وجدوا فيها اختلافا كثيرا ولا نسخا ولا تبديلا " (سورة التوحيد آیت ۱۳)

یہ آیت اور مفہوم آیت سورۃ آل عمران آیت ۷ سے لیا ہے:

"فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِہِمْ زَیْغٌ فَیَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَہَ مِنْہُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَۃِ وَ ابْتِغَآءَ تَاْوِیْلِہٖ ۚ وَ مَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَہٗۤ اِلَّا اللّٰہُ ۘ وَ الرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ یَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِہٖ ۙ کُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ وَ مَا یَذَّکَّرُ اِلَّاۤ اُولُوا الْاَلْبَابِ "

(۱۲) لکھتے ہیں:

" ولیس البر ان تولوا وجوھکم قبل الجنوب والشمال ولکن البر من آمنا بنا وعمل بسنتنا التی تامر بالمعروف امرا مفعولا ونھی عن الفحشاء والمنکر والبغی نھیا مفعولا " (سورۃ المسیح آیت ۸)

اس کا کچھ حصہ سورۃ البقرہ آیت ۱۷۷ سے لیا ہے: " لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ وَ لٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ الْمَلٰٓئِكَةِ وَ الْكِتٰبِ وَ النَّبِيّٖنَ " اور کچھ حصہ سورۃ العنکبوت آیت ۴۶ سے لیا ہے: " اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْكَرِ "

(۱۳) لکھتے ہیں:

" فقد جائکم الفرقان الحق بالموعظة الحسنة وبالشفاء لما فی الصدور وبالھدی والرحمة " (سورۃ المسیح آیت ۱۱)

اس کا کچھ جملے سورۃ بنی اسرائیل آیت ۸۲ سے لیا: " وَ نُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ " اور کچھ جملے سورۃ النحل آیت ۱۲۵ سے لیا ہے " اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَ الْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَ جَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ "

(۱۴) لکھتے ہیں:

" یاایھا الذین آمنوا من عبادنا لن یرضی عنکم اھل البھتان حتی تتبعوا ملتھم " (سورۃ المسیح آیت ۱۲)

یہ سورۃ البقرہ آیت ۱۲۰ سے لیا ہے:

" وَ لَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَ لَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ "

(۱۵) لکھتے ہیں

" لکن الشیطان اضل منکم جبلا کثیرا افلا تعقلون " (سورة المسیح آیت ٢٦)

یہ سورۃ یس آیت ٦٢ سے لیا ہے:

" وَلَقَدْ اَضَلَّ مِنْكُمْ جِبِلًّا كَثِيْرًا ؕ اَفَلَمْ تَكُوْنُوْا تَعْقِلُوْنَ "

یہ صرف ابتدائی آٹھ سورتوں کی حالت تھی ، یہ سلسلہ یوں ہی چلتا ہے آخر سورت نمبر ٧٧ تک ،کل ٧٧ سورتیں ہیں ،ان میں سے آٹھ سورتوں کا جائزہ آپ کے سامنے ہیں ،ایسا ہی آخر تک یہ سلسلہ قائم ہے ،اگر ان کو آخر تک نقل کیا جائے تو شاید یہ طویل فہرست بن جائے گی ، بطور نمونہ یہ کچھ سرقہ شدہ عبارات آپ کے سامنے پیش کئے ،کسی کو تفصیلات دیکھنا ہو تو اصل کتاب کی طرف مراجعت کرے ۔

فصل پنجم: سورتوں کا جائزہ:

البسملہ کا جائزہ:

مصنف کتاب کا آغاز بسملہ سے کرتا ہے، جو بسم اللہ کا اختصار ہے، چنانچہ لکھتے ہیں کہ:

" (البسملة) قل: بسم الآب الكلمة الروح الآله الواحد الأوحد (١) مثلث التوحيد موحد التثليث ما تعدد (٢)فهو آب لم يلد (٣) كلمة لم يولد (٤) روح لم يفرد (٥)خلّاق لم يخلق (٦) فسبحان مالك الملك والقوة والمجد ، من أزل الأزل إلى أبد الأبد(٧)

(البسملہ) یہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا اختصار ہیں، جسے بطور اختصار" البسملہ" لکھا جاتا ہے، اور یہ اصطلاح اہل اسلام کے ہاں ہیں، مگر مصنف اسے لاکر نہ جانے اس سے کیا مراد لیا ہے۔

قرآن سے سرقہ شدہ طرز وترتیب:

موصوف نے قرآن سے بہت سے اجزاء، عبارات سرقہ کیا ہیں، مگر اس کے ساتھ طرز و ترتیب بھی قرآن سے سرقہ کیا ہے، جیسے قرآن میں ہر سورت کی ابتداء میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ہے، اور ہر سورت کا نام ہے، اسی طرح مصنف نے بھی ہر سورت کو ایک نام دیا ہے، پھر اس کی ابتداء بسم اللہ کے طرز پر " بسم الآب الكلمة الروح الآله الواحد الأوحد" سے کیا ہے۔

مصنف کے بسملہ کا جائزہ:

موصوف ہر سورت کی ابتداء " بسم الآب الكلمة الروح الآله الواحد الأوحد" سے کرتا ہے۔اولاً اس کا حشر ملاحظہ فرمائیں۔

موصوف ابتداء تین ذات سے کررہا ہے، باپ یعنی خدا، کلمہ یعنی حضرت مسیح علیہ السلام، روح القدس یعنی حضرت جبرائیل علیہ السلام یا خدا کی متحرک قوت۔

یہ انتہائی غیر معقول ابتداء ہے، کیونکہ ان میں لازما تفاوت ہوگا، افضل وافضلیت میں، اگر افضل نہیں تو مصنف کو چاہیے تھا کہ کبھی باپ کے نام سے ابتداء کرتا اور کبھی کلمہ اور کبھی روح کے نام سے۔مگر وہ سب میں باپ کے نام سے ابتداء کیا ہے۔جس کا مطلب ان کے نزدیک باپ افضل ہے اور مقدم ہے۔

ابتداء ہمیشہ شخص معین یعنی ایسی ذات کے نام سے کیا جائے جو مفرد اور تنہاء ہو، جس کے افراد نہ ہو۔اس میں نہ تقدم کا سوال پیدا ہوتا ہے اور نہ افضلیت کا۔جیسے" بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" اس میں ذات ایک خدا ہے، اور وہ تنہاء ہے باقی اس کی صفات ہیں۔

اور موصوف کے اس ابتداء سے عقیدہ تثلیث بھی باطل ہوتا ہے۔کیونکہ گویا یہ تینوں الگ الگ ذات ہیں۔ ورنہ ایک ہی ذات سے ابتداء کرتا۔تین ذات گویا تین خدا ہیں اور تین خداؤں میں سے ابتداء آپ کس کے نام سے کریں گے؟ جس کے نام سے بھی کریں گے تفاوت وزیادتی لازم آئے گا، یعنی ایک کا دوسرے سے برتری لازم آئے گا جو خدا کے لئے محال ہے، یعنی جو خدا ہوگا وہ افضل ہی رہے گا اس سے اگر کوئی افضل رہا وہ خدا نہیں۔اگر ایک ہی خدا ہوتا تو فقط خدا کے نام سے آغاز کرتا نہ کہ تینوں کا نام الگ الگ واضح کرتا۔

اور" الالہ الواحد الأوحد "اس کو اگر تاکید تسلیم کیا جائے تو یہ فصاحت وبلاغت کے خلاف ہیں، کیونکہ یہاں اس کا مقتضی نہیں، تاکید وہاں لایا جاتا جہاں منکر موجود ہو۔جبکہ خدا کے وحدانیت میں تو سوائے عیسائیت کے یہودی و مسلم متفق ہیں۔ بلکہ خود عیسائی بھی کہتے ہیں ہم ایک خدا کے قائل ہیں کلمہ اور روح وہ خدا میں حلول کئے ہیں گویا وہ ایک ہی خدا ہے، اگرچہ یہ باطل نظریہ ہے اور ایک خدا نہیں بن سکتا بلکہ تین خدا الگ ہی مانتے ہیں۔مگر بقول ان کے اگر

خدا ایک ہی ذات ہیں تو پھر تاکید لانے کی کیا ضرورت؟ کیونکہ سب کے ہاں مسلم ہیں کہ خدا ایک ہی ہیں پھر " الاله الواحد الأوحد" چہ معنی دارد۔

اور پھر غور کرے" بسم الآب" باپ کے نام سے، یعنی ابتداء کرتا ہوں باپ کے نام سے جو خدا ہے۔ (اب) کتاب میں الف ممدودہ کے ساتھ لکھا ہے جو پانی کے معنی میں ہے (ملاحظہ ہو قاموس الکتاب صفحہ ۱) جبکہ اصل لفظ (اب) ہے، جو بقول صاحب قاموس الکتاب ارامی لفظ ہے جو خدا کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ (ملاحظہ ہو قاموس الکتاب صفحہ ۱۲) اگر باپ ہی خدا ہے تو آگے ''الکلمۃ'' کا کیا معنی ہے؟ اگر اس سے مراد حضرت عیسی علیہ السلام ہے تو پھر ابتداء خدا کے نام سے کر رہا ہے یا حضرت عیسی علیہ السلام کے نام سے؟ اگر خدا کے نام سے تو آگے جو حضرت عیسی علیہ السلام کا نام ہے اس کا مطلب وہ الگ ذات ہیں۔ جب وہ الگ ذات ہے تو پھر وہ بھی آپ کے ہاں خدا ہے، تو دو خدا ہوئے۔ اور تمہارے یہ کہنا کہ ''خدا ایک ہی ہے روح اور کلمہ اس میں حلول کئے ہیں گویا ایک ذات بن گیا'' یہ باطل ہوا۔ کیونکہ دو الگ ذات ثابت ہوئے۔ اگر حضرت عیسی علیہ السلام کے نام سے ابتداء نہیں تو پھر ان کے نام ذکر کرنے کی کیا ضرورت۔ فقط اب (باپ) کہتے۔

اور آگے لفظ ہے ''الروح'' اس سے کیا مراد ہیں؟ کیا یہ ایک ذات ہیں یا خدا کا جزء؟ اگر ذات ہیں تو اس کا معاملہ وہی ہے جو ماقبل مذکورہ ہوا۔ اور اگر خدا کا جزء ہے تو اس کو لانا بے فائدہ اور عبث ہے کیونکہ جب ابتداء خدا کی ذات سے ہوا تو پھر جزء کو لانے کی کیا ضرورت۔ یا تو اس کلمہ کو یہاں عبث تسلیم کرنا پڑے گا یا پھر روح کو الگ ذات تسلیم کرنا پڑے گا، کیونکہ ابتداء جزء سے نہیں کیا جاتا بلکہ ذات سے کیا جاتا ہے۔ اور ذات ایک ہی ہے پھر اس کو دوبارہ لانا لایعنی ہے۔

پھر کہا " الواحد الأوحد" یہ مذکر ہے جب کہ ماقبل" الکلمۃ الروح" مؤنث ہے،

دونوں میں مطابقت نہیں۔اور عدم مطابقت دال ہے اس بات پر کہ یہ الگ الگ ذوات ہیں۔

اور اس جملہ کی ترکیب بھی صحیح نہیں بنتی ، کیونکہ اگر مؤکد تاکید بنایا جائے تو کلام مقتضی الحال کے خلاف ہوگا (ایسے جگہ تاکید لایا جارہا ہے جہاں تاکید کی ضرورت نہیں) جو خلاف بلاغت ہیں۔اور دیگر تراکیب میں جملوں کا مطابقت نہیں بنتا۔

اگر عیسائی واقعی ایک خدا کے قائل ہیں ، اور تین نہیں مانتے پھر وہ فقط ایک خدا کا ذکر ہی کرے اور پھر اس جملہ کو یوں ہونا چاہیے تھا ''بسم الاب الواحد'' اس صورت میں جملہ بھی درست ہوگا اور ترکیب بھی۔

دوسری آیت ہے " مثلث التوحید موحد التثلیث ما تعدد " یعنی توحید کی تثلیث ،تثلیث کی وحدت ہے، جو کثیر نہیں ہے۔ یہ عجیب تضاد ہے،تثلیث کوتوحید کہہ رہا ہے اور توحید کو تثلیث ۔یعنی کے مصنف کے ہاں دو تین ہیں اور تین دو ہے۔حالانکہ اہل علم کے ہاں یہ محال و ممتنع ہے۔

ماقبل میں کہا کہ ابتداء باپ کلمہ اور روح کے نام سے، تین نام ذکر کیا، اور یہاں کہہ رہا ہے کہ توحید کی تثلیث ، تثلیت کی وحدت ہے۔یعنی تثلیث کا معنی وحدت ہے، اگر تثلیث کا معنی وحدت ہے تو تین کا نام ذکر کیوں کیا۔ وحدت کا معنی یہی ہے کہ ایک ہی ذات، جب ذات ایک ہے تو تین کو ذکر کرنے کا کیا مطلب۔

چوتھی آیت ہے " کلمة لم یولد " یہ ایک مبہم جملہ ہے، کیونکہ معلوم نہیں کلمہ سے مراد کون ہے۔اگر خداوند عالم ہے، تو وہ کلمہ نہیں ہے بلکہ وہ ایک ذات ہے۔ جو واجب الوجود ہے، اور پھر اس صورت میں ماقبل پہلی آیت بسملہ میں کلمہ سے مراد بھی خدا ہوگا۔اور اگر کلمہ سے مراد حضرت مسیح ہے تو وہ تو پیدا ہوا ہے، اس کی ماں حضرت مریم ہے، بائبل کی آیات اس بات پر شاہد باب اول میں وہ آیات پیش کیا گیا ہے۔اس صورت میں جملہ درست نہیں ہوگا۔

پانچویں آیت ہے" روح لم یفرد "یعنی وہ روح ہے اکیلا نہیں ہے۔ اگر روح سے مراد اللہ تعالیٰ ہے تو کیسے وہ اکیلا نہیں ہے، وہ تو اکیلا ہے تم بھی کہتے ہیں، ماقبل آیت میں بھی بتایا کہ تثلیث وحدت ہے۔ اگر وحدت ہے تو اس میں اللہ تعالیٰ بھی آ گیا تو وہ کیسے پھر اکیلا نہیں، اور پھر وحدت کا معنی کیا ہے۔ اور اگر اس سے مراد حضرت مسیح ہے تو وہ بھی تو اکیلا ہی ہے، اس کا کوئی ثانی یا شریک تو نہیں یا دوسرا مسیح تو نہیں۔ یا حضرت مریم یا روح القدس مراد ہو تب بھی وہ اکیلے ہیں زیادہ نہیں۔

چھٹی آیت ہے" خلّاق لم یخلق "یعنی وہ پیدا کرنے والا ہے وہ خود پیدا نہیں کیا گیا۔ خلاق سے کون مراد ہے، اگر اللہ تعالیٰ مراد ہے تو پھر معنی صحیح ہے، مگر اس سے عیسائی عقیدہ تثلیث کا رد ہوتا ہے، کیونکہ اگر اس میں کلمہ اور روح کو شامل کیا جائے تو پھر مطلب ہوگا کہ حضرت مسیح اور روح القدس بھی پیدا کرنے والا ہے۔ وہ پیدا نہیں کیئے گئے حالانکہ یہ عیسائی بھی مانتے ہیں وہ پیدا ہوئے ہے۔ اور اگر ان کو الگ تسلیم کیا جائے تو پھر عیسائیوں کا یہ کہنا کہ خدا ایک ہی ہے یہ دو خدا کا جزء ہے یا اس میں حلول کئیے ہیں اس کا کلمہ اور روح ہے، باطل ہے کیونکہ پھر وہ الگ ذات نہیں ہوئے، اور اگر وہ الگ ذات نہیں تو پھر ان کا پیدائش کیسے ہوا؟ اور پھر ان کا الگ الگ تذکرہ کیوں کیا جاتا ہے بلکہ پھر کلمہ اور روح کو ذکر ہی چھوڑ دیا جائے کیونکہ اب وہ خدا کا جزء یا اس میں حلول کئیے ہیں، اب تو ان کا ذکر ہی نہیں کرنا چاہیے کیونکہ ان کی ذاتیت اب ختم ہو گئی۔ مگر عیسائی تو ان کا الگ الگ نام لیتے ہیں اور الگ الگ تذکرہ کرتے ہیں اور ان کے لئے علیحدہ صفات مانتے ہیں حتی کہ حضرت مسیح کے لئے معجزات مانتے ہیں۔

سورۃ الفاتحہ کا حشر:

" هُوَذَا الفُرْقَانُ الْحَقُّ نوحِيهِ فَبَلِّغْهُ لِلضَّالِينَ منْ عِبادِنا وللناسِ كَافَّةً وَلَا تَخْشَ القَومَ المُعتَدِينَ (١) مهيمِن يَحْطِمُ سَيْفَ الظُّلْمِ بكفِّ

العدلِ ويَهدِي الظّالمينَ (۲) وَيَهْدِمُ صَرْحَ الكُفْرِ بيَدِ الإِيمَانِ ويشيد موئلا للتائبين (۳) وَيَنزِعُ غِلَّ الصَّدْرِ شَذى الْمَحَبَّةِ ويشفي نفوس الحاقدين (۴) ويُطَهّر نجس الزنى بماء العفة ويُبرئُ المسافحين (۵) وَيَفْضَحُ قَوْلَ الإِفْكِ بِصَوْتِ الحق ويكشف مكر المفترين (٦) فيأيها الذينَ ضَلُّوا مِنْ عِبَادِنا تُوبوا وآمِنوا فأبواب الجنة مفتوحة للتائبين (۷)"

پہلی آیت ہے " هُوَذَا الفُرْقَانُ الْحَقُّ نوحِيهِ فَبَلِّغْهُ لِلضَّالِينَ منْ عِبادِنا وللناسِ كَافَّةً وَلَا تَخْشَ القومَ المُعتَدِينَ " یعنی یہ حق کوواضح کرنے والا ہے جس کی طرف ہم وحی کرتے ہیں پس پہنچادو اسے گمراہوں کو ہمارے بندوں میں سے اور تمام لوگوں کواورآپ حد سے گزرنے والے قوم سے مت ڈر۔

کلمہ ''ذا'' حالت رفع میں ''ذو'' ہوتا ہے، اور یہاں چونکہ خبر واقع ہورہا ہے، اس لئے بجائے''ذا'' کے''هوذو'' ہونا چاہیے۔اوراس کا مطلب فرقان الحق یعنی حق کو باطل سے الگ کرنا اور واضح کرنے والا، ''نوحیہ'' جس کی طرف ہم وحی کرتے ہیں،جمع متکلم فعل مضارع کا صیغہ ہے،مگر فاعل کون ہے،اللہ تعالیٰ ہو ہی نہیں سکتا۔کیونکہ غیر نبی پر وحی نہیں ہوسکتا۔اوراگر الہام مرادلیا جائے تو اس صورت میں بھی فاعل خدا تعالیٰ نہیں ہوسکتا کیونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے معاذ اللہ ایسے الہام ہرگز نہیں ہوسکتا،جس میں کفریات ولغویات اورشرکیات ہو۔''ولاتخش المعتدین'' قرآن سے ماخذ ہے۔

ساتویں آیت ہے کہ " فيأيها الذينَ ضَلُّوا مِنْ عِبَادِنا تُوبوا وآمِنوا فأبواب الجنة مفتوحة للتائبين " یعنی اے وہ لوگ جو گمراہ ہوگئے ہمارے بندوں میں سے توبہ کرو اور ایمان لے آؤ پس جنت کے دروازے توبہ کرنے والوں کے لئے کھلے ہیں۔

یہاں تو موصوف فصاحت و بلاغت کا نام بدنام کیا۔ جب لوگ گمراہ ہو گئے اور توبہ تائب بھی نہیں ہوئے تو اگر وہ لوگ ایمان لے آئے اور توبہ کرے تو ان کے لئے جنت کے دروازے کھلے ہیں۔ یہاں تو موصوف کو تاکید لانا چاہیے تھا اور یوں کہنا چاہیے تھا کہ " فان ابواب الجنة مفتوحة للتائبين" کیونکہ ماقبل کلام میں انکاری اور راہ سے بھٹکنے کا تذکرہ ہے۔ تو جو لوگ راہ سے بھٹک گئے ہیں ان کے لئے تاکید لاکر کہنا چاہیے کہ توبہ کرو اور جنت میں داخل ہو جاؤ، مگر یہاں تو ایسا کلام لایا جارہا ہے جیسے توبہ کرو یا نہ کرو جنت کے دروازے آپ کے لئے بالآخر کھلے ہے۔

سورة المحبة پر تبصرہ:

مصنف ایک سورۃ ''محبۃ'' کے نام سے موسوم کیا ہے، جس میں انہوں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ محبت سے پیش آؤ اور محبت سے گفتگو کرو۔ مگر جان لینا چاہیے کہ آپ تو فقط انسانوں سے محبت کا درس دیتے ہیں، جبکہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تو جانوروں سے بھی محبت کا درس دیا ہے۔ ہمارا مذہب میں تو انسانوں کے حقوق اپنے جگہ جانوروں کے حقوق بھی ہے، یہاں تک ہمارے ہاں جب کوئی بکری ذبح کرے تو چھری اس کے سامنے تیز نہ کرے، اور دوسرے جانور کے سامنے بھی ذبح نہ کرے۔

سورة النور کا جائزہ:

ساتویں آیت میں کہتا ہے : " انا انزلناه نورا على قلب صفينا فخطه كلما باعيننا والقاه فى اسماعكم وابصاركم وفى قلوبكم وبين ايديكم ليطهركم من الكفر ويخرجكم من الظلمات الى النور لعلكم تهتدون " کہتا ہے کہ ہم نے نازل کیا ایک نور صفین کے دل پر، یہ صفین کون ہے؟ اگر کوئی بندہ ہے یا

مصنف خود ہے تو پھر کیسے ان پر وحی نازل ہوا یا نور۔ کیونکہ عیسائیوں کے ہاں حضرت عیسیٰ کے بعد کسی پر وحی نازل نہیں ہوا، تو یہ بندہ کون ہے نبی ہے یا کوئی اور، اگر نبی ہے تو عیسائی تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد کوئی نبی مانتے نہیں۔

اور یہ سارے الفاظ قرآن سے لیا ہے بس کچھ الفاظ کو آگے پیچھے کر کے ترتیب دیا ہے۔ اور ایک جزء تو مکمل سورۃ ابراہیم آیت ا سے لیا ہے، ملاحظہ فرمائیں "كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ"

سورۃ السلام کا ابطال:

پہلی آیت میں کہتا ہے کہ: " انا انزلناه فرقانا حقا بلسان عربي بين الاعجاز " یعنی ہم نے فرقان کو عربی زبان اور بطور اعجاز نازل کیا۔ مگر یہ سفید جھوٹ ہے کہ اللہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کچھ نازل کیا ہو۔ یہ خود عیسائی مؤقف کے خلاف ہے کیونکہ وہ بھی حضرت عیسیٰ کے بعد یہ سلسلہ کسی کے لئے تسلیم نہیں کرتے۔ اور پھر یہ کتاب اعجاز کیسے ہوگا، کس چیز میں یہ معجز ہے، ساری عبارات قرآن سے سرقہ شدہ ہے، اور کتاب پھر کیسے معجز ہوگا۔ جی ہاں قرآن کے الفاظ معجز ضرور ہوں گے کیونکہ انہوں نے نقل کیا ہے، اس لئے شاید ممکن ہے قرآن کے الفاظ کے بارے میں ہو کہ یہ معجز ہے اس سے ہمیں انکار نہیں۔ مگر اس کتاب سے متعلق کہنا کہ معجز ہے گویا سفید کو سیاہ کہنے کے مترادف ہے۔

تیسری آیت میں کہتا ہے کہ: " والذين اشتروا الضلالة بالهدى واكرهوا عبادنا بالسيف ليكفروا بالحق ويؤمنوا بالباطل اولئك هم اعداء الدين القيم واعداء عبادنا المؤمنين " یعنی کہ جنہوں نے گمراہی کو خریدا حق کے بدلے اور ہمارے بندوں کو مجبور کیا تلوار کے زور پر حق کے انکار کرنے پر اور باطل پر ایمان لانے پر یہی لوگ درست دین کے اور ہمارے مؤمن بندوں کے دشمن ہیں۔

پہلی بات تو اس آیت کا مفہوم قرآن سے سرقہ شدہ ہے، الفاظ کچھ اپنی طرف سے اور کچھ قرآن سے لے کر مضمون گھڑ لیا۔

اور بظاہر اس سے مصنف مسلمانوں کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ مسلمانوں نے تلوار کے زور پر لوگوں کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا۔ اس سے متعلق باب اول میں کلام کیا گیا ہے، اور چیلنج دیا ہے کہ کوئی بھی ایسا ثبوت پیش کرو کہ کسی مسلم نے کافر پر تلوار کھینچ کر اور بندوق کے زور پر مسلمان بنانے پر مجبور کیا ہو۔ ان شاء اللہ کوئی ایسا ثبوت پیش نہیں کر سکتا۔ اور جو بھی ایسا کیا ہے یا آئندہ کرے گا تو وہ اس کی ذاتی عمل ہے جسے اسلام نے ناجائز قرار دیا ہے۔ ایسا کرنے والا اسلام کے رو سے ناجائز عمل کر رہا ہے اسلام نے اس کی مذمت کی ہے۔ اس لئے کوئی بھی مسلم ایسا نہیں کرتا، اور جو کرتا ہے وہ تعلیمات اسلام سے ناواقف ہے۔

اور اس کے بعد چوتھی آیت میں جہاد پر اعتراض کیا ہے، کہ قرآن نے جہاد کا حکم دیا ہے، اور یہ حکم خداوندی ہے اس سے ہرگز یہ لازم نہیں آتا کہ تلوار کے ذریعے اسلام کو پھیلاں اہو، بلکہ جہاد کا مقصد فساد اور فتنہ کو ختم کرنا ہے، جو لوگ زمین پر فتنہ وفساد پھیلاتے ہیں اور مسلمانوں کو تنگ کرتے ہیں ان سے اللہ تعالیٰ نے جہاد کا حکم دیا۔ اس لئے اسے جبرا اسلام قبول کرنے کا عمل بتانا درست نہیں۔

انتہائی پر مزاح آیت:

ساتویں آیت جو بہت دلچسپ اور مزاحیہ ہے، میں پڑھا تو مجھے کافی ہنسی آئی، آپ بھی ملاحظہ فرمائیں :

" واذا قیل للذین کفروا بان یؤمنوا بما انزلنا من الفرقان الحق کما آمن عبادنا الصالحون قالوا أنؤمن کما آمن السفهاء المشرکون ألا انهم هم السفهاء المشرکون ولکن لا یعلمون "

اب ذرا قرآن مجید کی آیت ملاحظہ فرمائیں:

" وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ ؕ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ وَلٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ " (سورۃ البقرہ آیت ۱۳)

پہلے مصنف کے پیش کردہ آیت کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں:

''جب ان لوگوں کو کہا گیا جنہوں نے کفر کیا کہ ایمان لے آؤ جو ہم نے نازل کیا فرقان حق میں سے جیسا کہ ہمارے نیک بندے ایمان لے آئیں انہوں نے کہا کیا ہم ایسے ایمان لے آئے جیسے بیوقوف مشرکین نے ایمان لایا، خبردار بے شک یہی بے وقوف مشرکین ہے لیکن جانتے نہیں ہے۔''

اور قرآن مجید کے پیش کردہ آیت کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں:

''جب ان سے کہا گیا ایمان لے آؤ جیسے کہ لوگوں نے ایمان لایا تو انہوں نے کہا کیا ہم ایسے ایمان کے آئے جیسے بے وقوفوں نے ایمان لایا، خبردار یہی لوگ بے وقوف ہیں اور لیکن جانتے نہیں ہے۔''

قارئین کرام! کبھی کبھار چور چوری کرتے وقت کچھ نشان چھوڑ دیتا ہے، یہی حال ہمارے فاضل مصنف کا ہے، جنہوں نے انتہائی ہوشیاری سے چوری کی کوشش کیا مگر کیا پتہ میری یہ گھڑی ہوئی آیت ایک مذاق بن جائے گا۔

اسی طرح نویں آیت بھی قرآن مجید سے سرقہ کیا ہے، ملاحظہ فرمائیں:

" ومنکم فئة قست قلوبهم من بعد ذلک فهی کالحجارة او اشد قسوة وان من الحجارة لما یتفجر منه الانهار فتوبوا وارحموا انفسکم لعلکم ترحمون وتحشرون مع الصالحین "

یہ آیت قرآن مجید سورۃ البقرہ آیت ۷۴ سے لیا ہے ملاحظہ ہو:

" ثُمَّ قَسَتْ قُلُوبُكُم مِّنۢ بَعْدِ ذَٰلِكَ فَهِيَ كَٱلْحِجَارَةِ أَوْ أَشَدُّ قَسْوَةً ۚ وَإِنَّ

مِنَ ٱلۡحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنۡهُ ٱلۡأَنۡهَٰرُ ۚ وَإِنَّ مِنۡهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخۡرُجُ مِنۡهُ ٱلۡمَآءُ ۚ وَإِنَّ مِنۡهَا لَمَا يَهۡبِطُ مِنۡ خَشۡيَةِ ٱللَّهِ ۗ وَمَا ٱللَّهُ بِغَٰفِلٍ عَمَّا تَعۡمَلُونَ "

اس کے بعد مسلسل پندرہویں آیت تک قرآن کی نقالی کی ہے، جن کو نقل کر کے اس کی نظیر پیش کرنا بجز ضیاعِ صفحات کے اور کچھ نہیں۔

سورۃ الایمان پر ایراد:

پہلی آیت میں کہتا ہے کہ:

" وحرفتم آيات الانجيل الحق و كتمتم كلمتنا واتبعتم صراطا ذا عوج وهمتم اتباعكم بانكم على صراط مستقيم "

یعنی کہ تم نے انجیل کی آیات میں تحریف کی جس کہ حق ہے، اور ہماری آیات کو چھپائے اور کج روی اختیار کرنے والے کی پیروی کی، اور تم نے ارادہ کیا ان کی اتباع کا اس خیال سے کہ وہ سیدھی راہ پر ہے۔

نہ جانے اس سے مراد کون ہے؟ اگر مسلمان ہے تو اس کا مطلب انجیل میں مسلمانوں نے تحریف کی ہیں، حالانکہ یہ حقائق اور تاریخی اعتبار سے بالکل غلط ہے کہ مسلمانوں نے انجیل میں تحریف کی ہو۔ تحریف تو خود عیسائیوں نے کی ہے، جس کا اقرار آج تک عام فہم رکھنے والے عیسائی کرتے ہیں۔ اور مسلمان انجیل میں تحریف کیسے کریں گے جبکہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر آپ کیسے لوگوں کا الزام ہیں کہ انہوں نے قرآن کی کچھ آیات انجیل سے لیا ہے۔ اگر وہ انجیل سے لیا ہے تو پھر تحریف کا سوال کیسے پیدا ہوگا۔ اور پھر یہ ایک نئی بات ہے جو مصنف سے پہلے اب تک کسی نے یہ نہیں کہا ہے کہ مسلمانوں نے انجیل میں تحریف کی ہے۔ اس کا مطلب انجیل کا اصل نسخہ غائب ہے جو مسلمانوں نے تحریف کی اور عیسائیوں نے تسلیم کی۔ ان کو معلوم ہی نہیں ہوا کہ اصل بات انجیل میں کیا ہے۔

اس سورۃ کہ آخری آیت بھی قرآن مجید سے سرقہ شدہ ہے۔

سورۃ الحق کا قلع قمع:

آیت نمبر ۹ میں لکھتے ہیں کہ:

" **يا ايها الناس اذا جاءكم رسول او نبي او ملك من السماء بغير ما جئناكم به في الانجيل الحق والفرقان الحق من بعده فلا تسمعوا اليه ولا تتبعوا سبيله فهو مارق كافر وشيطان اثيم.** "

یعنی کہ اے لوگو! جب تمہارے پاس کوئی رسول یا نبی یا آسمان سے فرشتہ اس (پیغام) کے خلاف لے کر آئے جو ہم تمہارے پاس انجیلِ حق اور اس کے بعد الفرقانِ الحق کے ذریعے لائے ہیں، تو اس کی نہ سنو اور نہ ہی اس کے راستے کی پیروی کرو، کیونکہ وہ ایک باغی، کافر اور گناہگار شیطان ہے۔

اولاً کوئی نبی یا رسول آسمان سے نہیں آتا۔ بلکہ نبی اور رسول بشر ہوتے ہیں اور وہ انسانوں کی طرح بشری لوازمات سے متصف ہوتے ہیں۔ اور زمین پر ان کی پیدائش ہوتی ہے، اس لئے آسمان سے کوئی نبی نازل نہیں ہوتا۔ اور دوسری بات فرشتوں میں بھی نبی نہیں ہوتا۔ نبیوں کا سلسلہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں میں رکھا حضرت آدم علیہ السلام سے یہ سلسلہ شروع ہوا ہمارے پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک۔ اس کے بعد یہ سلسلہ ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا۔

ثانیاً: انجیل کے بعد اگر کوئی رسول یا نبی یا فرشتہ نہیں آیا تو انجیل میں جو پیش گوئیاں ہیں جیسے یوحنا میں ہے کہ:

> ”جب وہ مددگار آئے گا جسے میں باپ کی طرف سے تمہارے پاس بھیجوں گا تو میرے بارے میں گواہی دے گا، وہ سچائی کا روح ہے جو باپ میں سے نکلتا ہے۔ تم کو بھی میرے بارے میں گواہی دینا ہے، کیونکہ تم ابتداء سے میرے ساتھ رہے ہو“

(یوحنا15:26/27)

اس کے علاوہ اور بھی ہیں، تو یہ کس کے بارے میں ہیں؟ اگر کسی اور نبی یا فرشتے کے بارے میں ہیں تو کیا مصنف کے قول سے یہ جھوٹے، مکار ثابت ہوں گے یا نہیں؟ اگر نہیں تو وجہ بیان کرے۔

اس کے بعد اسی سے متصل دسویں آیت میں کہتا ہے کہ " **وحذرناکم في الانجيل الحق من الانبياء الأفاكين** " یعنی ہم نے تمہیں ڈرایا ہے انجیل میں ان جھوٹوں نبیوں کے بارے میں۔ اگر انجیل کے بعد کوئی نبی نہیں آیا تو خود مصنف نے جو کلام پیش کیا ہے وہ کس کی طرف سے ہیں؟ خود اپنی طرف سے بنایا ہے یا ان پر الہام و وحی ہوئی ہے؟ اگر اپنی طرف سے بنایا ہے تو اس کا کذب ہونا آشکارہ ہوگا۔ اور اگر خدا کی طرف سے ہیں تو وحی تو نبیوں پر ہوتا ہے تو کیا تم نبی ہوں گے؟ اگر نبی ہوں گے تو آپ اپنے قول کے مطابق جھوٹا کذاب ثابت ہوں گے۔ کیونکہ انجیل کے بعد آپ ہی نے یہ دعویٰ کیا ہے۔

سورۃ التوحید کا محاسبہ:

یہ سورۃ بھی قرآن مجید سے لیا ہے، جو قرآن میں سورۃ الاخلاص کے نام سے معروف ہے، اس کے کئی اسماء ہیں ان میں سے ایک سورۃ التوحید بھی ہے۔ اور توحید ایک خاص لفظ ہے جس کا خاص معنی ہے کہ خدا کو ایک جاننا اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرانا۔ اس سورۃ کو یہ نام دے کر مصنف عقیدہ تثلیث کو قابل رد ٹھہرایا، جو یقینا قابل رد ہے۔ کیونکہ توحید اور تثلیث الگ الگ معنی رکھتے ہیں تثلیث توحید نہیں ہوسکتا اور توحید تثلیث نہیں ہوسکتا اور ان کا جمع محال ہے۔

تیسری آیت میں کہتا ہے کہ:

" **فطهروا نفوسكم من نجس الشرک فذلكم خير لكم وابقى واتحدوا بكلمتنا ولا تشركوا انفسكم بالشيطان الذميم** "

یعنی اپنے کوشرک کی نجس سے پاک رکھو یہ تمہارے لئے بہتر ہے، اور اسی کو باقی رکھو اور ہمارے کلمہ پر متحدر ہواور شرک مت کرو اپنی ذات سے شیطان مردود کے ساتھ۔

شرک تو خود مصنف کر رہا ہے جو تثلیث کو توحید اور توحید کو تثلیث کہہ رہا ہے، یعنی توحید کو تثلیث سے تبدیل کر رہا ہے۔ یہ شرک نہیں تو اور کیا ہے۔

اس کے بعد چوتھی آیت میں کہتا کہ: " ولاتقربوا الزنی انه کان فاحشة المؤمنین وآفة المتقین " یہ جملہ بھی قرآن مجید سے لیا ہے سورۃ بنی اسرائیل آیت ۳۲ میں مذکور ہے " وَ لَا تَقْرَبُوا الزِّنٰۤی اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ؕ وَ سَآءَ سَبِیْلًا "غور کرے اللہ تعالیٰ نے کیسے انداز میں زنا سے دور فرمایا اور مؤمن کا نام نہیں لیا۔ یعنی کہ زنا کے قریب مت جاؤ وہ برا فعل ہے، اس سے زنا کی برائی بتائی۔ آگے یہ نہیں فرمایا مؤمنین یا متقین۔ تا کہ یہ شبہ نہ ہو جائے کہ زنا محض مؤمنین کرتے ہیں، معاذ اللہ یا اس کا صدور مؤمنین سے ہوتا ہے۔ نہیں بلکہ زنا ایک قبیح فعل ہے جو بھی اس کا مرتکب ہوگا چاہیے مؤمن یا کافر، خواہ کوئی بھی انسان اس عمل کے مرتکب ہوگا وہ برا ہی کہلائے گا۔

مگر اس جاہل اور احمق نے اس فصیح وبلیغ کلام کا حلیہ بگاڑتے ہوئے۔ المؤمنین اور المتقین کا قید بڑھا کر اپنی جہالت اور حماقت کا خوب مظاہرہ کیا ہے۔ گویا زنا محض مؤمنین اور متقین کے لئے قبیح عمل ہے مگر اس کے علاوہ دوسرے لوگوں کے لئے ایسا نہیں۔ لعنۃ اللہ علیہ

تیرہویں آیت میں کہتا ہے کہ:

" فاتبعه الذین فی قلوبهم زیغ واما الراسخون فی العلم من عبادنا الصالحین فیعلمون تاویلها ویعلمون انها لیست من عندنا ولو کانت من عندنا لما وجدوا فیها اختلافا کثیرا ولا نسخا ولا تبدیلا "

یعنی کہ جن کے دلوں میں کجی ہے وہ اس کی پیروی کرتے ہیں۔ اور بہر حال وہ لوگ جو

ہمارے نیک بندوں میں سے علم میں پختہ ہیں، وہ اس کی تعبیر جانتے ہیں اور جانتے ہیں کہ یہ ہم میں سے نہیں ہے۔ اگر یہ ہماری طرف سے ہوتا تو وہ اس میں زیادہ اختلاف، تنسیخ یا ردوبدل نہ پاتے۔

قطع نظر اس بات سے کہ یہ آیت بھی قرآن سے سرقہ شدہ ہے۔ سورۃ آل عمران سے لیا ہے۔ مگر یہاں مصنف کا اصل مدعا نسخ اور متشابہات پر اعتراض ہے، قرآن میں بعض آیات متشابہات موجود ہے جس کا معنی وکیفیت اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اس پر مصنف کہتا ہے کہ یہ کلام اللہ تعالیٰ کا کلام نہیں ورنہ اللہ کا کلام میں ایسا کوئی الفاظ نہیں جس کا معنی ہم نہ سمجھ سکے بلکہ اب جانتے ہیں۔ اسی طرح نسخ بھی غلط ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک بات فرمائیں پھر اس کو منسوخ کر ہے۔ ایسا اللہ تعالیٰ کا شان نہیں۔

ناسخ ومنسوخ پر مقدمہ میں کلام ہو چکا ہے، اس کے علاوہ رہی بات متشابہات کی تو وہ خود تعالیٰ نے ان کے معنی پوشیدہ رکھا ہے، اور اس میں حکمت یہی آزمائش ہیں کہ کون اس پر ایمان لاتا ہے اور کون نہیں۔ علاوہ ازیں اس بات سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ کلام، اللہ کا کلام نہیں۔ کیونکہ مصنفین کبھی ایسی بات کرتے ہیں جس کا مطلب کوئی نہیں سمجھتا ہر کوئی اپنے رائے سے اس کا معنی بتلانے کی کوشش کرتا ہے کہ ممکن ہے مصنف کے کلام کا یہ معنی ہو۔ مگر وہ یقینی نہیں ہوتی۔ اس لئے اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ سرے سے یہ کلام اس مصنف کا کلام ہی نہیں۔ کلام تو مصنف کا ہے مگر اس سے انہوں نے کیا مراد لے کر بیان کیا ہے، یہ لوگوں پر مخفی ہوتی ہے۔

سورۃ المسیح میں لغویات وبکواسات:

اس مکمل سورت کو قرآن مجید کے مختلف جملوں سے لے کر کچھ الفاظ کے زیادتی کے ساتھ پیش کیا ہے، اور ساتھ ساتھ معاذ اللہ ثم معاذ اللہ اس سورۃ میں کئی جگہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو منافق اور ضال ومضل کہا ہے۔ قرآن میں جو آیات منافقین وکفار کے بارے میں نازل ہوئے

ہیں یہ جاہل اور احمق انہیں آیات کو اٹھا کر ایک دو لفظ بڑا کر رسول اللہ پر محمول کرتا ہے۔ **نعوذُ باللہ من مثل ھذہ الأباطیل، ولعنۃ اللہ علی ھذا الدجّال۔**

قارئین کرام! اگر آپ کو دلچسپی ہو تو آپ خود اس باطل اور لغو کتاب کو تفصیلا پڑھے۔ خوف طوالت اتنی تفصیلات ذکر کرنے سے قاصر ہے۔

اس کے بعد سورۃ الصلب، الروح، الفرقان ہے، ان تینوں میں سورتوں میں قرآن کی آیات کو کانٹ چھانٹ کر اپنی طرف سے عبارت بنائی ہے۔ اور قرآن میں جو آیات کفار اور منافقین کے بارے میں نازل ہوا ہیں ان کو معاذ اللہ مسلمانوں اور رسول اللہ پر فٹ کرتا ہے۔ اس لئے سرے سے ان کا جواب ہی نہیں بنتا وہ خود قرآن کی آیات ہیں جو کفار اور مشرکین کے بارے میں نازل ہوا ہے، فقط کچھ الفاظ بڑھانے سے ان کو کسی اور پر محمول کرنا، اس کو جہالت کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے۔

سورۃ الثالوث کا تعاقب:

دوسری آیت میں کہتا ہے کہ:

" فما اتخذنا ولدا وما كانت لنا صاحبة وما لنا شريک كما افتر المفترون على عبادنا المؤمنين "

یعنی ہمارا بیٹا نہیں ہے، اور نہ ہمارے لئے زوجہ ہے اور ہمارے لئے کوئی شریک ہے جیسا کہ گھڑنے والوں نے جھوٹ بولا ہمارے مؤمن بندوں پر۔

حالانکہ خدا کے لئے بیٹا خود عیسائی مانتے ہیں، حضرت مسیح علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا قرار دیتے ہیں، کبھی اللہ کا کلمہ قرار دیتے ہیں، غرض یہ شرک عیسائی خود کرتے ہیں، اور یہاں اپنے اس شرکیہ عقیدہ کا رد بھی خود کر دیا۔ مسلمان تو اللہ کو واحد لاشریک لک تسلیم کرتے ہیں، نہ ان کے لئے بیٹا ثابت کرتے ہیں اور نہ روح نہ کلمہ بلکہ انہیں ایک ہی ذات مانتے ہیں۔

پرلے درجے کا جاہل مرکب:

مصنف کی حماقت و جہالت دیکھئے، پانچویں اور چھٹی آیت میں کہتا ہے:

" فنحن الآب الکلمة الروح ثالوث فرد اله واحد لا شریک لنا فی السماوات والارض (۵) ونحن الله الرحمان الرحیم ثالوث فرد اله واحد لا شریک لنا فی العالمین (٦) "

یعنی ہم باپ کلمہ روح تین ایک خدا ہے ہمارا کوئی شریک نہیں آسمانوں اور زمینوں میں (۵) اور ہم اللہ جو مہربان اور رحم کرنے والا ہے تین ایک خدا ہے ہمارا کوئی شریک نہیں دنیا میں۔

یا خدا! یہ کیسے جہال سے واسطہ پڑا ہے۔ جو کہتے ہیں دن رات ہیں اور رات دن ہے اور دونوں دن ہے یا دونوں رات ہیں، بالفاظ دیگر دو تین ہے اور تین دو ہے اور دونوں دو ہے یا دونوں تین ہے۔ کیا ایسا ممکن ہے ممکن تو دور کی بات بلکہ ممتنع ہے۔

یہاں بھی مصنف اسی محال کو ممکن بنا رہا ہے، یعنی جب باپ، کلمہ اور روح تین ہوئے تو پھر ان کو مفرد واحد کہنے کی کیا ضرورت؟ اگر یہ تین نہیں تو تین کہنے کی کیا ضرورت؟ بلکہ فوراً اکیلا باپ یا خدا کا ذکر کرے۔ تین کو الگ الگ ذکر کرنے کا کیا مقصد۔

اور پھر کہتا ہے ہم اللہ جو رحمان و رحیم ہے تین ایک خدا ہے، اس جاہل کو یہ نہیں پتہ اللہ ایک ہی ہے رحمن اور رحیم ان کی صفات ہیں، صفت کو ذات بنا کر اس کو تقسیم کر رہا ہے، اگر ایسا اللہ کو تین واحد بنانا ہے تو پھر اللہ کی اور بھی صفات ہیں، سمیع، بصیر، علیم، خبیر، حی، وغیرہ پھر اس کا مطلب یوں کہا جائے " نحن الله الرحمن الرحیم السمیع البصیر الخبیر الجبار المتکبر الخالق القدیر عاشر فرد اله واحد لا شریک لنا " کیا یہ بات درست ہوگی، مسلمان تو کجا خود عیسائی بھی اسے درست نہیں سمجھتے۔ اس لئے یہ قضیہ بات سرے سے باطل ہے۔

پھر کہتا ہے کہ" لاشریک لنا فی العالمین" یعنی خدا کہہ رہا ہے کہ ہمارے لئے دنیا میں کوئی شریک نہیں ہے۔ شرکت کو دنیا کے ساتھ خاص کیا، گویا دنیا میں شریک نہیں ہے لیکن اس کے علاوہ کہی اور شریک ہوسکتا ہے۔ یہ ہے مصنف کی جہالت۔

سورۃ الحواریین پر ایک نظر:

دوسری آیت میں کہتا ہے کہ:

" وحفظوا الانجیل الحق فی الصدور سنین عددا ثم دوّنه نفرا منهم باعیننا وانا له لحافظون "

انہوں نے کئی سالوں تک سچی انجیل کو اپنے دلوں میں محفوظ رکھا، پھر ان میں سے ایک گروہ نے اسے ہماری آنکھوں کے سامنے لکھا، اور ہم اس کی حفاظت کرنے والے ہے۔

اگر وہ انجیل کو سینہ در سینہ محفوظ رکھتے تو آج محرف انجیل ہمارے سامنے نہ ہوتا، اور آج انجیل کی یہ حالت نہ ہوتی۔ جس میں تضادات، گستاخیاں، غلط باتیں، نہ ہوتی، مگر آج انجیل وہ انجیل ہی نہیں۔ خود کئی عیسائی اس بارے میں حیران ہے کہ اصل انجیل کونسا ہے، کیونکہ انجیل میں بہت تبدیلی ہوئی ہے۔ چونکہ یہ موقع نہیں۔ اس لئے موقع ملا تو ان شاء اللہ اس موضوع پر لکھیں گے۔

سورۃ الطھر کی مدافعت:

گیارہویں آیت میں کہتا ہے کہ:

" وقلتم افکا لاتقربوا الزنی انه کان فاحشة وساء سبیلا "

یعنی تم نے بھتان باندھتے ہوئے یہ کہا کہ زنا کے قریب مت جاؤ بے شک وہ فحش کام ہے اور برا راستہ ہے۔

یعنی کہ معاذ اللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کہتا ہے کہ تم نے یہ جھوٹ بولا نعوذ

باللہ کہ زنا کے قریب مت جاؤ وہ فحش عمل ہے۔ اگر یہ جھوٹ اور بھتان ہے تو سب سے بڑا جھوٹا اور کذاب مصنف خود ہے جو سورۃ التوحید میں کہتا ہے " ولاتقربوا الزنی انه کان فاحشة المؤمنین وآفة المتقین " خود بھی تو کہتے ہو زنا کے قریب مت جاؤ، نہ صرف قربت زنا سے منع کیا بلکہ زنا کو اپنے مؤمنین یعنی عیسائیوں کو اس میں خاص کیا کہ گویا زنا صرف عیسائی ہی کرتے ہیں، اس کے علاوہ دوسرے لوگ نہیں کرتے۔

آگے سورۃ الغرانیق کے نام سے ایک سورۃ ہے، یہ قصہ غرانیق کی طرف اشارہ ہے اور اس میں آیت غرانیق کا بھی تذکرہ کیا ہے، جس کا تفصیلی جواب باب اول میں گزر چکا ہے۔

سورۃ القتل میں مغالطہ:

آٹھویں آیت میں لکھتا ہے کہ:

" ولو اقمتم الانجیل الحق وما انزلنا من الفرقان الحق مصدقا لما بین یدیه لامطرنکم السماء بالرحمة و لفاضت بکم الارض خیرا عمیما "

''اور اگر تم انجیلِ حق اور وہ فرقانِ حق جو ہم نے نازل کیا ہے، جو تصدیق کرتا ہے اس کی جو تمہارے ہاتھ میں ہے، کو قائم رکھتے، تو ہم تم پر آسمان سے رحمت کی بارش برساتے، اور زمین تم پر خیر و برکت سے بھر جاتی۔''

اس جاہل اور لکیر کے فقیر سے پوچھا جائے کہ قرآن نے تو یہ بات کہی " ومصدقا لما بین یدیہ " کیونکہ اس دور میں تورات وانجیل موجود تھے، اور حقیقتاً بھی ان کتابوں کی تصدیق کی۔ تم جو کہہ رہے ہو فرقان حق نے ماقبل کتابوں کی یا پھر جو تمہارے ہاتھوں میں ہیں اس کی تصدیق کی۔ تو کس کتاب کی تصدیق کی؟ قرآن کی یا انجیل یا تورات کی؟ اگر انجیل وتورات کی تصویق کی تو اس کا مطلب وہ پہلے سے تصدیق شدہ نہیں تھے جو آپ فرقان حق ان کی تصدیق کر رہا ہے؟ اور

اگر قرآن مجید کی تصدیق کر رہا ہے تو یہ ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ قرآن کو یہ لوگ اللہ کا کلام مانتے ہی نہیں۔

سورۃ المفترین میں تلبیسات:

سورۃ المفترین میں دجل کے تمام حدیں عبور کی ہے، پہلی آیت میں کہتا ہے:

" یاایھا المفترون من عبادنا الضالین لقد قلتم: لاتشرکوا باللہ احدا ، واشرکتم بنا من شارکنا الحول والقوۃ فکنتم شر المشرکین "

معاذ اللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ کہہ رہا کہ آپ کے کہا کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ، حالانکہ تم نے ہمارے ساتھ ایسے شریک بنائے جو ہمارے ساتھ شریک ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، پس تم سب سے بڑے مشرکین میں سے ہوئے۔

حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کا ایک مقاصد میں ایک مقصد توحید خداوند کو بیان کرنا تھا، یہ انہوں نے ایک خدا کی پرستش کا دعویٰ کیا۔ پھر کیونکر ممکن ہوسکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذ اللہ ثم معاذ اللہ کسی طاقت و رقوت کو اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرائے۔ جھوٹ اور دجل کا بھی کوئی حد ہوتی ہے۔

اور اس آیت میں منسوخ آیتوں پر بھی کلام کیا ہے، کہ معاذ اللہ رسول اللہ اپنی طرف سے یہ کلام کرتا ہے پھر کہتا ہے یہ منسوخ ہوا دوسرا حکم بتلاتا ہے۔ حالانکہ یہ سب جھوٹ ہے۔ ناسخ و منسوخ پر مقدمہ میں مختصر کلام ہو جا چکا ہے، وہاں ملاحظہ فرمائے۔

الحمد للہ و بفضلہ آج بروز اتوار 19 اکتوبر 2025ء بمطابق 25 ربیع الثانی 1447ھ

باب دوم " الفرقان الحق " کے جواب کے ساتھ پایہ تکمیل تک پہنچا۔